اردو زبان کے غیر معمولی اور غیر فانی افسانوں کی خوش رنگ کہکشاں

منتخب مشہور افسانے

حصہ اول

مرتبہ ضیاء ساجد

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

فہرست مضامین

پلنگ	04
ٹیلی گرام	18
ایک انار	29
تعویذ	53
اکیلا	71
حرام جادی	96
شادی کی ضرورت	117
عذرا آپا	140
سب سے بڑا دکھ	157
غنڈا	184
نامرد	210
سب سے بڑی کمزوری	228
ڈاکٹر صاحب	244

انتساب

اسلوب گر اور عہد ساز عظیم شاعر

محسن نقوی کے نام

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

پلنگ

افسانہ نگار : اپندر ناتھ اشک

دلہن کی آنکھوں پر جھکی ہوئی کیشی کی نگاہیں اچانک پلنگ کے سرہانے گول شیشے میں لگی اپنی ماں کی چھوٹی سی تصویر پر چلی گئیں۔ حسین کتابی چہرہ بڑی بڑی آنکھیں، غلافی پلکیں، نازک نازک ترشے ہوئے، ہنستے ہونٹوں میں موتیوں کی قطار

.....اور اچانک دلہن کے چہرے پر کیشی کو اپنی ماں کے خطوط ابھر آئے،،،، دونوں کے قد و قامت ناک نقشے میں کتنی مشابہت تھی،،،، کیشی کا ذہن دھندلا گیا۔ ایک کپکپی اس کی رگوں میں دوڑتی چلی گئی، سر کو ذرا سا جھٹکا دے کر اس نے اس تصویر کو نگاہوں سے ہٹانے کی ناکام کوشش کی، لیکن بچپن سے لے کر ابھی چھ ہی سال پہلے تک وہ نہ جانے کتنی بار ماں کے سینے پر لیٹا تھا، اور وہ یاد اس لمحے اسکے ذہن کے پردوں سے ہو کر نکل گئی۔ اور اپنی دلہن کی پھیلی پھیلی مخمور آنکھیں اور گیلے رسیلے ہونٹ چومنے کے بدلے وہ اچانک بائیں جانب پھسل پڑا، چت لیٹ گیا۔ پل بھر کو اسکی نگاہیں مسہری کے خالی فریم پر چھائے موتیے کے لمبے لمبے ہاروں پر چلی گئیں۔ اس کا ہاتھ سیج پر بچھے بیلے کی کلیوں پر جا پڑا، اور اس کے جی میں آئی کہ وہ اچھل کر اٹھے اور اس معطر اور معنبر حجلہ عروسی سے باہر نکل جائے۔

لیکن وہ نہ اچھلا، نہ اٹھا، چپ چاپ لیٹا رہا۔ دلہن نہ جانے کیا سمجھے، یہی خیال لاشعور میں اسے پلنگ سے باندھے رہا۔ سر کو جھٹکا دے کر اس نے لمحہ بھر پہلے کی تصویر کو نظروں سے ہٹانے کی ناکام کوشش کی، لیکن ایک کے بدلے کتنی ہی تصویریں ایک دوسری کے اوپر برساتی بادلوں کی سی امڈ پڑیں۔

اسی کمرے میں، اسی پلنگ پر اس کے ممی اور پاپا ساتھ ساتھ لیٹے ہیں۔ برآمدے میں پلنگوری پر وہ پڑا ہے۔اور ابھی تک انہیں تک رہا ہے۔ پاپا کے ساتھ لیٹی ماں کتنی چھوٹی کتنی حسین لگ رہی ہے۔

ماں آئینہ کے سامنے بیٹھی سنگھار کر رہی ہے۔اور وہ دروازے کے پیچھے کھڑا چپ چاپ اسے دیکھ رہا ہے

آیا جس پری کی کہانی سنایا کرتی تھی، ویسی ہی حسین تو اس کی ماں ہے۔وہ اسے دیکھ لیتی ہے اور پیار سے بلاتی ہے، زمین پر گھٹنے ٹیک کر وہ اس کی گود میں خوشی سے سر چھپالیتا ہے۔ ماں ایک ہاتھ سے اس کے بال سہلاتی ہے۔ دوسرے سے اپنے بالوں میں کنگھی کیے جاتی ہے۔

..... جانے پاپا کو کیا ہو گیا ہے؟۔ایک روز آتا ہے، اس کے گلے میں دو سانپ سے لٹک رہے ہوتے ہیں۔ان کا ایک ایک سر دونوں کانوں میں لگا کر ان کا منہ وہ جہاں تہاں پاپا کی چھاتی پر رکھتا ہے۔پھر ان کے بازوؤں میں سوئیں چبھوتا ہے۔ پاپا نہیں روتے لیکن وہ رونے لگتا ہے۔ممی اسے چھاتی سے لگا لیتی ہے۔اور دوسرے کمرے میں لے جاتی ہے۔

..... پاپا زمین پر لیٹے ہیں ہلتے ڈولتے نہیں، گھر میں سب رو رہے ہیں۔وہ بھی روتا ہے۔ ماں اسے چومے جاتی ہے۔روئے جاتی ہے۔عورتیں اسکی چوڑیاں توڑ دیتی ہیں۔عورتیں اس کے ماتھے کا سیندور پونچھ دیتی ہیں۔کیشی کو اس کی گود سے چھین لیتی ہیں۔وہ روتا ہے۔روئے جاتا ہے۔پر اسے کوئی چپ نہیں کراتا ہے۔

.....وہی پلنگ ہے۔وہ اپنے پاپا کی جگہ لیٹا ہے۔ماں اس کے ساتھ لیٹی ہے۔ ایک سادہ سی سفید دھوتی پہنے ہے۔صبح کا اجالا کمرے میں جھانک رہا ہے۔لیکن ماں بے سدھ سوئی ہوئی ہے۔وہ ایک ٹک اسے دیکھتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ پتلا نازک

پریوں کا سا چہرہ، بند آنکھیں کھلے بکھرے بال، وہ اسے اس شہزادی سی لگتی ہے۔ جو سحر زدہ سوئی تھی۔ اور جسے شہزادے نے کر جگایا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے بڑھتا ہے۔ اور اسے کسی (KISSY) کر لیتا ہے۔ اس کی ماں جاگ جاتی ہے۔ باہیں پھیلا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیتی ہے۔ اور اس کی پیشانی، آنکھیں اور ہونٹ چومتی ہے۔

.....وہ اپنی ماں کے سینے پر لیٹا ہے۔ وہ اسے شہزادے کی کہانی سناتی ہے، جو سات سمندر پار سے شہزادی بیاہ لایا تھا۔ کہانی سنا کر وہ اس سے پوچھتی ہے۔ کیا تو بھی ایسی شہزادی سے شادی کرے گا؟

میں تم سے بیاہ کروں گا

''دھت پگلے کبھی بیٹے بھی ماؤں سے بیاہ کرتے ہیں؟''

اور وہ اسے یقین دلاتی ہے کہ وہ اس کے لئے اپنے ہی جیسی دلہن بیاہ کر لائے گی۔

میں پھر یہی پلنگ لوں گا۔ وہ پلنگ کے سرہانے لگی اپنی ماں کی حسین تصویر کو دیکھ کر ٹھنکتا ہے۔

ہاں ہاں یہ پلنگ میں تمہیں اور تمہاری دلہن کو دوں گی۔ اور وہ اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیتی ہے۔

کیا بات ہے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں'' اچانک دلہن کہنی کے بل ہو کر اس کی پیشانی اور بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتی ہے۔

نہیں کچھ نہیں۔ سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے وہ یادوں کو پرے ہٹاتا ہوا ہنس دیتا ہے۔ ایک ایسی ہنسی جو لمبی سانس جیسی محسوس ہوتی ہے۔

اس کی ماں نے تو سچ ہی کہا تھا ویسا ہی بوٹا سا قد، حسین چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں تیکھے نقش، نازک ہونٹ موتیوں جیسے دانت،..... ماں واقعی اس کی دلہن اپنے جیسی

لائی تھی، اور حالانکہ جہیز میں بڑا خوبصورت پلنگ آیا تھا۔ مگر ماں نے برسوں پہلے کے اپنے وعدے کے مطابق وہی اپنا والا بڑا سا قیمتی پلنگ حجلہ عروسی میں بچھوا دیا تھا۔ پلنگ کیا اپنا کمرہ ہی دلہن کو دے دیا تھا۔

دلہن اس پر جھکی، اس کی آنکھوں میں کہیں دور جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی، جاننا چاہتی تھی کہ کچھ لمحہ قبل اس کا جوش خروش یک دم سرد کیوں پڑ گیا تھا۔ لیکن یہ جاننے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور نہایت حجاب آمیز پیار سے وہ اس پر تھوڑا جھکی، اس کے بال سہلائے جا رہی تھی۔

کیشی چند لمحے چپ چاپ لیٹا رہا، پھر اچانک اس نے دلہن کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ کتنی ہی دیر تک وہ اس کے سر کو سینے پر رکھے اس کے بالوں، گالوں اور ہونٹوں کو سہلاتا رہا

یہاں تک کہ اس کے دماغ سے تمام جالے دور ہو گئے۔

اور سینے پر لیٹی دلہن، اور اس کے گورے گداز جسم کی گرمی اسکے رگ و ریشے میں سما گئی۔ اس نے آہستہ سے اسے چوم کر اپنے پہلو میں لٹا لیا۔ اور اس کے گرم گداز سینے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ بار بار اس کا جی چاہتا کہ وہ سر اٹھائے، اپنی بیوی کو پیار کرے۔ لیکن جیسے اس تصویر کا سامنا کرنے کی اس میں تاب نہ تھی۔ وہیں لیٹے لیٹے بائیں ہاتھ سے تکیہ اٹھا کر اندازے سے تصویر کے آگے رکھ دیا۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ لیکن وہ تسوی رگویا چھپ کر اور بھی نمایاں ہو گئی تھی۔ اور دلہن کے چہرے پر کسی اور کے خطوط بننے لگے تھے۔۔۔ نہیں،، نہیں،، وہ گھبرا کر دل میں چلایا۔ اور پھر پھسل کر ویسے ہی چت لیٹ گیا۔ پھر نہ جانے کیسا بگولا سا اس کے دل میں اٹھا اور وہ اچھل کر حجلہ عروسی سے باہر نکل گیا۔

برآمدے کی جھلملی سی چیت کی چاندنی بڑی شرمائی نگاہوں سے اندر جھانک رہی تھی، لمحہ بھر کو وہ برآمدے کی محراب میں رکا، چپ چاپ باہر پھیلی چاندنی میں تکتا

رہا۔ٹھنڈی ہوا کے لمس سے اس کے تنے ہوئے اعصاب کو عجیب سی راحت ملی،
لیکن وہ پلٹا نہیں بلکہ باہر نکل آیا، دائیں طرف پھولوں کی روشن میں فلاگز اور بینیا کھلے تھے، سامنے ڈیلٹا کے پودے، پھولوں کے بار سے جھکے، ہلکی ہوا کے جھونکوں سے جھول رہے تھے۔

گھاس کے لان کے ساتھ کٹی، چھٹی، مہندی کے پیچھے کیاری میں سوسن کھلا تھا۔ اور گلاب کی بیل کے گرد گول تھالے میں نیریشم کے ڈھیروں پھول گویا اس چاندنی میں نہار رہے تھے،،، کیشی ان رنگوں میں اٹکتا، بھٹکتا، پھولوں کے رنگوں کو جھک کر دیکھتا بے خیالی میں انہیں چھوتا بڑھتا چلا گیا۔سورج کی تیز روشنی میں جو پھول اپنی رنگینی سے آنکھوں کو چندھیا دیتے تھے۔وہ اس خنک چاندنی میں بہت ہی دل کش، پرسکون اور فرحت بخش معلوم ہوتے تھے۔ پیلا اور گلابی رنگ، السفید، سفید نظر آتا تھا۔اور گہرا سرخ، نیلا یا جامنی سیاہ دکھائی دیتا تھا۔وہ کاٹج کی چار دیواری کے پاس پہنچ کر وہاں رکا۔ جہاں دیوار کے ساتھ ساتھ آغاز بہار کا بیلا کھلا تھا۔ چار دیواری کے نیم تاریک سائے میں بیلے کے پھول موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔پہلے کبھی چاندنی راتوں میں وہ بیلا کھلا دیکھتا تھا،تو ہمیشہ کہیں پڑھے یا سنے گی تکی ایک لائین اس کے ہونٹوں پر مچل جاتی،اور وہ بے اختیار ہو کر گنگنا اٹھتا۔

بہت دنوں کے بعد بیلا
میرا آنگن مہکا، آنگن مہکا

لیکن آج جب سچ مچ اسکا آنگن مہکا تھا تو گیت نہ جانے ذہن کے کس تاریک گوشے میں کھو گیا تھا۔

اپنے تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ وہ کاٹج سے گیٹ تک اور گیٹ سے کاٹج تک چپ چاپ گھومتا رہا۔اور پھر جب وہ دوسری بار گیٹ سے واپس آ رہا تھا،تو اس کی نظر کاٹج کے دوسرے کنارے والے کمرے کے شیشے پر گئی۔اندر روشنی تھی،

اس کی ماں یقیناً جاگ رہی تھی۔ اس کی آنٹی اور دوسری عورتیں بھی جاگ رہی تھیں اور..... شاید انہیں کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ اس کی ماں نے کتنی محنت اور شوق سے اس کا حجلہ عروسی سجایا تھا۔ سارا دن کنارے والے کھانے کے کمرے میں (جس کی میز کرسیاں باہر برآمدے میں رکھ دی گئی تھیں) اور جس میں بہو کو اتارا گیا تھا۔ ماں، آنٹی، اور دوسری عورتیں، کنگنا، گٹھلی، مانگ بھرائی اور منھ دکھائی کی رسمیں پوری کرتی رہی تھیں۔ کہ اس کی پلکیں بھاری ہو جاتی تھیں۔ اور وہ گہری نیند سو جاتا تھا۔ کیشی نے خود بھی یہ فن اس سے سیکھ لیا تھا۔ کبھی جب تکان یا فکر سے ماں کو نیند نہ آتی تھی، تو وہ خود اس کے سرہانے بیٹھ کر اسکی کن پٹیاں سہلا کے اسے سلا دیتا تھا۔ جب وہ چھوٹا تھا..... تیرہ۔ چودہ برس کا..... تو ایسے میں ماں اسکا سر جھکا کر چوم لیتی تھی۔ جب وہ بڑا ہو گیا۔ بی، اے، ایم، اے کر لیا۔ اور یونیورسٹی میں نفسیات کا پروفیسر ہو گیا۔ تو ماں ایسے موقعوں پر صرف اس کی پیشانی چومتی تھی۔ اور کیشی بڑے پیار سے اسے تھپتھپا کر سلا دیتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شادی میں آئی عورتوں میں سے اپنی ماں کو اٹھائے۔ اور اسے اس کے کمرے میں لے جا کر گہری نیند سلا دے۔ لیکن وہ تو وہاں سہاگ سیج سجانے میں لگی تھی۔ پھولوں کی کمی کی وجہ سے اس نے نہ جانے کتنے آدمیوں کو کہاں کہاں بھیجا تھا۔ اور کتنا پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا۔ ماں تم کیوں جان ہلکان کر رہی ہو۔ تمہارا پیار ان سب رسموں، خوشیوں، آرائش و زیبائش سے بڑا ہے۔ میرے لئے ان کا مول ان سب سے کہیں زیادہ ہے۔

تم بیمار پڑ جاؤ گی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس کی ایک نہ سنے گی۔ میری شادی تو بیٹے کچھ یونہی ہوئی تھی۔ اس نے کیشی سے ایک بار کہا تھا، تمہارے پاپ معمولی کلرک تھے، اور کمپیٹیشن میں ابھی بیٹھے نہ تھے۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری دلہن کے دل میں کوئی تمنا رہ جائے۔ پھولوں کا ایک گجرا تک نہ آیا تھا میرے لئے۔ تم ذرا

دیکھنا! تمہاری دلہن کی سیج میں کیسے سجاتی ہوں۔

اور جب حجلہ عروسی کا پردہ اٹھا کر اسے اندر دھکیلتی۔ اور دیکھو فلاسفی ہی نہ بگھارتے رہنا'' کہتی اور ہنستی ہوئی اس کی جوان خالہ چلی گئی تھی، تو کیشی لمحہ بھر کو حیران سا رہ گیا۔

کمرہ اس کا جانا پہچانا تھا۔ پلنگ اور ساز و سامان بھی اس کا جانا پہچانا تھا۔ ماں نے اپنا ڈریسنگ ٹیبل، سنگھار دان، سپر میشی کا چوڑی بکس۔ بمبئی سے منگایا ہوا اپنا قیمتی ٹیبل لیمپ۔ سب کمرہ میں کچھ اس ڈھنگ سے سجا رکھا تھا کہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ نمایاں نظر آ رہی تھی۔ لیکن جس چیز نے کمرے کو سب سے زیادہ حسین بنا دیا تھا وہ تھے آغاز بہار کے موتی کے لمبے ہار، دونوں جانب نیچے تک یوں لٹک رہے تھے، کہ پھولوں کی مسہری سی بن گئی تھی۔ پلنگ پر بیلے کے پھولوں کی بھاری چادر بچھی تھی۔ جس پر دلہن پھولوں کی دیوی بنی ہلکا سا گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔

پل بھی کے لئے کیشی کی نگاہوں میں اس کی ماں کی شادی کا منظر گھوم گیا۔ محکمہ انہار کے ایک معمولی کلرک کی دلہن، چھوٹی سی کوٹھری، معمولی چارپائی، لالٹین کی مدہم روشنی اور آسمانوں کو چھوتی ہوئی آرزوئیں..... اس کے پاپا بعد میں ایگزیکٹیو انجنیر ہو گئے تھے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ رہتی تھی۔ لیکن ماں اس یاس اور محرومی کو کبھی نہ بھول سکی۔ اپنے بیٹے کے حجلہ عروسی کو اپنی مرضی کے مطابق سجا کر اس نے اپنی تشنہ خواہشوں کی تکمیل کر لی تھی۔ لیکن وہی سجاوٹ کیشی کے لئے وبال جان ہو گئی تھی۔

جدھر بھی اس کی نگاہ جاتی۔ وہی مناظر اس کی آنکھوں میں ابھر آتے۔

دیکھنا فلاسفی ہی نہ بگھارتے رہنا۔ اچانک کیشی کے ذہن مین خالہ کا جملہ اور ہنسی گونج اٹھی۔ تو کیا وہ اپنے ہی جال میں پھنسا ہے؟،،، اس کی دلہن نہ جانے کیا سوچتی ہو گی؟ اس کے سامنے کئی واقعات گھوم گئے۔ جن میں پہلی رات مرد کی

کمزوری دولھا دلہن کی ازدواجی زندگی کو لے ڈوبی۔لیکن پہلی ہی رات مرد کے لئے اپنے کو مرد ثابت کرنا کیا ضروری ہے۔ یہ عورتیں اس کے لئے کیوں اتنا تردد کرتی ہیں۔کیا یہ سب کی سب دوسروں کے حجلہ عروسی کو سجانے میں اپنی اپنی سہاگ رات کا لطف پھر حاصل نہیں کرتیں۔تو کیا اس کی ماں بھی.....اس کے حجلہ عروسی کو سجانے میں اتنی محنت کرنا، اپنا پلنگ وہاں رکھ دینا۔اسے پھولوں سے ایسا سجا دینا، جیسا کہ اس کی دل میں اپنا حجلہ عروسی کو دیکھنے کی تمنا تھی۔اور اس کے پاپا کی غربت اور بے دلی کی وجہ سے پوری نہ ہوئی تھی۔کیشی نے سر جھکا دیا،،،،اسے کیا ہو گیا ہے،،،اس نے کیوں کہا تھا میں یہی پلنگ لوں گا۔

لیکن وہ تو بچہ تھا۔کیا اس کی ماں بھی بچہ تھی؟

وہ واپس برآمدے میں آ گیا۔اچانک اس نے دیکھا، دلہن محراب کے نیچے کھڑی ہے۔

''طبیعت کچھ خراب ہے جی؟

نہیں

''کیا مجھ سے کچھ قصور ہو گیا؟

کیشی کا جی چاہا زور سے قہقہہ لگائے۔ایک ہی بات اس کی دلہن کے دماغ میں بھی چکر لگا رہی ہے۔اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے وہ اسے اندر لے گیا۔اس نے طے کر لیا کہ وہ اپنے ذہنی انتشار کو جھٹک کر وہی سب کچھ کرے گا۔جس کی سب توقع رکھتے ہیں

اس نے دلہن کو تھوڑی سختی سے چارپائی پر لٹا دیا۔

جھٹکے سے اس کے بلاؤز کے بٹن کھول دیئے۔۔لیکن دلہن نے تکیہ کو پھر اس کی جگہ رکھ دیا۔کیشی کی نظریں پھر اپنی ماں کی تصویر پر گئیں۔اس کا دماغ پھر دھندلا گیا۔وہ اٹھا،،،باہر جانے لگا،،کہ دلہن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

کیابات ہے جی؟

کیشی کی نظریں درمیانی دروازے کی طرف گئیں۔ کیاہی اچھاہوتا اگر ماں نے اپنے اس کمرے میں سہاگ رات کا اہتمام کرنے کی بجائے اس کے اپنے کمرے میں وہ سب انتظام کیاہوتا۔لیکن اب تو اس کا کمرہ جہیز میں آئے ہوئے سامان،فرنیچراور دوسری چیزوں کا گودام بناہواتھا۔اور چابی بھی اس کے پاس نہ تھی، نہایت مجبوری سے اس نے باہر برآمدے کی طرف دیکھا، چاندنی اب بھی بدستور جھل مل سے چھن چھن کر آرہی تھی۔اچانک اسنے کہا۔

دیکھونا،کیسی چاندنی کھلی ہے۔آؤذرا باہر گھومیں۔

دلہن اٹھی،اس نے اپنے بےترتیب لباس کو درست کیا،بالوں کی دوایک لٹوں کوٹھیک کیا۔اور دراز سا گھونگھٹ کاڑھ کر کیشی کے پیچھے ہولی۔

دوبار برآمدے سے گیٹ تک اور گیٹ سے برآمدے تک کیشی آیا۔دلہن نے چاندنی کی تعریف میں ایک آدھ جملہ کہا۔لیکن کیشی کو کاموش دیکھ کر وہ بھی خاموش ہوگئی۔اپریل کی چاندنی غیر مرئی شراب کی طرح ان کے رگ رگ میں سمارہی تھی۔ لیکن وہ دونوں اس سے بےنیاز چلے جارہے تھے۔اپنی سہیلیوں سے (جن میں سے کچھ دوبچوں کی مائیں تھیں) سہاگ رات کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔وہ جیسے اسکی گرفت میں آکر دور چلا جاتا تھا۔اپنے شوہر کی خوبصورتی،فرض شناسی،کی اس نے بہت تعریفیں سن رکھی تھیں۔اور ڈیڈی نے بھی پوری طرح چھان بین کر کے اور مکمل مطمئن ہوکر رشتہ طے کیا تھا۔اس کا ہونے والا مینگیتر سنکی ہے یا اس کے دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہے۔یہ تو کسی نے بھی نہ کہا تھا۔اپنے شوہر کی اس بےرخی اور اپنے مستقبل کے قدرے مبالغہ آمیز اندیشوں میں گرفتار دلہن کبھی کبھی اپنے شوہر کو دیکھ لیتی۔اور چپ چاپ ٹہلے جاتی، چاندنی کی طرف تو اس کا ذرا بھی دھیان نہ تھا۔

اور کیشی کا دماغ ایک دلدل بنا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے وہ چلتا جا رہا تھا۔ اچانک کیشی نے کہا آؤ ذرا باہر چلیں۔ رات کافی ہوگئی ہے دلہن نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

کیشی بنگلے کا پھاٹک کھول کر باہر نکلا۔ اور کہنے لگا محبت کرنے والوں کے لئے اس سے بہتر کوئی سڑک نہیں۔ اور اپنے وہاں کا حدود اربعہ بتانے لگا، کہ کس طرف کون سی عمارت ہے۔ آٹا مل کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے بتایا کہ کیسے وہاں آٹا تیار کیا جاتا ہے۔ کیسے وہاں مالکوں نے کوڈ سٹوریج بنا رکھا ہے۔ جہاں وہ لاکھوں من آلو ہر سال ستور کر کے بیچتے ہیں۔ پریس کے پاس پہنچ کر اسے روٹری مشین کا کام سمجھانے لگا۔ کہ کس طرح پورا اخبار چھپ کر اور مڑ کر نکلتا جاتا ہے۔ دائیں جانب سڑک کھلی اور روشن تھی۔ بائیں جانب تاریک اور سایہ دار۔ جب کیشی مڑنے لگا تو دلہن نے کہا۔ چلو اب گھر چلیں رات کافی ہوگئی ہے۔ لیکن کیشی نے اس کو اپنے دائیں بازو میں لے لیا۔ چلو کچھ دور تک چلتے ہیں۔ اس جانب کیوں نہیں گئے بڑی کھلی سڑک ہے۔ کیوں ڈر لگتا ہے۔ اور ہنستے ہوئے جھک کر اس نے دلہن کی پیشانی چوم لی۔

دلہن تڑپ کر اس کے بازوؤں سے نکل گئی۔ کیا کرتے ہو سڑک پر؟ کون ہے یہاں اس وقت۔ اس نے ہنس کر اسے چومنا چاہا۔ لیکن جب ہی سامنے سے ایک ٹرک کی تیز روشنی اسکی آنکھوں میں پڑی۔ اور پھر کتنے ہی ٹرک گزر گئے۔ اس کے سارے اوسان ہوا ہو گئے۔ چلے اب چلیں۔ دلہن نے جو پہلے ٹرک کی روشنی ہی دیکھ کر اس کے بازوؤں سے نکل گئی تھی۔ اب رونکھی سی ہو گئی تھی، میں تھک گئی ہوں۔ ذرا آگے چل کر کیشی نے پھر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ اور سڑک کے کنارے سائے میں ہو گیا۔ کیا بہت تھک گئی ہو؟۔ دلہن نے جواب نہیں دیا۔ لیکن اپنے جسم کا بوجھ اپنے شوہر پر ڈال دیا۔ اس نے سے سینے سے لگا کر چوم لیا۔ عین

اس وقت سڑک کے پرے ٹارچ کی روشنی چمکی۔ دونوں الگ ہو گئے۔ کیشی کا رنگ فق ہو گیا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ ایم، ٹی، لائینز میں بارہ بجے کے بعد گھومنے کی اجازت نہیں ہے۔

چودھوین کا چاند ہو یا آفتاب ہو
جو بھی ہو تم خدا کی قسم لاجواب ہو

گہری ہری وردیاں پہنے تین چار فوجی کسی نئے فلم کا مقبول عام گانا گاتے ہوئے، چاندنی کے باوجود ٹارچ ان پر پھینکتے ہوئے سڑک سے گزر گئے۔

فوجیوں کی بدتمیزی نے اس کا سارا ولولہ ختم کر دیا

اسے ایک دوست کی بات یاد آ گئی، جو ایم، ٹی لائینز کے ایک بنگلے میں اپنی بہن کے ساتھ کھانا کھانے آیا۔ باتیں کرتے کرتے بارہ بج گئے۔ جب ساڑھے بارہ بجے رکشا نہ ملنے کی وجہ سے وہ پیدل آ رہے تھے تو سپاہیوں نے انہیں ٹوکا۔ اور دوست کو واپس بنگلہ پر پہنچ کر ثابت کرنا پڑا۔ کہ وہ اپنی بہن کے ساتھ ہی کھانا کھانے آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ دلہن گھر جانے کی التجا کرتی کیشی واپس لوٹا۔ جب فوجی نے گانا گاتے ٹارچ کی اس کی دلہن پر ڈالی تھی۔ تو مارے غصے کے کیشی کا دل چاہتا تھا کہ اسے کالر سے پکڑ کر دو تھپڑ جما دے۔ لیکن اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ یونیورسٹی کا پروفیس اپنی دلہن کے ساتھ اس سنسان مقام پر کیوں گھوم رہا ہے؟ تو وہ کیا جواب دیتا۔۔۔۔۔ اور اس کا سارا غصہ اپنی ماں پر، اس پلنگ پر اور اپنی ذہنی کمزوریوں پر اتر پڑا۔ وہ تیز تیز چلتا واپس آیا، دلہن ذرا اس سے پیچھے گھسٹتی چلی آ رہی تھی، بنگلے مین پہنچ کر اچانک کیشی کی رفتار دھیمی ہو گئی۔ لیکن دلہن رکی نہیں تنکتی ہوئی چلی گئی اور جا کر پلنگ پر دھنس گئی۔ کیشی جب کمرے میں آیا، تو وہ ٹانگیں نیچی کیے چت لیٹی تھی، ساڑھی کا پلو ایک جانب لٹکا ہوا تھا۔ بلاؤز کے کھلے گلے سے اس کا گورا سینہ شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ کیشی کا جی چاہا کہ وہ گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ جائے۔ اور اپنا سر

اس کی گود میں رکھ دے۔لیکن اپنی بیوی سے پھسلتی اس کی نظر غیر شعوری طور پر اپنی ماں کی اس تصویر پر چلی گئی۔اور تذبذب کے عالم میں کمرے کے درمیان کھڑا رہا۔

دلہن چپ چاپ چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔کیشی کی نظریں اچانک بیچ کے دروازے پر گئیں،اور اس نے کہا یہ کمرہ تو باہر سے بند ہے نا،

جی دلہن نے اسی طرح چھت پر نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔

کیشی نے کمرے کے دو چکر لگائے۔اس کی چابی کہاں ہے۔

آنٹی کے پاس ہوگی۔سب سامان انہوں نے ہی رکھوایا تھا۔

کیشی باہر نکل کر کاٹج کے دوسرے کونے تک گیا۔ماں کے کمرے کی بتی بجھ چکی تھی۔ساری عورتیں سوگئی تھیں.....اس کے دل میں آیا ماں کو جگائے۔لیکن خالہ جاگ گئی تو،،،اور اس نے مذاق کر دیا تو،،،،وہ واپس کمرے میں آ کر کچھ لمحے گھومتا رہا۔اس کی نگاہ دلہن پر گئی۔وہ اسی طرح چت لیٹی چھت کو تکے جا رہی تھی۔اچانک بڑھ کر اس نے بیچ کے کمرے کے دروازے کو پیچھے کی طرف دھکیلا۔دروازہ اندر سے بند تھا۔اور نیچے سے کنڈی لگی تھی،اس نے سوچا تھا کہ اگر صرف اوپر کی چٹخنی لگی ہوگی۔تو اوپر کا شیشہ توڑ کر کھول لے گا۔لیکن ماں ہمیشہ نیچے کی چٹخنی لگاتی تھی۔پیچھے ہٹ کر اس نے کمرے کے دروازہ پر ایک نظر ڈالی۔دونوں کواڑوں میں تین،تین شیشے لگے تھے

اگر وہ تیسرا شیشہ توڑ دے تو نچلی چٹخنی کھل سکتی تھی۔اس کے جی میں آیا کہ زور سے مکہ مار کر شیشہ چکنا چور کر دے۔لیکن ماں کے جاگ جانے کا ڈر تھا۔ماں کے جاگ پڑنے کا خیال اس کے جوش پر ٹھنڈے پانی کا چھینٹا بن گیا۔دونوں مٹھیاں کمر کے پیچھے باندھے وہ کمرہ میں گھومنے لگا۔دائیں کواڑ کا کونا چوٹ کھایا ہوا تھا۔وہ فرش پر بیٹھ گیا۔پیٹھ اس نے پلنگ کی پٹی سے لگالی،اور ایڑی کا حصہ کواڑ کے چوٹ

کھائے ہوئے حصے پر ارا کر پورا زور لگایا۔ دروازہ تو نہیں کھلا۔لیکن پلنگ پیچھے کو کھسک گیا۔

چھت کی طرف تکتی ہوئی دلہن اسی طرح لیٹی رہی۔اچانک کیشی نے ایک چور نگاہ اس پر ڈالی۔اس وقت دلہن نے اس کی جانب دیکھا.....طنز کی ایک خفیف سی جھلک،،،،،، جو کسی خبطی کے کرتب دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔کیشی کے سر پر جنون سوار ہو گیا۔اچھل کر بڑھا اور زور کا مکہ

نچلے شیشے پر دے مارا۔شیشہ جھنجھنا کر ٹوٹ گیا۔

دلہن لیٹی نہ رہ سکی۔گھبرا کر اٹھی،اور اپنے شوہر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

آپ کیا کر رہے ہیں اس نے چڑ کر کہا

کیشی نے کوئی جواب نہیں دیا۔اس کی جانب دیکھا تک نہیں ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے ہاتھ ڈال کر اس نے چٹخنی کھولی۔اس کی جسم کے بوجھ سے اچانک دروازہ پیچھے کو ہٹ گیا۔

بائیں ہاتھ سے کواڑ تھام کر نہایت آہستگی سے ہاتھ باہر نکالا تھا۔تو بھی کہنی کے اوپر خراش آ گئی تھی۔

ہائے آپ کیا کر رہے ہیں؟۔اس کی پھٹی قمیض سے خون رستے دیکھ کر دلہن نے گھبرائے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔اس کی کوف زدہ نگائیں سارے کمرے میں گھوم رہی تھیں کہ کہیں کچھ ملے تو وہ پٹی باندھ دے۔کیشی نے دھیان نہیں دیا۔دونوں ہاتھوں سے کواڑ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔مشاق انگلیوں سے اس نے بٹن دبایا۔کمرے میں جہیز کا سارا سامان گڈمڈ پڑا تھا۔فرنیچر۔ڈریسنگ ٹیبل، الماری، کپڑوں کی گھٹڑیاں، میوے مٹھائیوں کے تھال، ایک جانب وہ پلنگ بھی پڑا تھا، جو جہیز میں آیا تھا۔اس پر بے شمار کپڑے پڑے تھے۔دونوں ہاتھوں میں بھر بھر کر اس نے کپڑے صوفے پر پھینکے۔دلہن اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گئی تھی اس

کی آنکھوں میں طنز کی جگہ خوف نے لے لی تھی۔ اچانک پلٹ کر کیشی نے اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا۔ پل بھر وہ ان ڈری سہمی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ پھر یکا یک اس نے دونوں باہوں میں بھر کر اسے چوم لیا۔

دلہن اور بھی سہم گئی لیکن اس نے اپنے خاوند کی آنکھوں میں خفگی کی جگہ بے پناہ محبت رقصاں دیکھی۔ اور اس کے گرم ہونٹوں کا لمس گردن پر محسوس کیا، تو اس کے سہمے ڈرے اعضا ڈھیلے پڑ گئے۔ اور وہ اسکے بال سہلانے لگی۔

علی الصبح ماں باہر آئی تو حجلہ عروسی کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ وہ چونکی۔ دبے پاؤں بڑھ کر اس نے پردہ ہٹایا دل دھک سے رہ گیا۔ سجا سجایا کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اچانک اسکی نگاہیں بیچ کے کمرے کے کھلے دروازے کے بیچ فرش پر بکھرے ٹوٹے شیشوں پر گئیں۔ چوری کے خوف سے گھبرا کر وہ آگے بڑھی۔ چوکھٹ ہی میں سن کھڑی رہ گئی۔ کوچ کی گدیاں سر کے نیچے رکھے جہیز کے کھرے پلنگ پر دولھا، دلہن بے سدھ پڑے سو رہے تھے!!!

ٹیلی گرام

افسانہ نگار : جوگندر پال

پچھلے بارہ برس سے شیام بابو تار گھر میں کام کر رہا ہے۔لیکن ابھی تک یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ بے حساب الفاظ برقی تاروں میں اپنی اپنی پوزیشن میں جوں کے توں کیوں کر بھاگتے رہتے ہیں، کبھی بدحواس ہو کر ٹکرا کیوں نہیں جاتے۔ٹکرا جائیں تو لاکھوں کروڑوں ٹکراتے ہی دم توڑ جائیں۔اور باقی کے لاکھوں کروڑوں کی قطاریں ٹوٹ جائیں۔تو وہ اپنی سمجھ بوجھ سے نئے رشتوں میں منسلک ہو کر کچھ اس حالت میں ری سیونگ اسٹیشنوں پر پہنچیں ''بیٹے نے ماں کو جنم دیا'' سٹاپ مبارک باد۔ یا چوروں نے قانون کو گرفتار کر لیا۔ یا افسوس کہ زندہ بچہ پیدا ہوا ہے۔یا..... ہاں اس میں کیا مضائقہ ہے؟..... شیام بابو مشین کی طرح بے لاگ ہو کر میکانکی انداز میں برقی پیغامات کے کوڈ کو رومن

حروف میں لکھتا جا رہا ہے۔لیکن اس مشین کے اندر ہی اندر ان بوکھلائی ہوئی انسانی سوچوں کا تالاب بھر رہا ہے۔۔۔۔۔کیا مضائقہ ہے؟۔جیسی زندگی ویسے پیغام..... کرتا ہوں سٹاپ کشور'' اس نے کسی کشور کے تار کے کوڈ سے یہ آخری الفاظ کاغذ پر اتار لیے ہیں۔اور وہ اس بات سے بالکل بے خبر ہے، کہ تار کا پورا مضمون کیا ہے، اس کا کام تو بس یہی ہے کہ کوڈ سے برآمد ہوتے ہوئے ایک ایک لفظ کو قلم بند کرتا جائے۔سوچنا سمجھنا اس کا کام ہے۔جس کے نام پیغام موصول ہوا ہو..... دھیرج..... دھیرج کو کوئی پکارے تو آواز کو سارا ہجوم سن لیتا ہے۔لیکن صرف دھیرج ہی مڑ کر دیکھتا ہے کہ کیا ہے..... خلاف معمول نامعلوم کیا سوچ کر شیام بابو

تارکا مضمون پڑھنے لگا۔ ..... شادی روک لو سٹاپ میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔ سٹاپ کشور وہ ہنس پڑا ہے۔۔۔۔۔ سو دوسرے ہنگامے ہیں۔ بے چارہ تھوڑی سی محبت کر کے باقی محبت کرنا بھول گیا ہو گا، مگر اب کوئی راہ نہیں سوجھ رہی ہے۔ تو باقی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر محبت ہی محبت کیے جانے کا اعلان کر رہا ہے۔

محبت ہی محبت کرنے سے کیا ہوتا ہے بے بی؟

طلاق، ڈارلنگ! طلاق ہو جائے مگر محبت قائم رہے۔

اور یہ ..... شیام بابو ایک اور تارکا مضمون پڑھنے لگا

..... باپ کی موت کی خبر پا کر مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔۔۔۔۔ شیام بابو پھر ہنس دیا۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ اپنے باپ کی موت پر مجھے اتنا افسوس ہوا کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

تو کیوں کر رہے ہو بھائی؟

تاکہ میرا رونا نکل آئے۔ آیئے آپ بھی میرے ساتھ روئیے۔

سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بندروں کو چپ کیسے کرایا جائے۔ سب کے سب روتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

ارے بھائی کیوں رو رہے ہو؟

مجھے کیا پتا اس سے پوچھو۔

تم ہی بتا دو، کیوں رو رہے ہو؟

مجھے کیا پتا اس سے پوچھو۔

تم .....

مجھے کیا پتا؟

تم تو آخری بندر ہو بھائی بتاؤ کیوں رو رہے ہو؟

بس یوں ہی سوچا کہ ذرا فرصت میسر آئی ہے۔تو ایک بار جی جان سے رولوں، میرا ایک کام کیجیئے آپ کو زحمت تو ہوگی۔مگر میرے رونے کو کسی تگڑی سیالم ناک خبر میں پیش کرنے کے لئے ایک ارجنٹ ٹیلی گرام کا ڈرافٹ تیار کر دیجیئے۔میری ماں مرگئی ہے......ٹھہریے، وہ تو غریب اسی روز مرگئی تھی، جب بیوہ ہوئی تھی۔اس دن سے ہم نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔۔۔۔لکھیے میرا بھائی مرگیا ہے۔......ہاں یہی لکھیے......مگر نہیں، سب کو معلوم ہے کہ ہماری آپس میں نہیں بنتی تھی۔۔۔۔میری بہن۔۔۔۔نہیں وہ تو پہلے ہی مر چکی ہے،،،،،،، میں،،،،،،، ارے ہاں یہی لکھیے، میں ہی مرگیا ہوں۔مجھے سب کو فوری طور پر یہ خبر کرنا ہے کہ میں ہی مرگیا ہوں،،،،،

مبارک باد پیش کرتا ہوں سٹاپ،،،،،،، شیام بابو کے خودکار قلم نے جلدی جلدی لکھ دیا۔

اور وہ اپنی اس تحریر سے بے خبر سوچ رہا ہے، مجھے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے، کہ میں زندہ ہوں، میں زندہ ہوں، تو یہ میز بھی زندہ ہے۔جس پر جھک کر میں اپنا کام کیے جا رہا ہوں۔کیونکہ یہ میز کھائے پیے سوئے بغیر زندہ رہ سکتی ہے۔اس لئے اس کی ڈیوٹی یہ ہے کہ ہمارے دفتر کے اس کمرے کے لئے چوبیس گھنٹے خدمت بجالانے کے لئے اپنی چاروں ٹانگوں پر کھڑی رہے۔اور مجھے چونکہ اپنی مشین کی ٹک ٹک کو بھی چلائے رکھنا ہوتا ہے۔اس لئے میرے لئے یہ آرڈر ہے کہ آٹھ گھنٹے یہاں ڈٹ کر کام کرو۔اور باقی وقت میں اپنی مشین کی دیکھ بھال کے سارے دھندے سنبھالو،،،،،، ہاں یہی تو ہے، مین جیتا کہاں ہوں، دفتر مین تو صرف پرو ڈکشن کا کام ہے۔مشین چلنا بند ہو جائے تو پروڈکشن پر برا اثر پڑے گا۔اس لئے سارے دفتری ٹُم مین ت و مشین یہاں چلتی رہتی ہے۔اس کے بعد مجھے ساری مشین کو کھول کر صاف کرنا پڑتا ہے۔اس کی آئیلنگ گریزنگ کرنا پڑتی ہے۔اس

کے ایک ایک ڈھیلے پرزے کو کسنا پڑتا ہے۔۔۔اور یہ سارے کام بھی مجھے اکیلے ہی انجام دینا ہوتا ہے۔

پچھلے ساڑھے سات برس سے، جب سے شیام بابو کی شادی ہوئی ہے۔اس کی بیوی وہیں اپنے ماں باپ کے گاؤں میں ان کے ساتھ رہتی ہے۔شادی کے موقع پر وہ اس کی ڈولی اٹھوا کر گاؤں سے باہر تو لے آیا۔لیکن جب سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کہاں لے جائے تو ڈولی کا منہ واپس گاؤں کی طرف مڑوالیا۔۔۔۔۔یہ تم نے بہت اچھا کیا بیٹا۔اس کی ساس نے کہا،،،،،کہ ایک بار ہماری بیٹی کو گاؤں سے باہر لے گئے کم از کم رسم تو پوری ہوئی۔اب چاہو تو بے شک ساری عمر یہیں رہے رسم تو پوری ہوئی۔یہ گھر بھی تو اسی کا ہے۔لیکن اس کا کوئی اپنا گھر کیوں نہیں۔جہاں اسے وہ لے آتا تو اس میں بوئی ہوئی انسانیت کی آبیاری ہوتی رہتی۔

شروع شروع میں تو شیام بابو کی بے چینی کا یہ عالم تھا۔کہ سوتے میں بھی بیوی کے گاؤں کا رخ کیے ہوتا۔۔۔تم گھبراؤ نہیں ستیہ وتی۔میں دن رات کرائے پر کوئی اچھا سا کمرہ کرایہ پر لینے کے لئے جٹا ہوا ہوں، جیسے ہی کوئی مل گیا۔میں اسی دم تمہیں لے آؤں گا۔۔۔مگر برا ہو اس شہر کا، جو اپنے چھوٹے سے دل میں ایک کے اوپر ایک کئی کمرے بنائے ہوئے ہے۔مگر اتنی اونچائی پر رہائش کے خیال سے اسے یہاں رہنے کی بجائے یہاں سے لڑھک کر خودکشی کی سوجھتی ہے۔پورے ساڑھے سات برس اسی طرح گزر گئے۔وہ یہاں اور بیوی ساڑھے پانچ سو میل کے فاصلے پر وہاں۔شیام بابو بیس کم تین سو پینسٹھ دن تک اپنی ارنڈ لیو کا انتظار کرتا رہتا۔اور وقت آنے پر گاڑیوں، بسوں اور تانگوں کو بدل بدل کر وہ گویا اپنے دونوں پیروں سے سرپٹ بھاگتے ہوئے وہاں جا پہنچتا۔اور اس کی خواہش اتنی شدید ہوتی کہ اپنی تیار بیٹھی ہوئی بیوی پر وہ بے اختیار کسی درندے کی طرح ٹوٹ پڑتا۔ایک..... دو..... تین سال تک تو وہ ہر سال گیا۔لیکن چوتھے سال عین چھٹی کے

دنوں میں وہ بیمار ہو گیا۔ پھر پانچویں سال جو جانا ہوا۔ تو اس کے بعد ڈھائی سال میں ایک بار بھی نہ جا سکا۔ جو پیسے وہاں جانے میں ضائع ہوں گے اس سے آدھے پیسے بھی بھیج دوں گا تو بیسیوں کام نکال لے گی۔۔۔۔۔ ہاں اس کا ایک دو سالہ لڑکا بھی ہے۔ جس کے بارے میں اس کی بیوی نے لکھا تھا، کہ وہ اسے اپنی پانچویں سال کی چھٹی پر اسکی کوکھ میں ڈال آیا تھا۔ لیکن شیام بابو اپنا حساب کتاب کر کے اس نتیجے پر پہنچا تھا، کہ اس کا بیٹا اس کا بیٹا نہیں۔ شاید اسی وجہ سے ڈھائی سال کے اس عرصہ میں وہ ایک بار بھی اس سے ملنے نہ گیا۔ لیکن اس سلسلے میں اس نے بیوی کو بھی کچھ نہ لکھا۔۔۔۔۔ جو ہے سو ٹھیک ہے۔ وہ بھی کیا کرے؟..... اور میں بھی کیا کروں؟..... کبھی اچھے دن آ گئے تو سب اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور اس کے..... ہمارے بچے کو..... اس کا ہوات وہم دونوں کا ہی ہوا..... یہیں اپنے پاس لے آؤں گا۔ اور پھر ہم چین سے رہیں گے بڑے چین سے رہیں گے۔

شیام بابو، شیام بابو!

اس کے دفتر کا کوئی ساتھی اس کا کندھا جھٹک رہا ہے۔ مشین میں شاید کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ رکی پڑی ہے۔۔۔۔ شیام بابو!

آں..... ں..... شیام بابو نے ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں کھول لی ہیں۔

طبیعت خراب ہے تو گھر چلے جاؤ۔

کون سا گھر؟ نہیں ٹھیک ہوں، یوں ہی ذرا اونگھنے لگا تھا۔ ٹک،،، ٹک،،، مشین پھر چلنے لگی،

تمہارے لئے پانی منگواؤں؟

ارے بھائی کہہ دیا نا، ٹھیک ہوں۔

اس کے ساتھی نے تعجب سے اس کے کام پر جھکے ہوئے سر کو دیکھا ہے، اور

اپنے کام میں الجھ گیا ہے۔

شیام بابو کو اپنا جی اچانک بھر بھرا سا لگنے لگا ہے۔ عام طور پر تو یہی ہوتا ہے۔ کہ اسے اپنی خوشی کی خبر ہوتی ہے نہ اداسی کی، اسے بس جو بھی ہوتا ہے بے خبری میں ہی ہوتا ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اور یوں ہی سب کچھ بخوبی ہو تا چلا جاتا ہے۔ وہ بے خبر سا اپنے دفتر میں آ پہنچتا ہے۔ اور اسی حالت میں سارا دن قلم چلا چلا کر اپنے ٹھکانے پر لوٹ آتا ہے۔ پھر دوسرے دن صبح کو عین ویسے کا ویسا ڈیوٹی پر آ بیٹھتا ہے۔ یعنی معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے، کیوں ہے، کیا ہے؟ کوئی ہو تو معلوم بھی ہو۔ اس دن تو حد ہو گئی

وہ یہاں اپنی سیٹ پر بیٹھا ہے۔ اور اس کا باس پوچھ رہا ہے کہ شیام بابو آج کہاں ہے۔؟

شیام بابو..... شیام بابو..... شیام بابو یقینی طور پر اس کی آواز سن رہا ہے۔ مگر سن رہا ہے، تو فوراً جواب کیوں نہیں دیتا؟..... یس سر..... ایسے بھولے بھٹکے چہرے شاید ہماری آنکھوں مین ٹھہرنے کی بجائے روحوں میں لڑھک جاتے ہیں۔ ان سے مخاطب ہونا ہو تو اپنے ہی اندر رہو لو اپنی ہی تھوڑی سی جان سے انہیں زندہ کر لو۔ ورنہ تو جیسے ہیں ویسے ہی ہیں۔

گوشت کو خون رگوں میں دوڑنے کی اطلاع ملتی رہے تو یہ زندہ رہت اہے ورنہ بے خبری میں مٹی ہو جاتا ہے۔ جب شیام بابو کی اپنی زندگی بے پیغام ہے، تو اسے کیسے محسوس ہو کہ ٹیلی گراموں کے ٹیکسٹ برقی کوڈ کی آؤٹ میں کھلکھلا کر ہنس رہے ہیں۔ یا دھاڑیں مار مار کر رو رہے ہیں۔ یا تجسس سے اکڑے پڑے ہیں۔ سوکھی مٹی کے دل پر آپ کچھ بھی لکھ دیجیئے، اسے اس سے کیا؟ شیام بابو کو اس سے کیا؟ کہ کوئی کسے کیا پیغام بھیج رہا ہے؟ محبت کا یا نفرت کا، خوشی کا یا غم کا۔۔۔۔۔ اسے کیا..... ٹیلی گراموں کے گرم گرم ٹیکسٹ کا کوڈ اس کے ٹھنڈے قلم کی سولی سے

لٹک کر سپاٹ سی صورت لیے کاغذ پر ڈھیر ہوتا رہتا ہے۔۔۔۔ یہ لو الفاظ الفاظ تو نرے الفاظ ہیں۔ الفاظ کیوں ہنسیں یا روئیں گے۔؟ ان کو پڑھ کے ہنسو یا روؤ، یا جو بھی کرو، تم ہی کرو..... یہ لو!

لیکن اس وقت یہ ہے کہ شیام بابو کو اپنا جی یک بارگی بہت بھر بھرا لگنے لگا ہے۔ سوچوں کا تالاب شاید بھر بھر کے اس کے دل تک آ پہنچا ہے۔ اور وہ انجانے میں تیرنے لگا ہے۔ اور سوکھی مٹی میں جان پڑنے لگی ہے۔..... ٹاپ میں بدلیس سے لوٹ آیا ہوں

ٹاپ..... اور عین اسی وقت صاحب کے چپڑاسی نے اس کی آنکھوں کے نیچے ہیڈ آفس کا ایک لیٹر رکھ دیا۔ اس نے لیٹر پر ایک نظر ڈالی۔ اور پھر چونک کر خوشی سے کانپتے ہوئے اسے دوبارہ پڑھنے لگا۔ اسے سرکاری طور پر اطلاع دی گئی ہے کہ اس کے نام دو کمروں کا کوارٹر منظور ہو گیا ہے۔

کیدار بابو..... جمیل..... کشن..... ادھر دیکھو دوستو دیکھو میرا کیا لیٹر آیا ہے؟

میرا کوارٹر منظور ہو گیا ہے!

تو کیا ہوا؟..... ہائیں کیا کہا..... کوارٹر منظور ہو گیا ہے؟

ہاں

بہت اچھا، بہت اچھا..... سب کے لئے چائے ہو جائے شیام بابو!

ارے چائے ہی کیا، کچھ ادھار دے سکتے ہو تو جو جی چاہے منگوا لو۔

ہاں تم فکر نہ کرو..... میں سارا بندوبست کیے دیتا ہوں۔..... یہ تو بہت ہی اچھا ہو گیا شیام بابو..... رامو..... ادھر آؤ رامو..... جاؤ ہوٹل والے کو بلا لاؤ۔۔۔۔ آپ بھابھی کو کب لا رہے ہیں شیام بابو؟

آج چھٹی کی درخواست دے کر ہی جاؤں گا کیدار بابو۔۔۔۔ شیام بابو تصور میں اپنے کوارٹر میں بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔ اور اس کے کندھوں پر اس کا لڑکا کھیل

رہا ہے۔۔۔۔۔کیا نام ہے اس کا..... دیکھو نا، دماغ پر زور ڈالے بغیر اپنے اکلوتے بچے کا..... اپنا ہی تو ہے..... نام بھی یاد نہیں آتا۔کوئی بات نہیں شکر اور دودھ ملتے ہی گاڑھے اور میٹھے ہو جاتے ہیں۔

اری سن رہی ہو بھلی لوگ؟

اگلی چپاتی کب بھیجو گی؟ دفتر کے لئے دیر ہو رہی ہے۔

لو، شیام بابو ہوٹل والا تو آ گیا۔۔۔۔بس ایک ایک چاٹ، ایک ایک گلاب جامن اور کیا؟..... ایک ایک سموسہ..... چلے گا نا شیام بابو؟..... لکھو ہمارا آرڈر بھائی پرنانند!

شیام بابو کو پتا ہی نہ چلا کہ دفتر میں باقی وقت کیسے بیت گیا؟ وہاں سے اٹھنے سے پہلے اس نے سب ساتھیوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ کل سویرے ان سب کو ان کی بھابھی کی تصویر دکھائے گا۔

اتنی بھولی ہے کہ ڈرتا ہوں کہ ڈرتا ہوں اس شہر میں کیسے رہے گی؟

ڈرو مت شیام بابو، بھابھی کو لانا ہے تو آپ شیر ببر بن جاؤ۔

دفتر سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے شیام بابو چوراہے پر آ گیا۔اور پان اور سگریٹ لینے کیلئے رک گیا۔۔۔۔اور پھر تمباکو والے پان کا لعاب حلق سے اتارتے ہوئے نتھنوں سے سگریٹ کا دھواں بکھیرتے ہوئے ہلکی، ہلکی سردی میں حدت محسوس کرتے وہ بڑے اطمینان سے اپنی رہائش کے اڈے کی طرف ہو لیا۔ایک چھوٹی سی کھولی۔جس میں مشکل سے ایک چارپائی آتی ہے۔ابھی پچھلے ہی مہینے خاں سیٹھ نے اسے دھمکی دی تھی کہ بھاڑے کے دس روپے بڑھاؤ، نہیں تو چلتے بنو۔۔۔۔ہاں

چوہے کے اس بل کا پہلے ہی پچاس روپے کرایہ وصول کرتے ہو۔خان سیٹھ اپنے خدا سے ڈرو۔۔۔۔

لیکن خان سیٹھ نے اپنے خدا کو ڈرانے کے لئے ایک بھیانک قہقہہ لگایا،،،،،،
،بلی شریف نہ ہوتی بابو تو بولو کیا ہو جاتا؟.....ساٹھ روپے ہاں،،نہیں تو خالی کرو.....
ہاں

اسی مہینے خالی کر دوں گا۔اور سیٹھ سے کہوں گا لو سنبھالو اپنی کھولی سیٹھ،تمہاری قبر کی پورے سائز کی ہے.....لو.....نہیں جھگڑے وگڑے کا کیا فائدہ؟اس کی کھولی اسکے حوالے کر کے اپنی راہ لوں گا۔

بس سٹاپ آ گیا ہے اور بس بھی کھڑی ہے،لیکن بہت بھری ہوئی ہے۔شیام بابو نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ پیدل ہی جائے گا۔یہاں سے تھوڑا ہی فاصلہ تو ہے۔

اس کا سگریٹ جل جل کر انگلیوں تک آن پہنچا ہے۔لیکن اس کی خواہش ابھی نہیں مٹی ہے۔اس نے ہاتھ کا ٹکڑا پھینک کر ایک اور سگریٹ سلگا لیا ہے۔ساوتری کو میرا سگریٹ پینا بالکل پسند نہیں۔

پیسے بھی جلاتے ہو اور پھیپھڑے بھی۔اس سے تو اچھا ہے میرا ہی ایک سرا جلا کر دوسرے کو ہونٹوں میں دبا لو۔اور دھواں چھوڑتے جاؤ۔میرا مزہ کیا سگریٹ سے کم ہے؟.....ارے بھلی لوگ ایک تمہارا ہی مزہ تو ہے۔سگرٹ وگرٹ کی لت کو گولی مارو.....آؤ.....اسنے خیال ہی خیال میں بیوی کو سینے سے لگا لیا۔اور مخالف سمت سے آتی ہوئی ایک عورت سے ٹکرا گیا ہے،گویا اس کی ساوتری نے اس سے الگ ہونے کے لئے اپنے آپ کو جھٹکا ہو۔

ارے اس نے اندھے پن میں اپنا ہاتھ اس عورت کی طرف پھیلا دیا .....ایڈیٹ!.....وہ عورت غصے سے پھنکارتی ہوئی آگے بڑھ گئی ہے.....اور شیام بابو شرمندہ ہونے کے باوجود خوش خوش ہے۔اور عورت کی پیٹھ کی طرف منہ لٹکا کر اس نے کہا۔آئی ایم،ساری میڈم۔لیکن اس عورت کی پھنکار پھر اسکے بند کانوں کے باہر ٹکرائی۔ایڈیٹ!

شیام بابو اپنے ذہن کو جھاڑ رہا ہے۔ اور اڑتی ہوئی گرد میں اس کی بیوی زور زور سے ہنس رہی ہے۔۔۔۔ اور ٹکراؤ پرائی عورتوں سے ایک میں ہوں جو بلا روک ٹوک ساری دست درازیاں سہہ لیتی ہوں۔ میں اور کی طرف ذرا نظر اٹھا کر تو دیکھوں؟

کسی اور کی طرف مجھے دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرے لئے تو جو کچھ ہو بس تم ہو۔۔۔۔۔ شیام بابو نے اپنے آپ کو ڈانٹ کر کہا،،،،، نہیں تم نے خواہ مخواہ اپنی بیوی کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا رکھا ہے۔ تمہارا بچہ تمہارا ہی ہے۔۔۔۔۔ اگر مان بھی لیں تو اس میں ساوتری کا کیا دوش۔ اس کا سارا سال

تمہاری ارنڈ لیو کے دس بیس روز کا تو نہیں،،،،، چلو سب ٹھیک ہے۔ میرا بچہ میرا ہی ہے۔۔۔۔۔ ہمارے نیٹو کی آنکھیں تمہاری آنکھوں کی طرح چھوٹی، چھوٹی ہیں، ماتھا مجھ پر گیا ہے، مگر ناک..... میں بھی کیسا باپ ہوں۔ دو سال سے اوپر کا ہو لیا ہے۔ مگر میں نے اسے ایک بار بھی نہیں دیکھا ہے۔ پچھلے سال مجھے ایک چکر کاٹ آنا چاہیئے تھا۔۔۔۔ آج چھٹی کی درخواست دینا بھی بھول گیا ہوں۔ اب کل پہلا یہی کام کروں گا۔ اور اس ہفتے کے آخر میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔۔۔۔ ساوتری کو چٹھی بھی نہ لکھوں گا۔ اچانک اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاؤں گا۔

اور وہ آنکھیں مل مل کر میری طرف دیکھتی رہ جائے گی۔ ساوتری..... وہ رو دے گی۔

یہ مجھے کس کی آواز سنائی دی ہے۔..... ہائے نیٹو کے بابو۔ اب تو آ جاؤ۔۔۔۔

میں آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لوں گا۔ وہ میرے بازوؤں میں بے ہوش ہو جائے گی۔ ساوتری..... ساوتری!

اپنی کھولی کے سامنے پہنچ کر اس نے بے اختیار اپنی بیوی کا نام پکارا ہے۔ لیکن وہاں کے تار گھر کے رامو نے آگے بڑھ کر اسے جواب دیا ہے..... بابو جی

ارے رامو تم کیسے آئے؟......شیام بابو اپنے حواس درست کر رہا ہے۔

بابو جی......رامو کی آواز بھاری ہے۔اور وہ بولتے ہوئے تامل برت رہا ہے۔

--

اتنے اکھڑے اکھڑے کیوں ہو؟ بولو نا

آپ کا تار لایا ہوں

میرا تار؟

ہاں بابو جی یہ تار آپ ہی کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔مگر آپ کا دھیان ہی نہیں گیا۔کہ آپ کا ہے۔

تار کا لفافہ ایک طرف سے کھلا ہے لیکن شیام بابو اسے دوسری طرف سے چاک کر رہا ہے

ڈسپیچ والے کشن سنگھ کو بھی خیال نہ آیا کہ یہ تار آپ کا ہے۔

شیام بابو نے تار کا فارم کھول کر اپنی آنکھوں کے سامنے فٹ کر لیا ہے۔

مجھے بھی آدھا راستہ طے کر کے اچانک خیال آیا کہ یہ تار تو اپنے بابو جی کا ہے۔

۔۔۔۔میں اسے پڑھ چکا ہوں،،،،،بہت افسوس ہے کہ،،،،،،،ساوتری نے خود کشی کر لی ہے۔سٹاپ......

ایک انار

افسانہ نگار : جیلانی بانو

''اطہر ایم۔اے کر کے علی گڑھ سے آ گیا''

یہ خبر جس کے گھر پہنچی چراغ جلتے گئے۔

ڈپٹن نے ہیرے کے کنگن بینک سے نکلوا کر تسنیم کے ہاتھوں میں ڈال دیئے۔ ایسی ہی چیزوں سے لوگ لینے دینے کا اندازہ کرتے ہیں۔

راحت کی خالہ نے ہر آنے جانے والے سے کہنا شروع کر دیا کہ ان کا لڑکا پاکستان میں پیش کار ہو گیا ہے۔

اچھی بی کی ماں نے دلہن سے دوپٹے منگوا بھیجے،

اے تکلیف کا ہے کی اچھی بی تو چار دن میں دوپٹہ کاڑھ پھینکتی ہے۔ اب تک منوں دوپٹے کاڑھ ڈالے۔ ہماری بیٹیوں میں تو انکار کی عادت ہی نہیں، سینا پرونا، کاڑھنا اور پکانا سبھی کچھ جانتی ہیں۔ آج کل والے بے حیائی کے ڈھنگ نہیں سکھائے۔ بھئی ہماری باجی تو چاند ہے چاند ثروت کی بہن نے اترا کر اطہر کی چھوٹی بہن نادرہ کو سنایا۔

بالکل میموں جیسے ڈھنگ ہیں اس کے، پرسوں خالہ کو دیکھنے وہ فرنگن ڈاکٹرنی آئی تو کہہ رہی تھی، تمہاری بہن تو بالکل ہمارے دیس کی لگتی ہے۔ کمبخت کی آنکھوں میں خاک۔

اور تو اور وہ خرسواروں کے واحد حسین کے ہاں بھی سنا تھا۔ بڑی سرگرمی دکھائی دینے لگی ہے۔

اس خاندان کا نام خرسواریوں پڑا کہ پیڑھیوں پہلے جب وہ لوگ بریلی آ کر آباد

ہوئے ۔تو گدھوں پر چڑھ کر آئے تھے۔ ویسے کہنے کو تو ڈپٹن کا خاندان بھی شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتا ہے۔لیکن وہ لوگ چڑی مار کہلاتے تھے۔شہر کے شرفاء سے ان کا کوئی جوڑ نہ تھا۔صرف اس لئے کہ ڈپٹی صاحب کے کسی مکڑ دادا چڑیوں کا شکار بیچا کرتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ نئی فیشن کی لڑکیاں ڈپٹی صاحب کی کوٹھی یا نوکر چاکر ڈپٹن کا گھر کہہ لیں ۔تو کہہ لیں۔مگر دعوت مہمانیوں میں حجام، ڈوم چڑی ماروں میں ڈولی لے کر جاتے ۔خرسواروں میں رشتے ناطے کبھی نہ ہوئے۔

لیکن پاکستان کیا بنا۔اپنے ساتھ ساری روایتوں، اصولوں کو بہا لے گیا۔ لڑکے تو یوں غائب ہوئے کہ آنکھوں میں سرمہ لگانے کو نہ ملتے۔خود اطہر چچا اپنے لڑکوں سمیت پاکستان چلے گئے تھے۔اور اب کسٹوڈین نے چھوٹ حویلی شرنارتھیوں کو دے دی تھی۔خیر اطہر کی ماں چھوٹی دلہن بیگم کو کوئی فکر نہ تھی کیونکہ دونوں لڑکیاں چچا کے ہاں منگی ہوئی تھیں۔لڑکے پاکستان نوکر ہوئے نہیں کہ بیاہ تیار سمجھو۔لیکن گھر میں تو یہ حالت نہ تھی، صبح ہیں اور شام دیکھو تو گھر خالی کر کے پاکستان سدھارے۔موت کی سی چٹاپٹی تھی۔صرف وہی لوگ رہ گئے تھے۔جنہیں تھوڑی بہت جائیداد کا سہارا تھا۔کسی کو پنشن اور گھر کا آسرا روکے ہوئے تھا۔تھوڑے دنوں ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد سب ہی کیا اونچی ناک جھکنے لگی۔

کچے کنواروں کو ساتھ لے کر کون ریگستان الانگتا۔

اللہ میاں کے پچھواڑے جائے گا۔

اندھیا کر اپنی بیٹیاں خرسواروں میں دے دیں۔ چڑی ماروں کی بہوئیں اتنا جہیز لائیں کہ کھچے کھچے لڑکوں کی مائیں بھی اپنی آن پر قائم نہ رہ سکیں۔ یہ پاکستان نہ جانے کتنی پرانی روایتوں کو توڑ کر نئے رشتے استوار کر رہا تھا۔

ادھر پاکستان سے جس کا خط آئے دو چار نئی شادیوں کا ذکر سن لیجئے۔وہ بھی یونہی بے جوڑ کسی نے سندھن لڑکے سے بیاہ کر لیا۔تو کسی نے پنجابی لڑکے کو بیٹی

دے دی۔

لوگ انگلیاں اٹھاتے اٹھاتے تھکتے جا رہے تھے۔ جب سارے محمود ایاز ایک ہی صف میں کھڑے نظر آئیں تو کس کس پر ہنسا جائے۔

محل والی نواب بیگم لنگڑے وکیل کی بیوی نے تو اچھا خاصا ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا دفتر کھول لیا تھا۔ محل کا سلیقہ اور زبان درازی تو مشہور ہی تھی۔ سوئی جیسی بات کو بھالا بنا کر پیش کرنا محل والیوں کا شیوہ رہا ہے۔ بیبیاں اس گھرانے کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتیں۔ جس نے سنی ہوں سو تالیاں وہ دیکھے محل والیاں۔ پاکستان بنتے ہی بہت سی تتر بتر ہو گئیں۔ لیکن نواب بیگم اب بھی محل کی مجاور بنی وضعداری نبھائے جا رہی تھی۔

اپنی پانچوں لڑکیوں کو جو انہوں نے علی گڑھ بھیج کر پڑھایا تھا تو کچھ سوچا ہی ہوگا، کیا جانتی نہ تھیں، کہ بریلی کے شریف خان دانوں میں کبھی رشتے ناطے نہ ہوئے۔ سات پشتوں سے محل والیوں کی ذات میں کھوٹ چلی آ رہی تھی۔ پھر لڑکیاں شریف ہوں تو کیا، ایک سے ایک دیدہ پھٹی۔ بے پردہ، ہر محفل میں چاند سے چہرے لیے موجود بیبیوں کے منہ پر چڑھ کر بیٹھنے کا ارمان۔ لوگ سوچ سوچ کر تکھے جاتے ہیں کہ ان کا ٹھکانہ کہاں ہوگا۔

مگر نواب بیگم بڑی چلتی پرزہ تھیں۔ ایک تو اس نے محل کی دولت سے خوب ٹھاٹ باٹ بنائے تھے، پھر اپنی لڑکیوں کی صحبت میں مردوں کی طرح شائستہ زبان بولتیں۔ ادھیڑ عمر میں بھی سنگھار پٹار کا شوق تھا۔ بیاہ براتوں میں ساڑھی باندھے دیکھ کر بہت سی عورتیں تو منہ پر کہہ دیتیں۔ اے نواب بیگم تم تو بالکل پردیسن لگو ہو۔

سو جیسے ہی پرمٹ بننے لگے۔ دو چار مہینے کے لئے پاکستان گئیں اور ایک ایک لڑکی کا بیاہ کرتی آئی۔

جنے قصائی تھے یا کنجڑے، صرف اتنا سنا کہ اس کے پانچوں داماد گزیٹیڈ عہدہ

دار تھے۔ نہ جانے لوگوں کو رجھانے کا اسے کون سا گر آتا تھا۔ جو یوں چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو جاتا۔

اپنی پانچوں لڑکیوں کو نبٹا کر لنگڑے وکیل کی وکالت کے سہارے نواب بیگم چین کی بنسری بجایا کرتیں۔ مگر کمر ہمت ابھی تک کسی ہوئی تھی، شہر میں جتنے رشتے ناطے ہوتے ان کا معاملہ محل ہی سے طے کیا جاتا۔ ہر گھر کی لڑکیاں لڑکیاں ان کی نظر میں تھے۔ ساتھ ہی ان کے اقتصادی حالات اور امکانات بھی۔

جس تقریب مین نواب بیگم موجود ہوں۔ وہاں ڈپٹن اور واحد حسین کی بیوی کی کوئی حیثیت باقی نہ رہ جاتی۔ دلہن بیگم تو ہمیشہ ہی کی منہ مری ٹھہریں۔ نہ جانے کتنی لڑکیوں کی طرف سے ایجاب وقبول کے وقت اقرار کر چکی تھیں۔ کتنی دلہنوں کو سجایا اور کتنی بیبیوں کو اپنے ہاتھ سے کفن بھی پہنایا۔

پھر غلط بات پر جتانا، بیبیوں کے پھوہڑ پن پر ٹوکنا، بچوں کو ڈانٹنا، اور لڑکیوں کو نصیحت کرنے کا سٹائل بھی کچھ نواب بیگم کو ہی آتا تھا۔

لڑکیوں کو ان سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ عینک لگی آنکھوں سے جب وہ لڑکیوں کی ڈولی کو گھورنا شروع کرتیں، تو دوپٹے منہ میں ٹھونس کر ہنسی کے مارے برا حال ہو جاتا۔ ان کے جاتے ہی ایک دوسرے کی خبر لی جاتی۔

کون پھنسی۔

ارے اب ناہید کا وارنٹ نکلنے والا ہے۔ آج نواب بیگم اس پر بہت مہربان ہیں۔

ہا بے چاری حشو،،،، دیکھو اب نواب بیگم تجھ سے کیسا انتقام لیں گی۔

لیکن لڑکیوں کا وہ گروپ جو اب سکول چھوڑ کر کالج جانے لگا تھا۔ نواب بیگم سے بالکل نہ دبتا۔ سر محفل ان کی چال ڈھال پر قہقہے لگائے جاتے۔ ان کی غلط سلط انگریزی درست کی جاتی۔ ان کی نقل کرنے سے بھی لڑکیاں نہ چوکتیں۔ ت و پھ

رنواب بیگم کو بھی نئی تعلیم پر افسوس ہوتا۔

ہماری لڑکیاں بھی کالج میں پڑھ چکی ہیں۔لیکن ایسی شتر بے مہار نہ بنیں۔ پڑھنے کے معنی یہ ہین کہ آپ کا اخلاق اور علم۔وہ.....وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر کہنا شروع کرتیں۔

جی اچھا معلوم ہوا۔

معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

تقریر جاری ہے۔اور وہ سب ہنستی ہوئی کوٹھے پر بھاگ جاتیں۔

ایسے میں اطہر علی گڑھ سے کیا آیا، کہ ہر طرف کے شکاری مچھلی پھنسنے کا انتظار کرنے لگے۔

تم نے کچھ سنا۔سب ایک دوسرے کی ٹوہ لیتے۔

کل خالدہ کو خوب بنا سنوار کر اس کی ماں دلہن بیگم کے ہاں لے گئی تھیں۔سن ا ہے کہ خالدہ نے خوب انگریزی میں اطہر سے باتیں کیں۔اور اب وہ خالدہ کو پڑھایا کرے گا۔

سچ مچ کسی کا یقین کرنے کو جی نہ چاہا۔

وہ ماں بیٹی تو یونہی دلی میں رہ کر پردیسنوں کے ڈھنگ سیکھ گئی ہیں۔

لیکن اس کے دوسرے معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ اب لڑکیوں کو گھر میں بٹھائے رکھنا فضول ہے۔

آج کل کے لڑکے کھرے کھوٹے کو خوب پہچانتے ہیں۔احمد علی حکیم کی ماں نے وظیفوں کی کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

''دل بہلانے کو خالدہ ہو یا کوئی اور لونڈیا، مگر بیاہ کرتے وقت تو دلہن بیگم ہڈی ہی پرکھیں گی۔

وہ زمانے گئے خالہ جب ہڈی پرکھی جاتی تھی، چاندی کا پان دان کھول کے

ڈپٹن نے بھی بحث میں حصہ لیا۔

اب تو لڑکے پیسے کے دیوانے ہیں۔ نوکریاں ملتی نہیں اور تجارت کو پیسہ چاہیئے۔

ہاں بیوی سچ ہے۔۔آج کل دنیا پیسہ دیکھے ہے،، مجو کی دادی بھی کسی کام سے آئی تھی ،تو تمباکو کھانے کے بہانے وہ بھی بیبیوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگی۔

بیبیوں کی باتوں میں اسے دخل دینے کا حق نہ تھا، نہ استطاعت، لیکن جب سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہوں ،تو اونچ نیچ کا سوال دب جاتا ہے۔

مجیا سولہ برس کی سانڈ ہوگئی تھی، پر نصیبوں جلی کے بھاگوں اپنا گھر بھی نہ تھا۔ جہاں ہر وقت دانت نکوسے مجیا کے منہ کو آگ لگاتی رہتی۔ جس دن سے مجوری کرتے کرتے بیٹا چھت سے گر کر مرا۔ وہ مجیا کو دل سے لگائے تیرے میرے گھر نوکری کرتی پھرتی۔ اب چھ برس ہو گئے اطہر میاں کے ہاں روٹی پکاتے ہوئے۔

یہ قدرے محفوظ جگہ تھی، دلہن بٹیا کی خود سیانی لڑکیاں تھیں۔ میاں لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر ایک دن شکار کھیلنے گئے۔ مگر خود ہی شکار ہو کر کسی شیر کے منہ میں جا بسے۔ لڑکا تھا تو اسے گھر سے زیادہ علی گڑھ پسند آ گیا تھا۔ سال میں دو مہینے کی چھٹی ملتی تو گھر کی بجائے دوسرے شہروں کی سیر کو نکل جاتا۔

اور دلہن بٹیا خود اتنی نیک بخت تھی کہ چاہے ہنڈیا

بھوننے میں آدھی بوٹیاں اڑا لو۔ ڈھیروں پان چھالیہ نیفے میں سمیٹ کر پار کر دو۔ مگر کبھی شک نہ کیا۔ دیکھ لیجیو اللہ میں جنت میں موتیوں کا محل بنوائیں گے ان کے لئے۔

اصل میں خاندان رئیسوں کا تھا، خود بھی صدر اعلیٰ کی بیٹی تھیں۔ ذات کی کھری۔ اس گئی گزری حالت میں بھی وہی آن بان تھی۔ کھلا ہوا ہاتھ۔ پھر مزاج دیکھو تو اللہ میاں کی گائیک بھی نو بڑھوں کی طرح تین پانچ کیا نہ کبھی اپنی دولت کی بڑ

ہانکی۔

بس یہیں پر آ کر تو لوگ کہتے ہیں کہ نجیب الطرفینوں کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔ نادرہ فاطمہ کو دیکھو، کالج میں پڑھتیں مگر کبھی تسنیم اور ثروت کی طرح فیشن کی کٹھ پتلی نہ بنیں۔ اور نہ یوں ہوحق مچاتیں کہ بیبیاں ناکوں پر انگلیاں دھرتیں۔ لڑکا تو انگوٹھی کا نگینہ۔ اخباروں، رسالوں مین اس کے مضامین چھپتے، ریڈیو پر بولتا۔ اور پھر دو چار دن گھر آئے تو چھوٹے کمہار اور بیری والی نانی کا مزاج پوچھنا نہ بھولتا۔

گھر میں نوکروں کی فوجیں پال رکھی تھیں، دلہن بٹیا نے۔ اس پر بھی کسی کو شکایت نہ تھی۔ ڈپٹن کی ماماؤں کی طرح آج تک کسی نوکر نے کسی دوسرے گھر میں جا کر ان کی لڑکیوں کے عیب نہ کھولے۔ نہ انہیں گالیاں دیں۔ بڑی بی خود زمانے بھر کی لتری جھوٹی، مگر دلہن بٹیا کے نام پر جھولی پسارے دعائیں دینے بیٹھ جاتیں۔ کئی بار دلہن بیگم نے لوگوں سے کہہ سن کر مجیا کے پیغام بھی لگوائے، مگر وہ گل مچھے والا سپاہی بھی پانچ سو کا جہیز مانگتا تھا۔ آگ لگے حرامی صورت کو،

اور تو اور جب مجیا نے سنا تو اطہر میاں کے جوتون پر پالش کرتے کرتے اس سپاہی کو ہزاروں گالیاں دے ڈالیں۔ اری مردار چپ رہ یہ تیرے کہنے کی باتیں نہیں، دال بگھارے بڑی بی چیخیں۔

تو کیوں آیا تھا وہ بھاگڑ بلا..... ارے ہاں

وہ پولیس والا ہے گالیاں دے گی تو جیل بجھوادے گا تجھے، اطہر میاں نے اسے ڈرانا چاہا،

اے، خے، آ کے تو دیکھے مونچھوں میں لٹک جاؤں گی اسکی۔

سب کی ہنسی میں بڑی بی دلہن بٹیا کی طرف بے بسی سے دیکھتیں۔ انہوں نے مجیا کو اپنے طور پر سارے ڈھنگ سکھا ڈالے تھے۔ خود بیٹھ کر قران مجید اور بہشتی زیور پڑھایا، اردو کی دو چار کتابیں بھی پڑھا ڈالیں، جن بی سے کہہ سن کر سینا، پرونا بھی

سکھایا، مگر اسکی چمرگ کیسے بدل دیتیں۔

ہر بات کا جواب دینے کو تیار، شرم ولحاظ تو ذرا بھی نہ تھا۔ جانو دیدے کا پانی مر گیا۔ پھر دن بھر وہ اچھل کود ہوتی کہ نادرہ کے اچھے بھلے غرارے دو دن میں دھجیاں ہو کر لٹکنے لگتے۔ لیکن گھر میں کوئی آ جائے تو خاطر تواضع کرنے میں فاطمہ سے بھی آگے۔ اس کے سلیقے تمیز کو دیکھ کر لوگ کہتے کہ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ سونے پر سہاگہ نادرہ کے من کو وہ ایسی بھائی تھی کہ گھر میں کوئی مجیا کو ڈانٹے وہ پشتی لینے کو موجود۔ اے سچ مچ، وہ حرامی مجیا کے لائق نہ تھا، دلہن بیگم نے قالین بچھے ہوئے تخت پر اپنا بھاری بھرکم جسم پھیلاتے ہوئے کہا۔

اللہ جانے بڑی بی کیوں اس کی فکر میں مری جا رہی ہیں۔ نادرہ سے بھی تو چھوٹی ہے کم بخت، فاطمہ نے اطہر سے کارڈز کھیلتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر اطہر بہت خوش ہوا کہ چلو اس کے گھر میں بھی انسانی حقوق کا تحفظ ہو رہا ہے۔ کالج میں رہ کر ایم، اے، تو اس کی قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ سو آٹھ برس میں کر آیا۔ ویسے تو وہ بس نراخشک سا فلاسفر بن کر رہ گیا تھا۔ دن بھر یہ موٹی موٹی کتابیں آنکھوں سے لگائے بیٹھا ہے۔ جمہوریت، اور انسانیت، عورت کی سماجی قدریں اور انسانی تاریخ میں ان کا وجود، جیسے مضمون لکھتے لکھتے چونکتا، تو پھر ایک دم موڈ بدلا ہوا نظر آتا۔ فاطمہ کی سہلیوں کی نقلیں اتاری جا رہی تھیں۔ مرغی کی ٹوٹی ٹانگ پر ڈاکٹری کے تجربے ہو رہے ہیں۔ چھوٹی کوٹھی والے شرنارتھیوں میں بیٹھ کر ان کے لٹنے کی کہانیاں سن رہے ہیں۔ اور آگے بڑھے تو دلہن بیگم کے پاس آنے والی خواتین سے مذاق بھی فرما لیا جاتا۔ فرصت ہو تو کلو کے ساتھ چوسر کھیلنے میں بھی کوئی عار نہیں۔ یوں کہنے کو تو اب اگلے سال فاطمہ بھی بی، اے۔ کر لے گی۔ اور نادرہ کو ٹائیفائیڈ نہ ہو جاتا۔ تو وہ بھی سیکنڈ ایر میں آ جاتی۔ مگر اپنے کالج میں انہوں نے اطہر بھائی جیسے لڑکے چھوڑ پروفیسر بھی نہ دیکھے تھے۔ اتنے بے حس کہ چھوٹی خالہ کی صلاح پر وہ اپنی

سب ہی پسند دیدہ ہستیوں کو گھیر گھار کر گھر لائیں۔ انہوں نے گھنٹوں اطہر سے ہنسی مزاق کیا، اپنے پسند دیدہ رنگ اور ایکٹروں کے نام بتائے۔ لیکن یہاں ہاتھ رکھو تو وہی سرد خانہ، کوئی میک اپ کا اشتہار پڑھنے لگی، کوئی فلم کی ایکسٹرا گرل اور جلی ہوئی دیا سلائی۔ اور سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہیں لیکن راحت کی خالہ کب تک صبر کیے جاتیں۔ انہیں اطہر کے پاس ہو جانے کی بہت خوشی ہوئی۔ اور اس بہانے دلہن بیگم کے سب گھر والوں کی وہ شاندار دعوت کی کہ چکنائی چھٹانے کے لئے صابن منگوانا پڑا۔ بھائیوں اور دیوروں کی آس پر جینے والی خالہ اور کیا کر سکتی تھیں۔

اے اطہر میاں تمہیں کھانا تو کیا خاک پسند آیا ہوگا

سب اکیلی راحت نے پکایا تھا۔

خالہ میں تو ہوسٹل میں مکھیوں کا شوربہ اور سڑا ہوا گوشت کھاتے کھاتے اب اچھے برے کھانے کا مزہ ہی بھول گیا ہوں۔ فاطمہ سے پوچھیے یہ بڑا اعلیٰ ٹیسٹ رکھتی ہے۔

آسمان پر ایک کٹی ہوئی پتنگ کسی رنڈی کی طرح

اٹھلاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

بھاگتے بھاگتے بچوں کی سانسیں پھول گئیں۔ سب نے اپنے ہاتھوں میں کانٹوں والے بانس پکڑ لیے تھے۔

اور نگائیں پتنگ پر لگی تھیں۔ مگر کون جانے وہ کس کے ہاتھوں میں گرے گی۔

بہت دیر تک تسنیم کٹی ہوئی پتنگ کو دیکھتی رہی۔ پھر جب چھت پر لڑکوں نے شور مچانا شروع کیا تو جھنجھلا کے نیچے اترنے لگی۔ ان آوارہ لڑکوں کو منع کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ کم بختوں نے گلی سر پر اٹھا رکھی ہے۔ بڑے ادب کے ساتھ دلہن بیگم کو سلام کر کے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تو ڈپٹن نے انہیں سنایا، ذرا سا شور ہو تو تسنیم کے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ آج کل کی سب لڑکیاں ہی نازک مزاج ہیں۔ بہن

ہماری لڑکیاں خود ایسی نخروں پیٹی ہیں۔ دلہن بیگم ہنس کر بولیں۔ اے بہن اطہر میاں کا بیاہ کر چکو بھئی۔ انتظار سے بے زار ہو کر ڈپٹن نے خود ہی ذکر چھیڑا۔ کرلوں گی، وہ بے پروائی سے بولیں کوئی ڈھنگ کی لڑکی تو ملے۔

اے واہ شہر میں لڑکیوں کی بھی کوئی کمی ہے۔ ایک سے ایک سگھڑ، خوب صورت، یوں کہو تم بھی پاکستان کی طرف منہ کر رہی ہو،

اے توبہ کرو بہن، تمہارے گھر کی چھالیاں بہت اچھی ہیں۔ کس دکان سے منگوائی ہیں۔ وہ ایک اور پان منہ میں رکھ کر پوچھتیں۔

ارے میرے گھر کی تو ہر چیز بے مثال ہے تم آ کر تو دیکھو۔ ڈپٹن کہنا چاہتیں، پھر بنارسی غراروں کا ذکر چلتا۔ پاکستان میں پانوں کی تباہی کا۔ اور ان شادیوں کا بھی جن میں جہیز کے نام پر ایک کوڑی بھی نہیں دی گئی تھی،

میں تو اپنی تسنیم کا بیاہ ویسا کروں گی جیسا باپ دادے کے وقتوں سے ہوتا آیا ہے۔ اللہ قسم تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ دلہن بیگم نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

مگر ہمارے بچے تو بیاہ براتوں میں دھوم دھڑکے کے قائل نہیں ہیں۔ اطہر میاں کہتے ہیں میں اپنی بہنوں کو جہیز نہ دوں نہ خود لوں۔ پھر وہ اپنے کہے پر پچھتانے لگیں۔ بہن تمہارے منہ تک بات رہے۔ ویسے میں اپنی لڑکیوں کو تو اپنی حیثیت کا دوں گی۔

دوسرے دن یہ بات سارے شہر میں اڑ گئی کہ دلہن بیگم صرف الحمد شریف پر اپنی لڑکیاں اٹھائیں گی۔ اور یہ ساری جائیداد ان کی بہو کے لئے ہوگی۔

..... پھر تو..... اچھی بی کی ماں تو اب کچھ مایوس ہونے لگیں تھیں۔ آس پاس اور بھی نشانے باندھے چادر اوڑھے رات کو ایک گھر سے دوسرے گھر جاتے وقت محلے کے کسی جوان لڑکے کو دیکھ لیتیں۔ تو نواب بیگم کے گھر دوڑی جاتیں۔ اب انہیں

اچھی بی کے لئے کنوارے بر کی بھی چاہ نہ رہی تھی۔ کھاتا پیتا گھر ہو تو مرد ساٹھا بھی پاٹھا کہلاتا ہے۔ اس امید کے سہارے انہوں نے کتنے ہی گھروں کی نواب بیگم سے مخبریاں کیں۔ جہاں بیویاں یا تو لب دم تھیں۔ یا اکثر بیمار رہتی تھیں۔

میں نے سنا ہے کہ تمہاری بھاوج کو تپ دق ہوگئی ہے۔ ایک دن چھت پر چڑھ کر انہوں نے اپنی پڑوسن سے پوچھا۔ اے تمہارے بھیا اچھے خاصے جوان ہیں کیا تنخواہ ہے ان کی؟ ،،،،، لیکن پڑوسن کی بھاوج سے وہ قطعی مایوس تھیں۔ جو عورت پانچ برس سے تپ دق میں جیئے جارہی ہے۔ وہ پانچ برس اور جی سکتی ہے۔

وہی لوگ خوش قسمت ہیں جو اپنی لڑکیوں کو لے کر پاکستان چلے گئے۔ احمد علی حکیم کی بیوی سرد آہ بھر کر کہتیں۔ ایک زمانہ تھا، کہ نادرہ اور فاطمہ زمانہ بھر کی پھوہڑ کہلاتیں۔ کبھی کسی نئی وضع کا شرٹ کٹوانے راحت نے بھیج دیا۔ تو راحت کی خالہ سارے خاندان میں وہ کپڑا نچایا کرتیں۔

ارے بھئی پیسہ کمالوں، مگر سلیقہ اور ہنرمندی تھوڑی کمائی جاسکتی ہے۔

مگر اب جو خوبیاں ان بہنوں میں تھیں۔ وہ کسی میں نہ ہوں گی۔

مائیں زبردستی انہیں اپنے گھر بلا بھیجتیں۔ لڑکیاں ہیں کہ ان کی ناز برداری میں بچھی جارہی ہیں۔

اطہر بھائی سے فوٹو کھنچوانے کا سب ہی کو شوق ہوا تھا۔ کتنی بار انگریزی مضامین کی کاپیاں اصلاح کے لئے خالدہ نے بھجوائیں۔ کرلوج کی کسی نظم کے متعلق تسنیم نے لکھ کر اطہر سے کچھ پوچھا، اور اس کا تفصیلی جواب گویا پتن گگی ڈور ہاتھ آگئی۔

آج کل اطہر بھائی ہم سے چھپ چھپ کر تسنیم کو خط لکھا کرتے ہیں۔ تم سے کس نے کہا۔ اطہر نے کتاب سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

تسنیم نے کالج میں سب ہی لڑکیوں سے کہا ہے۔

اچھا ہوا، ابھی میں دیباچہ ہی پڑھ رہا تھا۔ اس نے کتاب بند کر کے رکھ دی اور

خود بھی چائے کی میز پر آ گیا۔ سوئے سارا سنسار، جاگے مضمون نگار

لیکن اطہر آج کسی مقالے کی ریسرچ نہیں کر رہا تھا۔ اسے تعجب تھا کہ وہ مسلسل دو ماہ سے بریلی میں کیوں پڑا ہے۔ چھوٹا سا شہر جہاں دو چار دوست بھی تھے۔ تو اس زمانے کے جب سب ہم خیال تھے۔

لیکن اب تو بقول دلہن بیگم انہیں نہ گھر پسند تھا۔ نہ گھر والے۔ انہیں تو کسی دن ولایت بھیجنا چاہیئے۔

اطہر اسی ولایت کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اگر دو چار مہینے اور فاطمہ اور نادرہ کے ساتھ تفریح مین گزار دیے تو دلہن بیگم ضرور کوئی نہ کوئی ڈھول اس کے گلے میں باندھ دیں گی۔ اس ہجوم میں اسے کبھی وہ لڑکی نظر نہ آئی جسے بیوی بنایا جا سکے۔ ہر طرف بکاؤ مال کی طرح شو روم میں سجی لڑکیاں تھیں۔

جتنے پیسے جیب میں ہوں ویسی ہی خرید لو۔ پھر چاہو تو اس خریدی ہوئی گڑیا کو ہمیشہ کے لئے الماری میں بند کر کے ڈال دو۔ یا ساتھ ساتھ لیے پھرو۔ لیکن ہاتھ چھوڑتے ہی قدموں میں گر جائیں گی

تو پھر طے ہے کہ وہ علی گڑھ جا کر پی، ایچ، ڈی کی تیاری کرے گا۔ اور ساتھ ہی ملازمت کی کوشش۔

بڑے اطمینان سے اس نے بیڈ لیمپ گل کر کے لحاف منہ تک کھینچ لیا۔ لیکن بند ہوتی ہوئی پلکوں کے اندر پہلے ہلکی سی اور پھر واضع مجیا کا ہیولی دیکھ کر چونک پڑا۔

،مجیا اتنی رات گئے میرے کمرے میں کیوں آئی ہے۔ وہ لحاف پھینک کر اٹھ بیٹھا۔

اطہر میاں،،، مجیا نے یوں کہا،، جیسے تصور میں کوئی گنگنا رہا ہو۔

اطہر، میاں آپ کو تکلیف تو ہوگی، ذرا پڑھ دیجیئے اس بوتل پر ٹنچر ہی لکھا ہے نا

بوتل چھوتے وقت مجیا کا ہاتھ کتنا سرد لگا جیسے برف کو چھو لیا ہو۔

وہ خوف سے کانپ رہی تھی، آخر تسنیم والی عمر ٹھہری)

گھر آئی دولت کو ٹھکرانا حماقت ہے۔ غالباً دل کہہ رہا تھا۔

یہ میری پناہ میں ہے..... اس کے اندر والا جمہوریت پسند مضمون نگار بھی نہ جانے کیوں جاگ اٹھا۔

جاجا..... آدھی رات کو سوتے سے اٹھاتی پھر رہی ہے۔ یہ اس کا اپنا قطعی ارادہ نہ تھا۔

مجیا کے جانے کے بعد اس کی سسکیاں کمرے میں گونجتی رہیں۔ آدھی رات کو وہ ٹنکچر آیوڈین کا کیا کر رہی ہے۔؟،،، اس نے پریشان ہو کر سوچا، اور جلدی سے لحاف پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا، مجیا دالان کے کونے میں کھڑی دانتوں سے شیشی کا کارک کھول رہی تھی۔

شیشی ہاتھ سے چھین کر اس نے پوری قوت سے اسے تھپڑ مارا۔

''سالی بالشت بھر کی لونڈیا چلی ہے لیلیٰ بننے۔

اگر نادرہ کو بھی ایسی حالت میں دیکھ لیتا تو اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ دلہن بیگم ٹھیک کہتی ہے کہ کمینے نہیں بدل سکتے۔ اس گھر میں رہنے کے باوجود مجیا اپنا کریکٹر نہ سنبھال سکی تھی، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خود بھی بال نوچ ڈالے۔

سارا گھران کے گرد اکٹھا ہو چکا تھا۔

کون ہوتے ہیں آپ بیچ میں بولنے والے۔ ہم زہر پیں یا دھتورہ کھائیں، کسی کی بلا سے۔ اللہ میاں کی قسم میں مر جاؤں گی مگر اس شرابی میراثی سے شادی نہیں کروں گی۔

بڑی دیر تک وہ بڑی بی کے ڈنڈے سہہ کر چیختی رہی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اس لئے نہیں کہ وہ گناہوں سے پاک تھی۔ بلکہ اسے اپنے گھر میں دنیا بدلنے کا احساس ہوا تھا۔ چاہے دلہن بیگم ہر سال پرانی کوٹھی کو کتنا ہی لیپیں پوتے جائیں۔ لیکن شگاف

پڑ رہے ہیں۔ اب بھی بازار میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی قیمت کسی کی جیب میں نہیں ہے۔

صبح باقاعدہ پنچایت بیٹھی، اطہر خود جج تھا۔

بڑی بی مجیا کی شادی ایک رنڈوے میراثی سے کر رہی تھی۔ جو مجیا کے بیان کے مطابق نرا جاہل تھا۔

ہر وقت شراب پی کر گالیاں بکتا تھا۔

لوگو اس چڑیل سے پوچھو، اس کلموہی کے لئے شہزادہ کہاں سے لاؤں،،،،، بڑی بی فریاد کر رہی تھی۔

اے واہ کلموہی تو زرا بھی نہیں۔ نادرہ کو ہمیشہ اس پر ترس آتا۔

بھائی جان میں نے دیکھا ہے اس میراثی کو بنا بنایا غنڈا لگتا ہے۔ یہ موٹا روئی کا تھیلا۔ مجیا بے چاری اتنی نازک سی۔

دن بھر کی تو تو میں، میں کے بعد طے ہوا کہ میراثی کا پیغام واپس اور مجیا کے لئے موزوں دولہا ڈھونڈنا اطہر کا فرض ہے۔ آنے جانے والے مذاق اڑانے لگے۔

یہ نواب بیگم کا حق آپ نے کیوں چھین لیا بھائی جان؟

حجاموں۔ ڈوموں کی روزی مت چھینیئے، بھائی جان

سنا ہے اطہر میاں تم لڑکیوں کا بیاہ کراتے پھر رہے ہو

بھیا ہماری لڑکیوں کا بھی خیال رکھنا۔ ڈپٹنا سے روک کر مذاق کا بہانہ ڈھونڈنے لگیں۔

اچھی بات ہے خالہ وہ چومکھے حملوں کا جواب دیئے جاتا۔ میرے رجسٹر میں لڑکی کا ناک نقشہ، عادات واطوار سب لکھوا دیجیئے۔

ہمارے ہاں تو لڑکی کا جہیز دیکھا جاتا ہے، اس کی ذات پرکھی جاتی ہے۔ ناک نقشے نہیں دکھائے جاتے

یہ نئے زمانے کا حجام ہے بہن، دلہن بیگم بھی ان کے ساتھ قہقہے لگاتیں۔

تو پھر کچھ دن ٹھہریں، ابھی خرید وفروخت کا شعبہ نہیں ملا۔ وہ گھبرا کر جواب دیتا۔

صبح وہ ٹہلنے کے بعد بیری والی نانی کے ہاں جاتا تو راستے میں اچھی بی کی ماں روک لیتیں۔

اے میاں مجیا حرام خور کے لئے دولہا ڈھونڈ رہے ہو تو اپنے لئے دلہن بھی ڈھونڈو۔ ڈھونڈ تو رہا ہوں چچی۔ وہ سر کھجا کر بے بسی سے جواب دیتا۔

ہم سے کہو یوں چاندسی بہولائیں، کہ عمر بھر خالہ کا احسان نہ بھولیں۔

ع، زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں

وہ گنگناتا ہوا گھر میں داخل ہوتا، تو دلہن بیگم کے گلے میں باہیں ڈال کر دھمکی دیتا۔ دلہن بیگم اگر آپ نے میری شادی بریلی کی کسی لڑکی سے کی تو میں بھی مجیا کی طرح زہر کھالوں گا۔ پھر وہ جھاڑو دیتی مجیا سے بولا: اب کی مرتبہ ہم دونوں مل بانٹ کر کھائیں گے۔ مجیا کھسیا کر کسی پردے کے پیچھے چھپ جاتی۔

مذاق میں ہی سہی لیکن دلہن بیگم جانتی تھی۔ یہ اطہر کا فیصلہ ہے۔ یوں دنیا انہیں ایک سعادت مند بیٹے کی ماں سمجھتی تھی۔ لیکن کوئی ان کے دل سے پوچھے کہ اتنی بڑی جائیداد ہوتے ہوئے۔ وہ کیوں اپنے بچے کو کلیجے سے دور رکھے ہے۔ لڑکیوں کو خاندان کی روایت کے خلاف پڑھایا۔ اور پچیس برس تک اطہر کے سہرے کا ارمان لیئے بیٹھی رہیں۔ ایسی ہٹ والے تو اللہ بخشے ان کے میاں بھی نہ تھے۔ جو بیگم نے سوچا منوالیا۔ لیکن اطہر کی بات تو پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ یوں دنیا پر اس کا دل دکھتا۔ کبھی گھر میں کوئی نوکر یا ماما روئے تو سب سے پہلے وہی آنسو پونچھنے کو دوڑے گا۔

خیراتن کا لڑکا بچانے کے لئے جلتی ہوئی کوٹھری میں گھس گیا۔ مگر ماں کا جی کبھی نہ رکھا۔ ہزار بار براتوں میں سہرے بندھے دولہے کو دیکھ کر ان کا جی بگڑ چکا تھا۔

اکیلے میں فاطمہ کو سمجھاتیں۔

آپ کو اتنا ارمان ہے،تو جہاں اطہر بھائی کہیں وہیں بیاہ دیجیئے۔

مت کٹ گئی ہے تیری۔ وہ آنسو پونچھ کر کہتیں، میں قیامت کے دن تیرے باپ دادا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔؟

لے دے کہ ایک ہی امید تھی۔ کہ کوئی لڑکی ایسا جال پھینکے، جو یہ اطہر میاں ہاتھ جوڑے دلہن بیگم کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے نظر آئیں۔ اس بہانے دلہن بیگم نے آنا جانا بڑھا رکھا تھا۔

تو کیسا دولہا پسند کرے گی ری.....؟ نادری کی سہیلیاں بجیا کو چھیڑتیں۔

عین میں تو چڑیلوں کی سی شکل ہے۔ راحت ناک سکیڑ کر کہتی، اطہر بھائی، کیسے اس کے لئے اچھا دولہا ڈھونڈیں گے۔

آج کل تو اچھی اچھی لڑکیوں کو شوہر نہیں ملتے۔

اچھی بی ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں۔

ہمارے آفس میں صورت کی نہیں جرات کی داد دی جاتی ہے۔ اطہر کھیل چھوڑ کر ان سے مخاطب ہوا

تم بھی ایسی پیگا کرو۔ ہیرا دلہا لاؤں گا ہیرا۔ پہلے تو سب کو ہنسی آ گئی۔ پھر.....

بہت منہ پھٹ ہو گئے ہیں اطہر بھائی۔

ہمیں بھی کیا مجو سمجھ لیا ہے۔

ادھر نواب بیگم تھیں کہ جو ماں بھی ان کے پاس گھبرا کے جاتیں، یوں خوش کر دیتیں جیسے اطہر کی بارات ان ہی کے دروازے پر لا رہی ہیں۔ بس اب بیاہ کی تیاری شروع کر دو ڈپٹن۔ وہ جی خوش کرنے کی باتیں شروع کر دیتیں۔

مگر یاد رہے صدر اعلیٰ کا خاندان ہے۔ برابری کا لینا دینا پڑے گا۔

کیسی باتیں کرتی ہو نواب بیگم۔ وہ اپنے منہ سے نہ کہیں تو کیا مجھے خیال نہیں

ہے۔؟ ڈپٹن اونچی ہوکر جواب دیتیں۔

ڈپٹن کے جاتے ہیملی چادر اوڑھے سلیم شاہی جوتیاں گھسیٹتی اچھی بی کی ماں آ جاتیں،تو نواب بیگم نے انہیں بھی کبھی مایوس نہیں کیا۔اب صرف پلکوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔تم اچھی بی کے لئے جہیز کی فکرمت کرو۔وہ لوگ صرف لڑکی چاہتے ہیں۔

اور بڑی بی کانٹوں بھری جھاڑی بن کر اطہر سے لپٹ گئی تھیں۔کہ دامن چھڑائے نہ بنتی۔نہ جانے اطہر نے کتنے حجاموں سے دوستی گانٹھی۔آئے دن ڈرائینگ میں بیٹھے لوگوں کی صورت مجیا کو جھنکائی جاتی۔بڑی بی اس روز روز کے ان ٹرویو سے پریشان ہوگئیں۔اے میاں تم جسے اچھا سمجھو پکڑ لاؤ۔وہ اطہر کی خوشامد کرتیں۔ایک دن مجیا صحن میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی، کہ اطہر بھی وہیں اکڑوں بیٹھ گیا۔ذرا بھائی اپنے دولہا کی خوبیاں تو سمجھا دو، تاکہ ڈھونڈنے میں آسانی رہے۔

نادرہ دوڑتی ہوئی آئی۔

یہ دیکھیے بھائی جان مجیا کا دولہا۔اس نے کاپی آگے بڑھائی۔اس میں پنسل سے اطہر کا کارٹون بنا ہوا تھا۔مجیا نے کھسیا کر وہ ورق پھاڑ کر پھینک دیا۔

انہوں نے..... نادرہ کے پیچھے ایک اور دبلی سی شرمائی ہوئی لڑکی کھڑی تھی۔ بہت عام واہیات سی شکل وصورت،کالی چھینٹ کی شرٹ، نیلا دوپٹا اور سفید شلوار پہنے۔

یہ ہماری نئی دوست نوید ہیں۔بہت اچھی آرٹسٹ، انٹر کا امتحان دے کر آئی ہیں۔

کئی دن کے بعد ایک دن پھر وہی لڑکی نظر آئی۔سر پر دوپٹا اوڑھے۔کچھ چپ چپ،سی اس کی سنجیدگی بڑی گھمبیر سی لگی، جیسے سطح کے نیچے ہزاروں طوفان دبے ہوں، جیسے کسی نے جلتے چراغ کو پردے میں چھپا دیا ہو،تعجب ہے نادرہ جیسی شوخ

لڑکی اس کی دوست کیسے بن گئی،

اطہر کے آتے ہی وہ اٹھ کر جانے لگی، اگر میرا آنا پسند نہیں تو واپس جا سکتا ہوں۔ وہ کرسی پر بیٹھنے سے رک گیا۔ اوہ، ایسا خیال نہ کیجئے، مجھے پان چبے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ وہ جلدی سے باہر چلی گئی۔ یہ بھی ایک شان ہوتی ہے۔ خدا معلوم ان لڑکیوں کو اپنے متعلق کیا کیا خوش فہمی ہے۔

اس لڑکی کے رویے سے وہ جل گیا، یہاں تو اچھے چاھوں کو منہ نہیں لگاتے پھر یہ لڑکی کس گنتی میں ہیں۔

اللہ بھائی جان نوید بے چاری ایسی نہیں ہے۔ نادرہ اسے رخصت کر کے واپس کمرے میں آئی، بے چاری

بہت غریب ہے، اسے ٹیوشن پڑھانے جانا ہے۔ لڑکیوں کو ٹیوشن کی کیا ضرورت ہے۔ شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔ پھر نادرہ نے بتایا کہ نوید کی شادی ت وبرسوں پہلے ہو جاتی لیکن اس نے شادی سے انکار کر دیا۔ جب تک وہ پڑھنے کے بعد ملازمت نہیں کرے گی، شادی بھی نہیں کرے گی۔

چائے کی پیالی منہ سے لگاتے ہوئے اطہر نے سوچا، اس کا نام بھی آج سے رجسٹر میں لکھ لیا گیا۔

چھ مہینے گزر گئے۔

نواب بیگم نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ دلہن بیگم کے ہاں بیاہ کی تیاریاں مکمل ہیں۔ ڈپٹن اور راحت کی خالہ کے اطہر اور دلہن بیگم سے بڑھے ہوئے خلوص سے یقین ہو گیا کہ پلڑا، ان ہی کی طرف جھک رہا ہے۔ سرف دو چار جھٹکوں کی دیر ہے۔ ادھ ربڑی بی بجیا کو کوس کوس کر کھائے جا رہی تھی۔ اور دلہن بیگم کی بڑی کوٹھی میں ایک بڑا ہنگامہ آ کر تھم گیا تھا۔

دلہن بیگم نے سب ہی ہتھیار آزما ڈالے۔ نادرہ فاطمہ اس وقت کو پیٹتیں۔

جب نوید سے دوستی بڑھی تھی۔ ان کے وہم و گمان مین بھی نہ تھا کہ ایسی ایسی پریوں کے مقابلے میں یہ دبلی سانولی سی نوید بازی جیت لے گی۔

اطہر کی ت و پرانی عادت تھی کہ منٹوں میں فیصلہ کر ڈالتا اور پھر چٹان کی طرح اس پر جم جاتا۔ بی۔ اے کے بعد اچھی خاصی نوکری کر رہا تھا، کہ ایک دن کھانا کھاتے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں آج علی گڑھ جا رہا ہوں۔ ایم، اے، کرنے۔ کوئی سمجھائے تو اس کان سے سنا، اور اس کان سے اڑا دیا۔

سب ہی اس کی عادت سے واقف تھے۔ ایک نہ ایک دن تو بھانڈا پھوٹنا ہی تھا۔ دلہن بیگم نے اعلان کر دیا کہ چند ماہ بعد اطہر کا بیاہ ہے۔ لڑکی متعلق انہون نے اطہر کو پوری آزادی دے رکھی ہے۔

وہ پی، ایچ، ڈی کرنے امریکہ جا رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ سات سمندر پار بھیجنے سے پہلے اس کے سہرا باندھ دوں۔ مگر اطہر کی پسند نہ مانی جائے گی بہن۔ راحت کی خالہ پریشان ہوگئیں۔ راحت چڑیل تو ہمیشہ کی منہ پھٹ تھی۔ جب دیکھو بیٹھی اطہر سے بحثے جا رہی ہے۔ کبھی گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر دلہن بیگم کا مزاج نہ پوچھا، اور اچھی بی کے چہرے پر مہاسوں کا جال بچھا رکھا ہے۔ ثروت سے کبھی اطہر کی نہ بنی۔ جب دیکھو اس کے میک اپ پر آئے دن ریمارکس ہوتے۔

صرف ایک ڈپٹن تھیں جو مطمئن بیٹھی تھیں۔ انہوں نے کوئی خواب بھی دیکھا تھا۔ ایک بزرگ انہیں بشارت دے گئے ہیں۔ اس لئے تو انہوں نے اطہر کی شیروانی کا ناپ تک درزی کو دے رکھا تھا۔ پورے گھر میں قلعی کروا رہی تھیں۔ اُدھر اچھی کی ماں کا یہ حال تھا کہ مارے فکر کے رات بھر نیند ہی نہیں آئی۔ بشارت دینے والے بزرگ کیسے آئے؟ یوں زیارتوں کے چلے، نفلیں اور روزے ان کے بس میں تھے۔ سو کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آئے دن کبھی انڈوں کا حلوہ اطہر کے لئے بھیج رہی ہیں،

کبھی دال بھری روٹی، اور شاہی ٹکڑے بھیج رہی ہیں۔

اتنا پیسہ واقعی ہی نہ تھا کہ ہر مہینے خالدہ کی طرح اچھی بی کی سال گرہ کرتیں۔ اور دلہن بیگم کے سارے گھر کی دعوت ہوتی، اطہر جدھر سے نکلتا۔ چلمنوں کی اوٹ میں چھپے دل دھڑکنے لگتے۔

ڈپٹی صاحب، احمد علی، حکیم اور واحد حسینز بر دستی اطہر کو اپنی بیٹھکوں میں پکڑ لاتے۔

بھئی ہمارا جی نہیں بھرتا کہ اطہر میاں تمہیں سات سمندر پار بھیج دیں۔ تمہیں اپنے مستقبل کی کیا فکر میاں، یو پی کا فوڈ منسٹر اپنا یار ہے۔ یوں چٹکی بجاتے ہی تمہیں گزیٹڈ پوسٹ دلا دوں گا۔ ڈپٹی صاحب اسے تسلی و تشفی دیتے۔

اور اطہر میاں تھے کہ اپنی محبت میں جت کر مجیا کے متعلق سب کچھ بھول گئے تھے۔ یا تو دن بھر کتاب آنکھوں سے لگی رہتی یا باغ میں جا کر گنگنا رہے ہیں۔ آئینے کے سامنے کھڑے کنگھی کیے جا رہے ہیں۔ دن بھر نادرہ فاطمہ کی سہلیوں میں بیٹھے فلمی گیت سن رہے ہیں۔ جو بات کرو تو دماغ غائب۔

مجیا تک چھیڑتی۔ سارے خاندان میں بات پھیل رہی تھی۔ سب یوں مستقبل کے منتظر تھے جیسی سلامی کے وقت سپاہی اپنی پوزیشن کو درست کرتے ہیں۔

راحت کی خالہ نے جلدی جلدی بیٹے کو باہر سے بلا بھیجا کہ بھائی کی بہ سے اڑنگا نہ پڑ جائے۔

لڑکا تو میرا دیکھا بھالا ہے۔ مگر صرف اس لئے آگے پیچھے ہوئی ہوں بہن کہ نوکر نہیں ہے۔

کیا تسنیم کا پیغام آ گیا۔ اچھی بی کی ماں ہڑبڑا کر پوچھتیں۔

آتے کتنی دیر لگتی ہے۔ دلہن بیگم پچاسویں دفعہ اپنی زبان سے جتا چکی ہیں۔ ڈپٹن اطمینان سے جواب دیتیں۔ پرسوں دلہن بیگم نے مجھے بلا بھیجا، باتوں باتوں

مین اچھی بی کا ذکر آیا۔تو بولیں مجھے ہمیشہ سے اس کا خیال ہے۔دیکھو تمہاری لڑکی کا نصیب کیسے کھلتا ہے۔مگر سنا ہے اطہر تو راحت پر لٹو ہے۔دن رات بیٹھا اس کے ساتھ چوسر کھیلتا رہتا ہے۔

اچھی بی کی ماں رائٹر نامہ نگار بنی اطہر کی ہر ہر جنبش کی اطلاع پہنچایا کرتیں۔

''اور بڑی بی تو قسمیں کھا کر کہتی ہیں کہ اطہر اس پروین نوید سے بیاہ کرے گا۔'' کوئی اور اندیشہ ظاہر کرتا۔

''اونہہ۔۔۔۔بڑی بی تری جھوٹی۔۔اب تو پوتی کا بر ڈھونڈتے اور بھی سٹھیا گئی ہیں۔ کبھی آتے جاتے بڑی بی اطہر کا راستہ روک لیتیں تو ہوں ہاں کر کے ٹال جاتا۔آج کل گھر میں کیا ہو رہا ہے اسے کچھ خبر ہی نہ تھی، صرف شاعری کا موڈ سوار تھا۔آدھی رات کو جب دنیا سو جاتی تو اس کا دماغ جاگ پڑتا۔ نہ جانے کہاں شعروں پر شعر لڑھکتے چلے آتے اور وہ باغ کی چاندنی میں جا بیٹھتا تہجد کے وقت دلہن بیگم دیکھ لیتیں تو درود پڑتا شروع کر دیتیں۔'' اس موئی چڑیل نے کوئی جادو کر دیا ہے۔''

آج بھی اس پر بالکل سرسالی کیفت تھی۔اکیلا فوارے کے حوض پر بیٹھا گلاب کی خوشبو سونگھ رہا تھا۔۔

آج اچھی بی کے ہاں خدائی رات تھی۔عورتوں کی چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔لگے ہاتھوں لڑکیاں اچھی بی کے سہاگ گانے لگیں۔

''لڑکیوں سروں پر پلو ڈال کر بیٹھو۔'' نواب بیگم چیخ رہی تھیں۔

''ایسے وقت بزرگ نیچے اتر کر رشتے ملاتے ہیں۔'' ایک منٹ کو گیت رک گیا۔شاید ڈھول بجانے والی لڑکیاں سہم گئی۔ پھر لے تیز ہونے لگی۔

میں جھلر ملر بھاگ آئی سنو جان میری
تیری بہنوں کے کھیلنے کی گڑیاں

میں جھونک آئی سنو جان میری
میں جھلر ملر بھاگ آئی سنو جان میری

جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔وہ گھبرا رہا تھا،نوید اسکے معیار پر پورا اتری تھی۔ عام لڑکیوں کے بر خلاف خود دار اور اپنی ہمت پر جینے والی۔مگر نہ جانے کیوں وہ چاہتا تھا کہ نوید بھی یوں ہی جھلر ملر بھاگ کر آ سکے، کہ ہر چیز تہہ و بالا ہو جائے۔وہ زندہ لڑکیوں کی طرح قہقہہ لگانا بھی سیکھ جائے۔

اپنے آس پاس اس نے کسی بزرگ کا سایہ ڈھونڈا۔

تیرے بھائی کے کھیلنے کی گیندیں
میں کنویں میں پھینک آئی سنو میری جان
میں جھلر ملر بھاگ آئی سنو میری جان

اس بار گیت میں نواب بیگم کی کرخت آواز بھی شامل ہو گئی۔ درمیان میں قہقہوں کی آتش بازی بھی چھوڑی جا رہی تھی۔ اطہر کے سامنے ان لڑکیوں کے ہیولے ناچنے لگے۔اب تک وہ نوید کو کتنے ہی زاویوں سے ایک شعر میں ڈھال چکا تھا۔مگر وہ پھسل کر الفاظ جامے سے باہر آ جاتی۔پھر لڑکیوں کا یہ شور ڈھنگ سے کچھ سوچنے بھی دے۔

رفتہ رفتہ وہ مدہم چاندنی میں پھر ابھری، لمبے درختوں کی پرچھائیں کے سہارے آگے بڑھی۔اور اطہر کے مخالف سمت کٹے ہوئے انار کے سہارے دیوار پر چڑھ گئی۔ایک منٹ تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔پھر اس کی لٹکتی ہوئی ٹانگ پکڑ لی۔

مجھے چھوڑ دو میاں میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔اللہ کے واسطے، رسولؐ کے واسطے۔

آہستہ سے اس کی کمر پکڑ کر اطہر نے نیچے اتارا۔۔مجیا خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

کیوں ری باہر کون ہے تیرا سچ سچ بتا۔۔۔۔؟ مجیا کے نرم نرم گالوں پر تھپڑ مارنے میں کافی لطف آیا۔

کوئی نہیں اطہر میاں کوئی نہیں اللہ قران کی قسم کوئی نہیں۔آپ خود دیکھ لیں۔وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔میں تو جدھر سینگ سمائے بھاگ جاؤں گی مگر ان لچے لفنگوں سے بیاہ نہیں کروں گی۔وہ زور زور سے رونے لگی۔اچھا تو ادھر آ،،،،اس نے مجیا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس فوارے پر بٹھایا،

مجھے ٹھیک ٹھیک بتا تو کیسا میاں چاہتی ہے۔

راج کپور کی صورت یا اشوک کمار کی؟ جلدی بتا اب دیر نہ کر۔

وہ خود پریشان تھا مگر مجیا روئے جا رہی تھی۔

اب بتاتی ہے نہیں سب کو اٹھاؤں،،؟۔۔آج چاندنی میں روتے ہوئے مجیا بڑی نہ لگ رہی تھی۔آج پھر اس دن والی حماقت نہیں دہرانا چاہیئے۔دل نے پھر صلاح دی۔

مجھے صورت لے کر کیا چاٹنا ہے؟ وہ سسکیاں لے کر بولی۔مگر زندگی بھر نبھانے کا وعدہ تو کر سکے۔

یہ گارنٹی کون دے سکے گا۔اطہر نے ہنس کر پوچھا۔اتنی ہمت والے مرد ابھی پیدا نہیں ہوئے۔تو پھر میرا ہاتھ چھوڑ دیئے،میں کہیں جا کر ڈوب مروں گی۔

وہ زبردستی ہاتھ چھڑا کر کٹے انار کی طرف بڑھی۔

اطہر پیچھے ہٹ گیا،مجیا گالیاں بھی دے سکتی ہے۔گلاب کی ایک پتی مسلتے ہوئے اس نے سوچا۔

اچھا تو پھر ٹھہر میں تجھے گارنٹی دیتا ہوں۔اسے اپنے اردگرد وہی بزرگ نظر آئے،جو آج کی رات نیچے اتر کر دلوں میں گرہیں دیتے پھر رہے تھے۔

اس نے کوٹ کاندھے پر ڈالا اور مجیا کے ساتھ گیٹ سے باہر نکلتے وقت نیا شعر

موزوں کرنے لگا۔

تیرے باپ کی اونچی حویلی میں
میں کیسی آگ لگا آئی سنو میری جان

اچھی بی کے آنگن میں لڑکیوں کے ساتھ چیختے چیختے نواب بیگم اب جوش میں آ چکی تھیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

تعویذ

افسانہ نگار : الطاف فاطمہ

چور رستے سے گھوم کر وہ کارخانے والی گلی میں داخل ہوئی، تو زبیدہ نے نقاب ڈالی۔ اور اس کی میل بھری بھوسلی جالیوں کے پار نظریں دوڑاتی دیوار سے لگی لگی چلنے لگی۔ جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچی تو اس کے قدم ٹھٹھک گئے، تقریباً عین راستے میں ملیشیا کی شلواروں قمیضوں والے چار آدمی حلقہ بنائے بیٹھے تھے، خاموش سر جھکائے، ان میں علی شیر بھی بیٹھا تھا۔ اس کا سر تو سب سے زیادہ ہی جھکا ہوا تھا۔ باقی کے تین میں سے ایک کی آنکھ اتنی دبی ہوئی تھی کہ کانا معلوم ہوتا تھا۔ وہ تنکے سے زمین پر گول چکر اور تکونی شکلیں بنا رہا تھا۔ دوسرے بھاری جسم والے آدمی کی مونچھیں بڑی اور لٹکی ہوئی تھیں۔ اس کے کندھے پر زرد میلا سا چارخانے کا کورا رومال تھا۔ وہ سخت برہم اور روٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ تیسرا لڑکا چوہے جیسے پتلے منہ اور تیز آنکھوں والا گم سم بیٹھا تھا۔

اس کی چپلوں کی کھس کھساہٹ پر علی شیر نے اپنی بڑی بڑی گھنی پلکوں والی سنہری آنکھیں اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا، تو نقاب کی میل زدہ جالیوں میں سے بھی ان کا بھنگا پن زبیدہ کو نظر آ گیا۔ اس کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے مخمل کالے کر بھگو سا دیا ہو، ساری گلی سونی تھی، زرد زرد چرمرائے پتوں۔ مالٹوں کے چھلکوں اور کاغذوں نے اس کو اور بھی ویران بنا رکھا تھا۔ فضا خاموش اور پراسراری ہو رہی تھی۔ زبیدہ جلدی جلدی قدم اٹھا کر گھر کی طرف بڑھی ت و برقعے کی آواز سپڑ سپڑ کرتی نکل کر ارد گرد پھیل گئی۔ علی شیر نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس کا چہرہ غمگین اور اترا ہوا تھا۔

وہ گھر میں داخل ہوئی، تو خالہ جان بان کی چارپائی دالان کے کونے میں ترچھی ڈالے اونگھ رہی تھی۔

اونہہ! زبیدہ کا جی جل گیا، کبھی جو سیدھی چارپائی ڈالیں۔ پر بولے کون یہ سگی خالہ کو تو اللہ میاں ساس نہ بنایا کرتے تو اچھا ہی ہوتا۔۔۔۔ پر اب تو اگلا کچھ بول بھی نہیں سکتا۔

جل کر اس نے بھی برقعہ دوسری چارپائی ہی پر ڈال دیا۔ ورنہ اسے اندر کھونٹی پر بھی ٹانگ سکتی تھی۔

ہوآئی..... خالہ جان نے کراری سی آواز نکالی۔

میں تو سمجھی تھی کہ سو رہی ہیں۔ اب چودہری صاحب کے گھر کی ہر ہر بات تفصیل سے سنانا پڑے گی۔

ماں جی اس نے رکھائی سے کہا۔

کیا بتایا ڈاکٹر نے چودہری کی ماں کو۔ خالہ جی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

وہی کینسر''

''جھوٹے نامراد جس کو پاتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر سخت بتا دیتے ہیں۔ خالہ جی ڈاکٹر کی اس بات پر سخت چراغ پا نظر آ رہی تھیں۔

بیٹا، بہو کچھ دیکھ بھال بھی کر رہے ہیں۔

زبیدہ نے سوچا، ابھی کچھ بات بول دوں گی تو پھر بات کو بڑھا بڑھا کر میرے حوالے سے کہتی پھریں گی۔ اور پھر میں کہیں منہ دکھانے کی نہ رہوں گی۔

جیسا کہ اب تک ہوتا چلا آیا ہے۔ اس نے بات ٹالنے کو دوسری بات چھیڑ دی۔

میں نے کہا خالہ جی آج وہ پھر اس دن والا موٹا علی شیر کو گھیرے بیٹھا تھا،

اس اللہ ماری علی شیر کی جان کو یہی روگ لگا رہتا ہے۔ محلے کی سیاست کی بات

پلٹ جانے پر وہ بے دم سی ہو کر دوبارہ چارپائی پر دراز ہوگئی۔ علی شیر موٹی کی سیاست، کس کام کی جو وہ اس میں جان کھپاتیں۔

ہاں پر آج تو تین، تین گھیرے بیٹھے ہیں۔ ذرا سا منہ نکل رہا تھا غریب کا۔

ہاں وہی موٹا مونچھوں والا اس دن تھوڑا شور و غل ڈال کر گیا ہے۔ خالہ جی نے جیب سے تسبیح نکال کر

دانوں پر انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں۔

ارے ہاں علی شیر کے دکھڑے سے تو بہتر یہ ہے کہ آدمی چپ چاپ لیٹ کر تسبیح کے دانے پھراتا رہے۔ گڈو اسکول سے آیا نہیں ابھی تک؟ اچانک ہی زبیدہ کو خیال آ گیا۔

''نہ گڈو نہ جمیلہ، میں کہتی ہوں یہ بچے اتنی اتنی دیر سکول ہی میں کیوں لگا دیتے ہیں۔ اور یہ گڈو کو ابھی سے سکول بھیجنے کی کیا تباہی آ گئی تھی۔ بچہ حیران ہو جاتا ہے۔

نہ بھیجتی تو کیا کرتی دیکھتی نہیں کیسا ناک میں دم رکھتا ہے۔ گھر میں اور اب تھوڑا ادھم کرتا ہے آ کر

خالہ جی زبیدہ کی آواز میں فخر کے شائبے کو تاڑ کر جل گئیں۔ یہ آج کل کی مائیں بچوں کی شرارتوں پر خوب فخر کرتی ہیں۔ پھر کہتی ہیں کہ اولاد قابو میں نہیں، تسبیح کے دانوں پر چلتی انگلیاں روک کر

انہوں نے جلی کٹی آواز میں کہا۔

آپ ہی شرارتی بناؤ۔ آپ ہی شکایت کرو۔ مجال تھی جو میرے والا کوئی اتنی شرارت کر لیتا۔

اب جواب دینا زبیدہ نے خلاف مصلحت سمجھا۔ وہ کمرے میں چلی گئی۔ کارنس پر رکھا ہوا اسنے گڈو کا تعویذ اٹھایا۔ جس کا کپڑا بدلنے کے خیال سے اس نے صبح اس کے گلے سے اتار لیا تھا۔ سوئی تاگے کی پٹاری لے کر وہ تعویذ کا کپڑا بدلنے بیٹھ گئی۔

امی جی چابی'' جمیلہ بستہ گلے میں ڈالے دوڑتی ہوئی آئی۔ امی جی مجھے! تیر کی طرح دوڑتا ہوا گڈو آیا اور زبیدہ کے ہاتھ پر گرتے گرتے بچا۔

توبہ ہے بچے آرام سے آیا کرنا۔ ابھی سوئی گلے میں اتر جاتی۔ زبیدہ جھنجھلائی۔ اور پھر اس نے سوال کیا کیسی چابی؟

''چابی ڈاک کی۔ لیٹر بکس والا خط پڑا ہے۔ میں نکالوں گی۔ ابا جی کا خط۔

ہوں، میں نکالوں گا! گڈو نے منہ چڑایا۔ ت و نکالے گی تو وہ خط ابا جی کا نکلے گا ہی نہیں۔ اور وہ چابی کی طرف جھپٹا۔

صبر بھی کرلیا کرتو گڈو، زبیدہ نے گڈو کو پکڑا۔ چل میں تیرا منہ ہاتھ دھلاؤں۔

جمیلہ کو چابی لے جاتے دیکھ کر وہ مچل گیا۔ میں نہیں، میں نہیں دھلاتا منہ ہاتھ۔ چابی لاؤ میں نکالوں گا۔ سن تو میرے بابو، میں نے آج تیری پسند کی چیز پکائی ہے۔ ''کیا پکایا ہے؟ مٹر کا پلاؤ۔

ہاں اور دہی بھی۔

اور جب گڈو کو لے کر زبیدہ دھوپ میں چارپائی پر لیٹی تو گڈو اپنی نرم نرم، ٹھنڈی انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی کے نیچے کی کھال کھینچتے ہوئے کہا، امی جی ابا جی نے کیا لکھا ہے۔ نندا سی آواز میں زبیدہ نے جواب دیا، لکھا ہے گڈو سے کہو، شرارتوں سے باز آجائے، اور دل لگا کر پڑھا کرے،

امی جی، اس نے اس کی بن دھوتی ہوئی آنکھ پر نئی سی چیونٹی کے ڈنگ جیسی چٹکی بھری۔

ہاں کیا ہے؟ زبیدہ نے غنودگی بھری آواز میں گڈو کے ہاتھ کو جھٹک کر کہا۔ اور تھوڑی تھوڑی آنکھ کھول دی۔

وہ جو میرا دوست ہے نا علی شیر وہ رو رہا تھا۔

رو رہا تھا؟۔ زبیدہ نے چونک کر آنکھ کھولنے کی کوشش کی۔ علی شیر رو رہا تھا،،

ہاں سچی مچی رو رہا تھا۔

پھر پوچھا بھی تو نے کیوں رو رہا تھا۔؟

میں اس کے کندھے پر بیٹھ گیا تھا۔ اور پوچھ لیا تھا کہ علی شیر کیوں لوتا ہے؟۔ تو وہ کہنے لگا گڈو جی تو بھاگ جا میرے پاس سے، علی شیر سے بالکل بات نہ کر، علی شیر بہت گندہ آدمی ہے۔ اور پھر وہ مجھے کندھے سے اتار کر گاڑی کا انجن ٹھیک کرنے لگا۔

ہاں گڈو! زبیدہ نے پوری آنکھیں کھول دیں، اس کے خیال میں اس کی بھیگی بھیگی سنہری آنکھیں تھیں، جیسے کسی نے مخمل کو پانی میں بھگو دیا ہو۔

اس اتوار کو دھوپ چمک رہی تھی۔ زبیدہ نے صبح صبح پانی گرم کر کے دونوں بچوں کو نہلا دیا تھا۔ اور جب وہ خود نہا کر پانی ٹپکتے بالوں کا پیشانی پر بندھا ہوا جوڑا تولیے میں لپیٹے کھڑاویں کھٹ کھٹ کرتی دھوپ میں بال سکھانے کی غرض سے آ کر بیٹھی۔ تو خالہ جی نے اطلاع دی کہ جمیلہ اپنی سہیلی کے ساتھ ابھی ابھی اس کے گھر گئی ہے۔ اور گڈو وہ تو گھر میں ٹکتا ہی نہیں، اور نہ تو اس کو کچھ کہے۔ کہاں تک کہوں جب میری کچھ سنتا ہی نہیں، وہ لاپرواہی سے بیٹھ کر بال جھٹکنے لگی۔ اور جب سے وہ باہر رہنے لگے ہیں وہ اور بھی زیادہ بے کہا ہو گیا ہے۔

بے کہا ہو گیا ہے۔ بچے کو خراب کر دیا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ کہ ہر وقت بچہ باہر رہے۔ ہم نے نہیں گھومنے دیا کبھی اپنے والے کو۔ خالہ جی ناراضگی کے مارے پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئیں۔

زبیدہ کو باورچی خانے پہنچنے کی جلدی تھی۔ مائی تو سودا دے کر اور مصالحہ پیس کر ایسا بھاگتی۔ کہ گھڑی بھر نہ رکتی۔ اور اب نہ جانے کہاں پھر رہا ہو گا۔ خالہ جی کو پھر جوش چڑھا۔

پھرتا کہاں علی شیر کے پاس گیا ہو گا۔ علی شیر کون لگتا ہے اس کا؟۔ کیا کام ہے

اس کا علی شیر کے پاس مجھے نہیں پسند۔

پھر تم بھی تو دادی ہو۔ میں کام کاج میں لگا کروں، تو پوتے کو سنبھال کر بیٹھا کرو۔ قصے کہانی میں لگاؤ، تو کاہے کو ادھر ادھر گھسے۔ زبیدہ چیخ کر بولی، مجھے نہیں آتی کہانی کہونی، اپنے اوپر ذمہ داری آتے دیکھ کر خالہ جی چت لیٹ گئیں۔ میرے آپ ہر گھڑی کمر میں درد رہتا ہے۔

تو پھر تمہاری بلا سے پھرتا رہے آوارہ۔ جس کی دادی کو اپنی جان دیکھنے سے فرصت نہ ہوگی۔ وہ تو ایسے ہی پھرے گا۔

میز پر رکھے ہوئے مٹی کے تیل کے چولھے کے پاس کھڑے ہو کر اس نے سوچا، کہ خالہ جی سے کہے، کہ علی شیر سے کہے اسے لے آئے۔ لیکن اول تو خالہ جی اس کے سر کے گلاب اور برف کے پانی والے نسخے سے سخت برہم تھیں۔

یہ بھی کوئی بات ہوئی، جس نے جو کہہ دیا اس کو کرنے بیٹھ گئیں۔ دوسرے علی شیر تو کل کا کسی کو نظر ہی نہیں آیا تھا۔

دن ویران تھا، اور دھوپ زرد، زبیدہ کا دل بیٹھنے سا لگا۔ بچی بیمار ہے، وہ منگلا میں اور گڈو اسکول میں۔ اس کی نازک مخروطی انگلیاں سر کے اور گلاب میں بھیگے کپڑے کو نچوڑتے نچوڑتے لرز سی گئیں۔

دھیرے دھیرے وہ چلتا ہوا پچھلی سڑک کی طرف مڑ گیا۔ اور یہ سڑک اسٹیشن کو جاتی تھی۔

علی شیر۔ گڈو نے اس کے کندھے پر بیٹھے بیٹھے جھک کر اس کی گردن میں چھوٹے چھوٹے ہاتھ حمائل کر دیئے۔

اب کتنی دیر میں چلے گا۔ امی جی کب کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ اب تو شام ہو رہی ہے۔

ننھے منے گداز ہاتھوں کے لمس سے اس کو جھنجھلا دیا۔ جیسے پریشان اور سراسیمہ

دل بے وقت کی راگنی سے الجھ جاتا ہے۔

اس کا دل چاہا کہ ڈپٹ کر گڈو کو حکم دے، کہ ہٹاؤ یہ اپنے ہاتھ، ورنہ ابھی پٹخ کر بھیجا پاش پاش کر دوں گا۔ وہ چپ چاپ چلتا رہا۔

علی شیر! کھوتے، بلے، مرغے چل نہ اب گھر کو" اس نے نرم لیکن مضبوط گھٹنے اس کی دونوں پسلیوں میں اڑا دیئے۔

کیوں کیا جلدی ہے بول تو دیا تجھ کو، کہ گھر پر بول دیا ہے کہ دیری سے لاؤں گا گڈو کو، منشی کے سگریٹوں نے اس کی زبان گول کر رکھی تھی۔

مجھے بھوک جو لگی ہے۔ چل بھئی تو کھانا بھی کھا لے۔ مجھے اسٹیشن پر ایک کام ہے۔ گڈو نے سوچا۔ ناحق ہی اس کمبخت کو امی جی نے بھیج دیا۔ جب اس کو ضروری کام تھا تو کیوں بھیجا۔ میں تو بلو، پپو کے ساتھ ہی چلا جاتا۔ صبح تو مجھ سے خود بھی کہا تھا۔ اس کا دل پریشان سا تھا۔ نرم نرم نان اور چپٹے کباب کا نوالہ اس کے منہ میں پھول پھول جاتا تھا۔ اور جب وہ آڑا بستہ گلے میں ڈالے مسافر خانے کی سخت بنچ پر بیٹھا تھا۔ اور زبردستی نوالوں کو حلق سے اتار رہا تھا، تو اپنی سرخ سرخ آنکھوں کو سخت ناراضگی کے عالم میں گھما گھما کر علی شیر سوچ رہا تھا۔

خیر ہے شہباز خاں تم نے مجھے مجبور تو کیا ہے۔ مگر میں بھی تم سے اپنا انتقام لے کر ہی چھوڑوں گا۔ اس نے منشی سے لیا ہوا ایک اور سگریٹ نکال کر سلگایا، اور تین چار کش لیے۔ نیلگوں دھوئیں کے نازک، لیکن ماحول پر چھا جانے والے دھوئیں کے درمیان چکراتے ہوئے سر میں اسکی سوچ اور اس کا تصور دونوں ہی گڈمڈ ہو گئے۔ ہر چیز کی ایک گتھی سی بن گئی۔ خرکاروں کا ڈیرہ جہاں وہ اور اس جیسے کتنے ہی نو عمر لڑکے کام سے واپس آ جانے کے بعد پیروں میں بیڑیاں پہنے بیٹھے یا پھرتے رہتے۔

علی الصبح ایک پیالہ چائے کے ساتھ ایک نان کھانے کے لئے ان کے پاؤں کی

بیڑیاں کھول کر بڑا خان ان کو لائن پر لے جاتا۔ اور دن بھر دریا کی تہہ سے کھرچالوں کے ذریعے وہ اور اس کے ساتھی پتھر نکالا کرتے۔ اور پھر خیمے پر واپس آ کر کبھی نان اور چنے کی دال یا کبھی تکے مل جاتے۔ سگرٹ کے ایک لمبے کش اور نتھنوں سے نکل کر پھیل جانے والے دھوئیں کے ایک دبیز مرغولے نے وہ ساری بات تو بھلا ہی دی، کہ کس طرح شہباز خان اس کو خرکاروں والے خیمے سے لے بھاگا تھا۔ پھر کتنے ہی دن شہباز خاں اس کو موٹر کا کام سکھاتا رہا۔ اچانک ہی شہباز خاں نے یہاں اس شہر میں کارخانے میں لا کر لگا دیا۔

اس تمام تبدیلی پر وہ کتنا خوش تھا۔ وہ اس آزادی اور خوشی کے لئے شہباز خاں کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر جب شہباز خاں نے اس کو یہاں لا کر رکھنے کا سبب بتایا، ت وعلی شیر کو یہ ایک معمولی پر خطرناک بات معلوم ہوئی۔ لیکن علی شیر سخت مزاج، مضبوط دل گردے والا باوفا جوان تھا۔ وہ ہر بات کو سنجیدگی سے لینے والا۔ اور بلی کی طرح ہوشیار۔ اس کے لئے ہر بات آسان ہو سکتی تھی۔ پھر..... معلوم نہیں کیا بات ہوگئی، جو ہر بات اس کے لئے مشکل ہوتی چلی گئی۔ کس وجہ سے اور نا معلوم کیوں؟ شہباز خاں کے باہر آ کر ٹوکنے اور جلدی مچانے کے باوجود وہ ہر بات بھول بھول جاتا۔ کارخانے کے شوں شوں اور شن شن کرتے انجن خستہ حال اور رگیدی ہوئی گاڑیوں کی سوئی بیڑیاں اور ان کے تن مردہ میں جان ڈالنے کا شغل کچھ کم دلچسپ تھا۔ اور پھر ساتھ کام کرنے والے لڑکوں اور مستریوں سے گالم گلوچ، ہنسی مذاق، میٹھی، ٹھنڈی بوتلیں۔ مینار اور فوکس کے سگرٹ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گھنٹوں میں گلی کے نکڑ والی گوندنی کے مختصر سے گھن دار درخت کے سایے میں پاؤں پسار کے بیٹھے بیٹھے آتے جاتے راہ گیروں کو تکنا۔ زندگی بڑی مکمل اور آسودہ ہوتی جا رہی تھی۔ بعض وقت تو اس کو محسوس ہوتا کہ جیسے اس کے اندر ہر چیز ٹوٹ پھوٹ کر کوئی نئی چیز پھر سے بن کر تیار ہو رہی ہے۔

دھیرے دھیرے گڈو سے اس کا ربط ضبط بڑھتا گیا۔ اور اس دوستی کے ساتھ ساتھ کالے برقعے کے اور کبھی دروازے پر لٹکے ہوئے پردے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی دو لمبی لمبی سیاہ آنکھوں میں اس اعتماد کی وہ جھلک زندگی کے مکمل ہونے کے احساس کو کتنا بڑھا دیا کرتی تھی۔

اور اب اچانک ہی علی شیر کو وہ چھوٹا سا معمولی سا کام کتنا اہم معلوم ہونے لگا تھا۔

جھنجھلا کر علی شیر نے منشی کا وہ سگرٹ جو دو آنے میں صرف ایک ملتا تھا۔ پلیٹ فارم پر پھینک کر اپنی چمکتی ہوئی مضبوط سیاہ چپل کے نیچے مسل دیا۔ میں نے تم سے کتنی بار کہا تھا، کہ اگر تجھے منگا کے اس سپروائزر سے انتقام ہی لینا ہے۔ اور اس کا بچہ ہی اٹھوانا ہے۔ تو میرے بجائے تو یہ کام چوہے جیسے پتلے چہرے اور تیز آنکھوں والے نور خاں کے ذمے لگا دے۔ مگر نہیں تجھے تو میری آزمائش منظور تھی۔ اور مجھے بھی تیرے احسان کا بدلہ چکانا تھا۔ ہر قیمت پر، شہباز خاں تجھے بھی کب معلوم تھا، کہ میرے اندر کی ہر چیز ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ اور ایک نئی چیز پھر سے بن رہی تھی۔ مجھ پر کیا گزر رہی تھی تم کیا جانو۔ بلکہ مجھے بھی کب پتا تھا کہ یہ کون ہے جو میرے اندر ہر ہر چیز کو بدل رہا ہے۔ نہیں معلوم وہ یہ گڈو تھا یا کوئی اور پھر کون؟ پنڈلیوں تک آ کر رہ جانے والے برقع میں سے نظر آتی ہوئی شلوار کے ملگجے سے پائنچوں کے نیچے سیاہ چپل میں سے عجیب سی ناقابل بیان خوبصورتی میں جمے ہوئے وہ پیر گداز اور اجلے پیر اس کی نظروں میں گھومے، اور پھر بھروسے سے لبریز دو لمبی لمبی آنکھیں۔ جیسے جھکی سی جا رہی ہوں۔

اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ گڈو نے بمشکل دو چار نوالے کھا کر پلیٹ سرکا دی۔ اس نے مسافر خانے کے گندے سے گلاس میں پانی پیا تو علی شیر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا، یہ بچہ بڑا صاف ستھرا رہا کرتا تھا۔ پھر وہ کچھ اس انداز سے اس

کے پاس آیا، جیسے دھیرے دھیرے اس کا اعتبار اٹھ رہا ہو۔

ہو گیا تیرا کام اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

ہاں علی شیر نے ایک بڑا اور ایک چھوٹا ٹکٹ جیب میں مسل کر اپنا اطمینان کیا۔ اور جیب میں سے لال، سبز کھٹی میٹھی گولیاں نکال کر گڈو کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ اچانک ہی گڈو کا دل اس کی طرف سے صاف ہو جانے پر آمادہ ہو گیا۔

یہ تو وہی اپنا پرانا علی شیر تھا، چلو کیا ہوا جو اس نے آج ذرا دیر کروا دی۔ سرخ گولی کھٹا میٹھا شیرا اس کے منہ میں بھرا ہوا تھا۔ اور ہونٹوں پر لالی سی دوڑ گئی۔ گڈو نے ایک چٹخارا بھر کر کھٹ مٹھا رس حلق کے نیچے اتارا۔ اور پھر اچانک ہی ڈھلے ہوئے دن کا احساس کر کے گڈو کا دل بوکھلایا۔

میں بتاؤں علی شیر اب تو تو ٹیکسی لے کر گھر پہنچ۔ میں امی سے پیسے دلوا دوں گا۔ گڈو کی آواز میں فکر کے باوجود بھول پن تھا۔ گوشت بھونتے بھونتے زبیدہ کی نظر باورچی خانے کی کھڑکی کے باہر چلی گئی۔ کارخانے کے احاطے میں کوڑے اور مٹی کی آمیزش سے جو ٹیکری سی بن گئی تھی۔ اس کے ساتھ لگے ہوئے جامن کے پیڑ سے ٹیک لگائے پاؤں پسارے علی شیر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر اب تک افسردگی تھی۔ اس کے بال پریشان تھے۔ اور جیسے وہ ہر اتوار کو نہایا دھویا سجا نظر آتا تھا۔ اس کے برعکس اس کے کپڑوں سے بے پروائی اور لاابالی پن کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی یکف کا بٹن بھی کھلا ہوا تھا۔ جس میں سے اس کی بہت صاف رنگت کی کلائی جھمک رہی تھی۔ علی شیر کے پاس ہی اسی گندی ٹیکری پر گڈو بڑی بے تکلفی سے بیٹھا تھا۔ علی شیر کے ہاتھ بڑی بے تکلفی سے کسی گول سی چیز کے گرد گھوم رہے تھے۔ دونوں باتوں میں مصروف تھیاور گڈو کا منہ یوں چل رہا تھا

جیسے وہ کچھ چوستا جا رہا ہو۔

ضرور یہ گڈو کے لئے ڈور کا پنا تیار کر رہا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ آج

پھر نامراد نے کھٹی میٹھی گولیاں دلا دی ہیں گڈو کو۔ زبیدہ کو علی شیر پر ہلکا سا غصہ آیا، اور پھر وہ گوبھی کا پھول کترنے میں مصروف ہوگئی۔

گڈو پنا ہاتھ میں پکڑ کر ٹیکری سے اتر گیا۔ اور دوڑتا ہوا اپنے گھر کی طرف لپکا۔ تو علی شیر اس کو دور تک جاتا دیکھتا رہا۔ ایک بار پھر اس کی سنہری آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ اس نے سر جھکا لیا اور سخت بے چینی سی محسوس کی، اس کا سر الجھن اور بوجھ سے پھٹا جا رہا تھا، دونوں کن پٹیاں تپ سی رہی تھیں۔ کارخانے کے اس طرف لمبی سیاہ گاڑیتا رکول والی سڑک پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اچانک ہی علی شیر کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی۔ کاش یہ لمبی سی سیاہ گاڑی اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر دوڑ جاتی، اور پھر یوں کتنی آرام دہ نیند آسکتی ہے، انسان کو۔ اب یوں یہاں اس ٹیکری پر محفوظ بیٹھا ہوا

کتنا غیر مطمئن اور بے کل ہوں۔ اس نے سوچا۔

دھیرے دھیرے وہ ٹیکری کی ڈھلان سے اترا۔ کارخانے کے باہر دیوار سے ٹیک لگائے لکڑی کے چھوٹے سے کھوکھے کے پاس آگے کو جھکی ہوئی لمبی ناک، اور بالکل اندر کو گھسی ہوئی آنکھوں والا منشی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ منشی کا چہرہ ہڈی سے لگ کر اب بالکل اندر کو گھسا جا رہا تھا۔ رخساروں پر کا گوشت جیسے پگھل پگھل کر بہہ گیا ہو، اور اب تو جبڑے تک کے جوڑ نظر آنے لگے تھے۔ منشی کے کھوکھے میں لیمپ، مینار، فوکسا اور بگلے کے سگریٹ کی ڈبیوں کے علاوہ شکر چڑھی زرد سبز سونف، لال سبز کھٹی میٹھی گولیاں اور پلاسٹک کی تھیلیوں میں چھوٹے چھوٹے بھوکر اندے بسکٹوں کے علاوہ تانگے کی میلی میلی پلیاں اور زنگ خوردہ بٹن بھی تھے۔ لیکن دراصل یہ منشی کا اصل سامان تجارت نہ تھا۔ جس کو بیچنے کی خاطر وہ صبح سے شام تک بیٹھا اپنی دکان پر اور خود اپنی ذات پر بھی مکھیاں بھٹکایا کرتا تھا۔ اس کا اصلی مال تو کھوکھے کی تین چار گز زمین کے اندر دبا اور دیوار کے موکھلوں میں گھسا رہتا تھا۔ اور جس کو وہ بڑی

پھرتی اور ہوشیاری سے نکال کر سگرٹیوں کے اندر منتقل کر دیا کرتا تھا۔ اور اس کے یہی اسپیشل سگریٹ تو کارخانے کے تھکے ہارے مزدوروں اور جھنجھلائے ہوئے مستریوں کی تکان اور دھندلاہٹ دور کرنے کا واحد ذریعہ تھے۔ ایک سگریٹ ساری کوفت، سارا جھنجھٹ بھلا دیا کرتا تھا۔ شاید ہی کوئی مستری اور مزدور ایسا ہو جو منشی سے یہ سگریٹ نہ خریدتا ہو۔ سارے ڈرائیوروں، سارے کلینروں اور کام سیکھنے والے لڑکوں اور منشی کے درمیان یہ سگرٹ راز داری اور دوستی کا رابطہ تھے۔ وہ ان کی آنکھوں کے اشاروں، ہاتھوں کی جنبش اور مسکراہٹ کے انداز سے ہی ان کے مطالبے کی تعداد مقدار سمجھ جاتا تھا۔ اور مطلوبہ مال کم سے کم وقفے میں ان کے ہاتھ میں پہنچا دیتا تھا۔

علی شیر کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بظاہر اونگھتے ہوئے منشی نے اپنی دھنسی دھنسی آنکھوں سے اس کو تاڑا۔ اور علی شیر کو وہ کھوکھے کے پاس بیٹھی ہوئی بڑی سی چیل معلوم ہو رہا تھا۔

آؤ جی خان، منشی نے اپنی غنغنائی آواز میں باچھیں پھیلا کر اس کا استقبال کیا۔ اگرچہ آج اس نے علی شیر کی آنکھوں میں جو کبھی اس کے ہتھے ہی نہ چڑھتا تھا، آج طلب کی چمک اور تڑپ دیکھی تھی۔ پھر بھی اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا اور بولا

سونف کا پتہ دوں خان؟

علی شیر نے اس کے ایک ٹھوکا مارا، اور کمال بے تکلفی سے پھکوا مار کر کھوکھے کے آگے بیٹھ کر ہاتھ پھیلایا۔ تو بہت تیامت کر، لا یار سگرٹ پلا۔ وہ سگرٹ کا کش لگانے سے پہلے ہی جھوم گیا۔

اور یہ تو منشی کے لئے بڑا ہی واضح اشارہ تھا۔ چار سگرٹ جیب میں ڈال کر اور پانچویں کا کش لگاتے ہوئے علی شیر ڈگمگاتے قدموں سے اپنی کوٹھری کی طرف چلا گیا۔

اس شام علی شیر کی اپنے نیچے والے اپرنٹس لونڈے سے ایسی دھینگا مشتی ہوئی کہ خود اپرنٹس بھی حیران رہ گیا۔ علی شیر تو بڑا رحیم و کریم استاد تھا۔ اور اس کی اس جھڑپ کا تماشا گڈو تک نے دیکھا۔ اور جب گڈو نے علی شیر کا ہاتھ پکڑ کر اس کو سمجھانا چاہا، تو اس نے گڈو کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور دوبارہ زور شور سے گالیاں دیتا ہوا لڑکے پر چڑھائی کی، تو اس نے بھی مدافعت کی خاطر بڑا اسکروڈرائیور تان لیا۔ اور گڈو تڑپ کر رو دیا۔

ہائے علی شیر مر جائے گا۔

علی شیر کر جیسے اچانک ہی کسی نے سوتے سے جگا دیا۔ وہ الگ ہٹ گیا۔ اس نے جھک کر گڈو کو اٹھایا، اور اپنے کندھے پر بٹھا کر اس مجمع کے درمیان سے نکل آیا۔ جو اس کو اور اپرنٹس کو سمجھانے کی خاطر جمع ہو گیا تھا۔

گڈو اب تک سسک سسک کر علی شیر کے سینے سے لگا رو رہا تھا۔ اور ساتھ میں علی شیر سے لڑتا بھی جا رہا تھا۔ پھر تو لڑا تھا۔

اچھا گڈو جی اب نہیں لڑنے کا۔ اس نے گڈو کے نرم نرم گال کو اپنی ناک سے گدگدایا۔

پھل تو نے چرس کیوں پی تھی؟ علی شیر کو جیسے کسی نے گھونسا مارا۔

گڈو تجھے کس نے بتایا کہ میں نے چرس پی ہے۔

سارے کہہ رہے تھے۔ علی شیر پھل میں تجھ سے کٹی کر لوں گا۔ اب نہیں پینے کا گڈو جی لو تم میرا کان کھینچ لو۔

گڈو نے ننھا سا گدبدا ہاتھ اس کے کان پر رکھا۔ اور اچانک ہی ہٹا کر اس کی گردن کو پیار کر لیا۔

علی شیر کی رگ رگ میں ان جانا سا معصوم سرور دوڑ گیا۔ اور یہ کتنا دلچسپ اور انوکھا تجربہ تھا۔

چرس کے اس رگ رگ کو تڑخا دینے والے سرور سے مختلف، نس نس، کو ڈھیلا کر دینے والا۔ اس کی گردن میں ہاتھ ڈالے ڈالے گڈو سو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علی شیر کے اس نئے روپ نے اس کے ننھے دوست کو خوف زدہ کر دیا تھا۔

اس نے جب ٹاٹ پڑے پردے کے پاس جا کر آواز دی، کہ گڈو کو لے جاؤ۔ تو زبیدہ نے گھبرا کر کہا۔

اللہ خیر میرے بچے کی، اور مارے بوکھلاہٹ کے وہ آدھے دھڑ سے باہر نکل آئی، کوئی بات نہیں سو گیا ہے۔ علی شیر ن بچے کو اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

تو زبیدہ نے دیکھا اس کی سنہری مخمل جیسی آنکھوں میں لال لال ڈورے سے کھڑے تھے۔ چرس کے ایک بھبھکے نے اس کے دماغ کو چکرا دیا۔ اور بچے کو اس نے خالہ جی کی چارپائی پر لٹاتے ہوئے سوچا،

یا اللہ میرے یہ علی شیر ہٹا کٹا اور لمبا چوڑا ہے۔

تین دن کی چھٹی گزار کر ابا جی واپس منگلا جانے لگے، تو گڈو نے ان کے بوٹوں کے تسمے اپنے ہاتھوں سے باندھے، اور پھر جب اتنے بڑے ابا جی نے جھک کر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر پیار کیا، تو اچانک اس کے گلے میں کالا ڈورا اور سرخ چھینٹ میں سلا ہوا تعویذ نظر آ گیا۔

کیوں جی میں کہتا ہوں۔ تم اب اس کو ساری عمر تعویذ پہنائے چلی جاؤ گی۔ کیا خرافات ہے۔؟

کیوں خرافات کیا ہے؟۔ دافع بلیات ہے۔ میرے دل کی تسلی رہتی ہے۔ کہ میرا بچہ قرآنی آیات کی حفاظت میں ہے۔ قرآن کا نام سن کر ابا جی نے نظریں جھکا لیں اور بات ٹال کر گڈو سے بولے۔ گڈو جی گھر میں اپنی امی کا دادی کا اور آپا کا خیال رکھا کرو۔ دیکھو نا اب گھر پر تم ہی مرد ہو۔

زبیدہ ہنس پڑی۔ ہاں آپ کا بیٹا اب جوان ہوتا جا رہا ہے۔ دیکھیے کتنی محنت

سے آپ کے بوٹ پالش کیے ہیں۔ آپ کے، ابا جی کی آنکھوں میں تمکنت تھی، فخر تھا، اور بے پناہ پیار تھا۔ گڈو نے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے ان کا مفلر درست کیا۔ اور کوٹ کا کالر کھینچ کر اونچا کر دیا۔ تا کہ سردی نہ لگے۔

اور اس شام پھر موٹے مچھیل نے علی شیر کی جان پر آفت توڑ رکھی تھی، ایک بات جو سمجھ میں آتی تھی اور جسے وہ بار بار دہرا رہا تھا۔ وہ یہ تھی کہ

ام ایک آفتہ کی مولت اور دے گا، پر امارا انتقام تم دیکھے گا۔ ام چیل کوے کو تمارا بوٹی کھلائے گا۔

اے ہے نگوڑا علی شیر، جانے کتنا قرضہ اس نے اس سے لے رکھا ہے۔ کم بخت دے کر اس سے اپنی جان کیوں نہیں چھڑا لیتا۔ کسی سے قرض لے کر ہی اس کا قرضہ چکا ہی دے۔ زبیدہ نے مونگ کی دال دھوتے دھوتے سوچا۔ اے ہے ایک ہفتے کی مہلت اور دے رہا ہے۔ اس کے بعد دیکھو اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

زبیدہ کے جسم بھر میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ علی شیر کا سارا قد کاٹھ، اس کی مخملیں نگاہیں، گھونگھریالے بال اور سب سے بڑھ کر خاموش اور شریف چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔

سنا ہے۔ اس نے علی شیر کی چھاتی پر کئی گھونسے بھی مارے، ذلت بھی دی۔ پر وہ سر جھکائے گم سم کھڑا رہا۔ اور اس کے جاتے ہی اس کے آنسو چل نکلے، یہ ساری پل پل کی خبریں گڈو لا رہا تھا۔

اے ہے زبیدہ گڈو کو تو اس نامراد علی شیر کے پاس جانے سے روک نہ جانے کس آفت میں پھنسا ہوا ہے۔ کاہے کو ہمارا بچہ اس میں اتنا گھسے۔

زبیدہ سر جھکا کر رہ گئی۔ علی شیر کو یہاں کارخانے میں کام کرتے ہوئے سال ہونے کو آ رہا تھا۔ پہلے دن سے ہی اس نے گڈو سے خصوصیت برتی تھی، اور اس کو اپنے سے مانوس کیا تھا۔ ابھی تین مہینے پہلے ہی کی تو بات ہے جمیلہ اکیلے ہی اسکول

سے منہ لٹکائے آ گئی تھی۔ کہ سپیرے کے ساتھ ساتھ سکول کے کئی بچے ساتھ والی سڑک پر نکل گئے تھے۔ اور گڈو بھی ان کے ساتھ ہے ت وہ سر پر برقع ڈال روتی پیٹتی نکلی۔ تو خالہ جی نے بھی اپنا سیدھا شٹل کاک جیسا برقع چندیا پر جمایا، سارے کا سارا پیچھے کی طرف ڈالا۔ اور جوتیاں گھسیٹتی یوں چلیں کہ ہر راہ چلتے کو گڈو کی گم شدگی کا تفصیلی قصہ بھی سناتی چلیں۔ اور سننے والوں میں فقط علی شیر ہی تو تھا، جوان دونوں کی ہمراہی میں گلی گلی مارا پھرا تھا۔ اور پھر گڈو کو سانپ کے تماشے میں غرق دیکھ کر اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر

بے شمار جھڑکیوں کے ساتھ گھر کے دروازے تک پہنچا کر یہ دھمکی دی تھی کہ جو اب کبھی ایسی حرکت کی تو بڑی والی ٹرک کے انجن میں بٹھا کر تالہ ڈال دوں گا۔ پھر ٹرک والا شہر شہر گاؤں گاؤں نچاتا پھرے گا۔

موٹے مچھیل اور اس کے دونوں ساتھیوں کے جانے کے بعد سے پھر کسی نے علی شیر کو کارخانے کے احاطے یا نواح میں چلتے پھرتے نہ دیکھا۔ کہتے ہیں وہ تمام رات کوٹھری میں بند رہا تھا۔ اور رات کے مختلف وقفوں میں اس کے کھانسنے، ناک چھنکنے اور کبھی کبھی بڑبڑانے کی آوازیں بھی آتی رہی تھیں۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ موٹا مچھیل جو خود ہی علی شیر کو کارخانے میں ملازم رکھوانے آیا تھا۔ اب مالک سے ضد کر رہا تھا کہ اس کی چھٹی کر دو۔ ہم

دوسرا آدمی دے گا۔ اس کے بدلے۔

مگر علی شیر کے نیچے کم سے کم درجن بھر لڑکے کام سیکھ رہے تھے۔ مالک کو فقط یہی پس وپیش تھا۔

سرما کی رخصت اور آمد بہار کا درمیانی زمانہ تھا۔ فضا میں کچھ خاموشی اور ویرانی سی تھی۔ جمیلہ کا بخار تیز تھا۔ اور زبیدہ سر کے اور گلاب میں تر کپڑا اس کے سر پر رکھ رہی تھی۔ مگر اس کا دل اڑا جا رہا تھا۔ ناحق ہی گڈو کو سکول بھیجا، جو وہ لڑکے ساتھ لانا

بھول گئے تو۔ کتنی مرتبہ اس کو خیال آ چکا تھا۔

علی شیر نے سوچا گاڑی آنے میں ابھی دس منٹ باقی ہیں۔ چل بھئی گڈو۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ٹھہر میں بستہ تو اپنا بنچ پر بھول آیا۔

تو اب بستے کا کیا کرے گا علی شیر نے کڑھ کر سوچا، اور چپ رہا۔ گڈو جھٹ پٹ بستہ اٹھا گلے میں ڈال کر اس کی گودی میں چڑھا تو جھٹکے سے علی شیر کے گریبان کے دو بٹن ٹوٹ گئے۔

ارے علی شیر کھوتے تو بھی تعویذ پہنتا ہے۔ گڈو نے علی شیر کے گلے میں پڑا ہوا سیاہ ڈورا کھینچا اور خوش ہو گیا۔ ہاں کیوں، اس کی آواز بھاری تھی۔

میں بھی پہنتا ہوں۔ یہ دیکھ، گڈو نے جلدی سے اپنا گریبان کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔ کالے ڈورے سے لٹکتا ہوا اجلی، اجلی مخروطی انگلیوں کا بڑے ارمانوں سے سیا ہوا سرخ چھینٹ کا تعویذ اسکی گوری تندرست گردن کے گرد پھنسا ہوا تھا۔

تو اچھا کرتا ہے۔ علی شیرے جو یہ تعویذ پہنتا ہے۔ میں ضد کرتا تھا نا کہ میں یہ تعویذ نہیں پہنوں گا، تو امی نے بتایا تھا کہ اسمیں تو قرآنی آیتیں ہیں، جو آفتوں سے بچاتی ہیں۔ اور پھر گڈو اچانک ہی خوش ہو گیا۔ علی شیر میرا تعویذ میری حفاظت کرے گا اور تیرا تعویذ تیری حفاظت کرے گا۔ اس نے اس کی سرخ آنکھوں میں جھانکا۔ میں ٹھیک کہتا ہوں نا۔ اچانک ہی اسکی آنکھوں سے چرس کی ساری سرخی غائب ہو گئی۔ اور وہ مخملیں آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

ہاں گڈو اس کی آواز میں بھاری پن سا تھا۔ پان چبے والی ڈاک گاڑی زور شور سے اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی، اس نے ایک جھٹکے سے گڈو کو اتار کر بیچ پلیٹ فارم پر چھوڑا۔ اور گاڑی کی طرف لپکا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی روک لی گئی۔ اسٹیشن کا سارا ہجوم سفر کرنا بھول کر لاش کے معائنے کی طرف دوڑا، اور جب سیاہ و سفید پتھر کی

بجری پر پٹڑی کے ساتھ خون میں نہائی ہوئی تن ومند لاش اٹھا کر رکھی گئی۔ ت وہجوم میں ایک رلا ملا بچہ ملا۔ جس ک یگلے میں ایک چھوٹا سا بستہ لٹک رہا تھا۔ چیخا۔ ہائے علی شیرے! اور بے ہوش ہو گیا۔

جاہل سے وردی پوش سپاہی نے اسکول کے کام کی ڈائری کے ورق پلٹ کر اٹک اٹک کر پتا پڑھا۔

جمیل الزمان۔ گلی نمبر ۴ امکان نمبر ۵ متصل صمد آٹو موبیل۔ اور وہ اس بچے کو اس کے ٹھکانے پر پہنچانے کے اہتمام میں مصروف ہو گیا، جس کے گلے میں کالے ڈورے والا سرخ چھینٹ کا تعویذ پڑا تھا۔

اکیلا

افسانہ نگار : فرخندہ لودھی

چھوٹے بیگ کو پہلا عشق بینو چماری کے ساتھ ہوا۔ وہ خوبصورت تھی یا نہیں، گوری اتنی تھی کہ بیگ کی کچی عمر کی ناسمجھ آنکھوں میں چاند پکڑنے کی خواہش بن کر بس گئی تھی،

اس بات سے قطع نظر وہ بیاہی ہوئی تھی اور اس سے کئی سال بڑی تھی، بیگ بینو کے جھونپڑے کے گرد منڈلاتا رہتا۔ وہ چرخہ کات رہی ہوتی، تانت کو کھینچتا، ڈالتا، بایاں بازو بیگ کو ایسا لگتا، جیسے تانت کے ساتھ اس کی سانس اٹکی ہو۔ دوسری عورتوں کے ساتھ جب وہ پانی بھرنے جاتی، تو بیگ لڑکوں کی ٹولی سے کٹ جاتا۔ اور ادھر ادھر تکتا۔ اور اس کا جی چاہتا کہ کنکریاں مار کر سب کی گگریاں توڑ دے۔ اور ان کے شریر بھگو دے۔ وہ جو چہلیں کرتی اٹھلاتی ہوئی چلتی ہیں۔ اور ساری دنیا ان کے سامنے ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ وہ ایسا کر بھی دیتا تو اسے کون روکتا۔ پھر گگریا توڑ کر انگ بھگونا عین پیار بھری شرارت تھی۔ بھیگے ہوئے حسن کے ذکر سے سارا اردو، ہندی ادب بھرا پڑا تھا۔ اور بیگ اس زمانے میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا

بات ہولے ہولے پھیل گئی، بینو کے شوہر نے سنی۔ طیش آیا، روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔

''رنڈی تو چھب (کھلا کے کیوں چلتی ہے ری)''

بینو سو گندیں کھاتی تھی کہ اسے کچھ علم نہیں۔ وہ تو اس کے چھوٹے بھائیوں جینا ہے۔ لیکن شوہر نے جو کچھ کہنا تھا، بینو سے کہا۔

اب تو گھونگھٹ الٹ کر مت چلا کر۔

راجہ کے بیٹے کو پرجا کا آدمی کیا کہہ سکتا تھا۔ اگر کہیں کہتا تو الٹی آنتیں گلے پڑتیں۔ بیگ مر دتھا بھلا کہیں سورج پاتال میں جاتا ہے۔ کہیں خود دھرتی کے سینے میں دراڑ پڑ گئی ہوگی۔ بین وکا ہی دل مچل گیا ہوگا۔ گاؤں میں اس قسم کی ہزار باتیں پھیلیں۔

چھوٹا بیگ تین بہنوں کا ایک بھائی تھا۔ باپ کسی زمانے میں اچھا زمیندار رہا ہوگا۔ تقسیم ملک سے جہاں نیچے کے خاندان اوپر آئے۔ وہاں بڑے بیگ صاحب کا خاندان اوپر سے نیچے سرک آیا۔ وہ پرانے خیالات کے آدمی، حق گوئی اور حق پرستی پر تکیہ رکھنے والے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ اب جس لاٹھی اس کی بھینس کا زمانہ آگیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ سرکار خود بلوا کر کہے گی کہ لیجئے بڑے بیگ صاحب یہ آپ کی زمینیں ہیں۔ یہ گھر کے بدلے میں گھر ہے سنبھالئے۔ لیکن ایسا پیغام کبھی نہ آیا اور کئی سال بیت گئے۔ وہ تو شکر خدا کہ دو بڑی بیٹیوں کی شادی تقسیم ہند سے پہلے ہو چکی تھیں۔ ورنہ اس کس مپرسی کے عالم میں کون پوچھتا۔ سب سے چھوٹی بیٹی اب جوانی کی حدود کو چھو رہی تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ جیسے ہی جائیداد کا فیصلہ ہو، وہ بیٹی کے فرض سے سبک دوش ہو جائیں گے۔ ملک کی حالت روز بروز افزوں تھی اور

بیگ کا خاندان دگرگوں تھا۔ وہ اس کا ذمہ دار چھوٹے بیگ کو ٹھہراتے۔ ایک وہ زمانہ تھا، جب چھوٹے بیگ نے عشق کیا۔ کوئی پندرہ یا سولہ کا سن رہا ہوگا۔ بڑے بیگ کو کتنی مسرت ہوئی تھی، مونچھوں کو مروڑتے ہوئے بیوی سے کہا بیگم، برخوردار جوان ہو گیا ہے۔

بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی اور سمٹ گئی، بڑی عمر کی عورت کے لئے محبت کی بات ایسے ہی ہے۔ جیسے لطیف ہوا کے جھونکے کا گزر۔

بینو چماری نے جب چھوٹے بیگ کی وجہ سے اتنی مار کھائی تو اس کے دل میں

چھوٹے بیگ کو نظر بھر دیکھنے کی خواہش جاگی۔ نظریں ملیں تو مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ میں اپنے آپ ہی ہو گیا۔ اس روز چھوٹا بیگ سکول سے واپسی پر اپنا سارا جیب خرچ۔ خرچ کر مسالے کا چوڑا ہموتیوں کی جھالر والے پیتل کے بالے، رشک منیر قسم کی عطر کی شیشی خرید لایا۔ اسے ہر وقت دھن رہتی کہ کہیں بینو کا قرب نصیب ہو تو یہ تحائف پیش کرے۔ انہی سردیوں میں بینو کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی، وہ دھوپ میں بیٹھی بچی کو دودھ پلا رہی تھی۔ چھوٹے بیگ نے دیکھا طبیعت متلا سی گئی۔ پھر وہ تمام دن کھیتوں کی منڈیروں، پگڈنڈیوں پر گھومتا ایک ہی بات سوچے جاتا تھا، بینو کتنی گندی ہے۔ چھی کتنی گندی ہے۔

رات کو بخار میں بھی بڑبڑاتا رہا۔ رفتہ رفتہ بینو اس کے ذہن سے ایسے محو ہوئی، جیسے سرما کی دھوپ آئے اور چلی جائے۔ ماں نے کلمہ شکر ادا کیا۔ بیٹا نچ عورت کے چکر سے نکل آیا۔ باپ فخر سے کہہ رہا تھا۔

نر بچہ ہے نر

بڑے بیگ صاحب چاہتے تھے کہ وہ میٹرک پاس کر کے زمینوں کی دیکھ بھال اور فصلوں کے حساب کتاب میں طاق ہو جائے، لڑکیاں بیاہی جائیں، خود بیگم کے ساتھ جا کر حج کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لیں، ہر طرح سکون رہے، لیکن چھوٹا بیگ میٹرک کی سطح تعلیم سے دنیا کو پرکھنے پر تلا ہوا تھا۔ دو سال برابر فیل ہوتا رہا۔ ان دنوں تعلیم کے معاملے میں نہ سفارش چلتی تھی، نہ رشوت۔ ورنہ اور بڑے بیگ کے پاس کس چیز کی کمی تھی، کسی کو سو پچاس روپے دے دلا کر پاس کرا لیتے۔ سرٹیفکیٹ تو مل جاتا، کون سا نوکری کرانا تھی۔ ایک ذرا تعلیم کا لیبل لگانا تھا۔ اس کے برعکس لوگوں نے کھاتے پیتے گھرانے کا سمجھ کر کئی اور الٹی لتیں ڈال دی تھیں۔ وہ اکثر شہر میں جا کر فلم کے تین تین شو اکٹھے دیکھتا۔ اپنے قصبے میں کبھی تھیٹر یا ٹورنگ ٹاکی آجاتی، تو سارا سارا دن اور آدھی رات وہیں گزار دیتا۔ جی میں شدید خواہش رہتی

کہ تھیٹریکل کمپنی میں ملازمت اختیار کر کے بستی بستی سیر کرتا پھرے، چچل ایکٹرسوں سے جی بھر کر پینگیں

بڑھائے، لیکن اس کی صورت عام سی تھی، چہرے سے ہونق پن ٹپکتا تھا۔

ایک بار تھیٹر والوں نے اسے خیمہ برداروں کی ٹولی میں نوکر رکھنے کی پیش کش کی، مگر بیگ کو پسند آنے کی بجائے غصہ آیا۔ وہ تو شہزادہ سلیم کا رول ادا کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رات گئے جب وہ واپس آتا تو ماں باپ تھوڑی سی بازپرس کے بعد آپس میں تبادلہ خیالات شروع کر دیتے،

دیکھو جی جوان آدمی ہے۔ جوانی میں سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ماں کہتی۔ مرد نہایا دھویا گھوڑا ہے اس کا کیا بگڑتا ہے۔

پھر جوں جوں آوارگی بڑھی۔ میاں بیوی کو تشویش ہوئی۔ ایک ہی بیٹا تھا، ماں باپ نے اس کے ساتھ آئندہ پشتوں کی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ اب لڑکا ہاتھ سے نکلا جاتا تھا۔ رشتہ داروں اور بزرگوں سے مشورہ کیا۔ سب نے متفقہ طور پر کہا۔ شادی کر دو، نسل چل پڑے گی۔ وہ جہاں چاہے پھرتا رہے۔ ایک نہ ایک روز سنبھل جائے گا۔ اس عمر کا تجربہ پھل لائے گا انشا اللہ،

چھوٹے بیگ کو لڑکیوں کو کیا کمی تھی۔ رشتہ دار عزیز اس کی نااہلیوں کے چرچے سننے کے باوجود بیٹیوں کو ہتھیلیوں پر لیے کھڑے تھے۔ دولت مند گھرانہ اکلوتا بیٹا، کس کی خواہش نہیں ہوتی کہ اس کی بیٹی دودھوں نہائے۔ موتیوں تلے، لوگ بہانے بہانے سے پیغامات بھیج رہے تھے، فلاں شخص بیٹی کو بہت جہیز دینے والا ہے۔ اور پھر لڑکی جیسے سورج مکھی کا پھول، میاں کا منہ دیکھ دیکھ کر جیئے گی، دوسرا کہتا ارے واہ جہیز سے کیا ہوتا ہے۔ عورتیں سب ہی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ فلاں آدمی تو جہیز کے علاوہ مکان اور زمینیں بھی لکھ دے گا۔ پشتوں کھاتے رہو۔ چھوٹے بیگ کی بولی بڑھ چڑھ کر لگ رہی تھی۔ لڑکیوں کے والدین کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات

حقیقت بن ک رہ بیٹھی تھی کہ ان کی بیٹیاں شوہر کے بغیر ہرگز نہیں رہ سکتیں۔ ان کے لئے شوہر مہیا کرنا ہے۔ چاہے کتنے مہنگے داموں ملے۔ چوری کریں، ڈاکہ ڈالیں، رشوت لیں یا کسی کو ٹھگ لیں۔ بہر کی فرد کا بندوبست ہونا چاہیئے۔ چھوٹے بیگ کی بہنوں ک وبھی شوہر بھاری قیمت ادا کر کے ملے تھے۔ جانے کتنے مزارعوں، اور کمہاروں کا خون جلا کر بڑے بیگ کی بیٹیوں کے شبستان روشن ہوئے تھے۔

بدا کے دن بڑے بیگ صاحب پگڑی ک یپلو سے آنکھیں پو نچھتے ہوئے بتا رہے تھے کہ بیٹی بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ وہ آزمائش کی نمائش میں خوب پورے اترے۔ پر دل بار بار کہتا تھا، کہ یوں چوری اور سینہ زوری کے مال سے داماد خریدنے کی بجائے سیدھا مردوں کو اغوا کر کے لے آنا چاہیئے۔ ناک پکڑنی ہو تو گھما کر کیوں آئے۔ جھٹ سے پکڑ لو فوراً۔ لوگوں کو پیچ دار راستوں پر چلنے کا لپکا پڑ گیا ہے۔ یہ تجویز انہوں نے بیگم کو بھی سنائی۔ وہ ہنس ہنس کر لوگوں کو سناتی پھر رہی تھی۔ میاں کا دماغ چل گیا ہے۔

لوگ کہتے تھے۔

بڑے بیگ نے یہ بات فقط اس روز سوچی اور کہی تھی۔ کیوں کہ ان کے گھر نقاروں کی چوٹ پر داماد آئے تھے۔ اور لوٹ کر لے گئے تھے۔ اب وہ اپنے بیٹے کی قیم تو صول کرنے کے چکر میں تھے۔ کوئی رشتہ بھی ان کی نظر میں اتنا نہ چڑھتا کہ اتر نہ سکے۔ وہ کچھ پریشان تھے،

خوب سے خوب تر کی تلاش میں لذت ضرور ہے مگر یہ سب کو راس نہیں آتی۔ ان ہی تلاش و جستجو کے دنوں میں **ملک** تقسیم ہو گیا۔ بیگ صاحب گن کندھے پر دھرے ہٹ دھرمی سے کئی روز محصور رہے۔ جب پورا گاؤں خالی ہو گیا۔ اور جاٹ رجمنٹ کے سپاہی چن چن کر مسلمانوں کو دشمنوں کے حوالے کرنے لگے۔ تو بیگ صاحب اپنے بیوی بچوں کو لے کر حویلی کے پچھواڑے، بھوسے، کے کپ، میں

چھپ گئے۔ اگر چہ ہر لحظہ دھڑ کا تھا کہ کوئی بھوسے کو آگ لگا دے گا۔ چھوٹا بیگ مان اور بہن کے ساتھ بیٹھا رہتا۔ اسے باپ باہر جانے دیتا، نہ ماں، جواں مردی دکھانے کے لئے اس کا دل کتنا تڑپتا تھا۔ پر ماں ہر بار راستے میں بانہیں تان دیتی۔

جب وہ کیمپ میں پہنچے، تو ان کے پاس تن کے کپڑوں اور چند زیورات کے سوا کچھ نہ تھا۔

بیگ صاحب کو اس حالت میں دیکھ کر کچھ لوگوں کو رنج ہوا اور بہتوں کو خوشی۔ جوتیوں میں بٹتی دال میں بیگ صاحب بھی حصہ دار تھے۔

جب پاکستان پہنچے تو کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ فاقہ مستی نے رہے سہے حوصلے پست کر چھوڑے۔ انہیں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی عادت نہ تھی۔ اور نہ اتنے ہوشیار تھے کہ وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے۔ بہت دل برداشتہ ہوئے لیکن چھوٹے بیگ صاحب کی قسمت میں کالج کی سیر لکھی تھی۔ اور بڑے بیگ صاحب کی قسمت میں دنیا کی طوطا چشمی دیکھنا۔

نیا ملک، نئے تعلقات، نئے مسائل، بڑے میاں کی ہمت کو آزما رہے تھے۔ کہ برخوردار اچانک میٹرک میں پاس ہو گیا۔ ڈوبتے کو تنکے نے سہارا دیا۔ وہ اسے وکیل بنانا چاہتے تھے۔ تاکہ قانون دان بن کر حق داروں کو ان کے حقوق دلوائے۔ اور اپنے جائیداد کے حصول کے لئے جد وجہد کر سکے۔ ماں نے زیورات فروخت کیے اور کالج میں داخلہ کا بندوبست ہو گیا۔ تھوڑی سی اراضی دریا کے کنارے الاٹ ہو گئی۔ اس میں چھوٹا سا جھونپڑا نما مکان بھی تھا۔ دوستوں رشتہ داروں کو آزما چکنے کے بعد یہ مختصر خاندان اس جگہ رہنے لگا۔ چار آدمیوں کی گزر اوقات کا انتظام ہو گیا۔

شہر دور تھا۔ ہر روز چھوٹے بیگ صاحب بائی سائیکل پر کالج آتا جاتا۔ ناز و نعم میں پلی شہزادوں جیسی جان، چل چل رے نوجوان، گاتی کہاں تک راستے کی صعوبتیں اٹھاتا، جون کی چلچلاتی دھوپ میں بھبھوکا سا چہرہ لیے واپس آتا تو ماں دل

پکڑ کر بیٹھ جاتی اور بہن پنکھے سے ہوا کرنے لگتی۔

ہائے میرا پھول سا بھیا۔

کہاں رہ گئیں وہ کنیزیں اور مہربان۔

ماں اپنے دونوں بچوں کو دیکھ کر رونے لگتی۔ اور پھر وہ شوہر کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی۔ بس سب تمہاری کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔ جیسے یہ سب کچھ بڑے بیگ صاحب کی نااہلیوں اور کم مائیگیوں کی وجہ سے ہوا ہو۔

اصل میں بیگم کا خیال تھا، کہ دونوں بڑی بیٹیاں، عزیز و اقارب شہر میں رہتے ہیں، کیوں نہ ان کے قریب رہا جائے۔ برے بھلے وقت میں ایک دوسرے کے کام تو آسکیں۔ ورنہ رشتہ دار ایک ہی بہانہ ڈال کر کہہ دیتے۔ بارہ پتھر باہر کون جائے۔ ادھر اپنی مصروفیات ہیں کہ صبح سے شام کا پتا نہیں چلتا۔ مسلسل رات کا گمان، ہر آدمی اپنی ذات کے اندر اور باہر اندھیرے میں راہ کھوجتا پھرتا ہے۔

میاں بیوی میں رہائش کے مسئلے پر چپقلش رہتی۔ بڑے بیگ صاحب کی ایک ہی ضد کہ اپنوں سے دور رہنے میں پیار اور خلوص کی سلامتی ہے۔ قرب شکر رنجی کے سوا کچھ نہیں۔ اسی بک بک، جھک جھک، نے چھوٹے بیگ صاحب کے لئے شہر میں رہنے کا میدان ہموار کر دیا۔ وہ اس دوران انٹر پاس کر چکا تھا۔

وہ دن والدین کے لئے کٹھن اور حیرت انگیز تھا۔ جب چھوٹے بیگ نے کہا سردیاں آنے والی ہیں۔ دن خوابوں کی طرح آئیں گے اور چلے جائیں گے۔ تڑکے اٹھ کر جانا بھی مشکل اور واپسی! کسی نے دو تھپڑ لگا کے سائیکل چھین لیا یا رات کے اندھیرے میں سب کچھ ہتھیا کر دریا میں ڈال دیا تو کیا ہوگا۔ لہٰذا اسے ہم جماعتوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے۔ چھوٹے بیگ صاحب کے دو دوست شہر کی کسی گلی میں کمرہ کرایہ پر لے کر رہتے تھے۔

بیگ کی شمولیت کے بعد تینوں اپنے آپ کو مسکیٹرز کہلاتے۔ کبھی کبھی دوسرے

چھوکرے بھی رہائش کے لئے آ جاتے، آزادی کی فضا ج و یہاں میسر تھی ہوسٹل میں کہاں۔اس گھر کا مرکزی فرد غلام رسول تھا۔سلیم دوسرے درجے پر اور بیگ کے درجے بدلتے رہتے تھے۔

سلیم نہایت منحنی صورت کا دبلا پتلا گورا، چٹا لڑکا تھا۔بڑی بڑی مونچھیں اور مردانہ لباس نہ پہنتا،تو دیکھنے والے کو اکھڑ اور نازک چھوکری کا گمان ہوتا۔مگر وہ مرد ہونے کے بھرم کو لباس اور چال ڈھال سے سنبھالے رکھتا۔غلام رسول قدرے بڑی عمر کا اور دیہاتی وضع قطع کا جوان تھا۔شہر میں آ کر اس کو سب سے زیادہ پرکشش اور متاثر کن جگہ چکلہ نظر آئی۔اس کی شامیں اکثر وہاں بسر ہوتیں، پیسے ہوئے تو رات بھی گزار لی۔صبح تھکا ہارا واپس آتا۔بال بکھرے ہوئے آنکھیں اداس اور پتھرائی ہوئی۔غلام رسول کبھی کسی لڑکی کو کمرے میں نہ لاتا، کمرے میں وہ صرف شراب لاتا۔اس کا خیال تھا

یہ دونوں اکٹھی ہو جائیں۔تو ایک سے ضرور توبہ کرنے پڑتی ہے۔شراب کی لت نے اسے ہوسٹل کے کمرے سے محروم کیا تھا۔اور اس نے سلیم کے ساتھ مل کر شہر کے گنجان آباد کوچے میں کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔جانے کیا بات تھی وہ اس تنگ گلی میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتے۔اگرچہ انہیں نہانا یا دوسری ضروریات کے لئے انہیں صابن اٹھائے گلی کے نکڑ والے مکان میں جانا پڑتا تھا۔اس مکان مین انہوں نے لیٹرین، غسل خانہ، پارٹ ٹائم کرایہ پر لے رکھا تھا۔یہاں کبھی کبھی کیو میں بھی کھڑا ہونا پڑتا۔

لیکن غلام رسول اور اس کے دوستوں کو قطعاً ناگوار نہ گزرتا۔ان کی دستک پر اکثر بالکونی سے ایک گورا مکھڑا جھانکتا۔یہ مالک غسل خانہ کی جوان بیٹی مسرت تھی،

بیگ اپنا بوریا بستر اٹھا کر مستقل رہائش کے لئے ان کے پاس اٹھ آیا۔اور پھر بلا ضرورت کئی بار غسل خانہ گیا،تو کہیں بالا خانے میں سے آنے والے پرنالہ کی طرف

سے ایک لمبا جملہ اس کے کان میں پڑا۔

اری مسرت تمہارے کرایہ دار کا پیٹ خراب ہے۔ اسے کوئی دوائی دلوادو۔

بیگ کا کند ذہن اس جملے کے معنی کو کیا سمجھتا

البتہ لڑکی کا نام معلوم ہونے سے اسے اتنی کوشی ہوئی کہ وہ جوش کے مارے فوراً پلٹ آیا۔ اور اپنی دریافت کا اعلان کچھ اس طرح کیا، کہ سلیم کو اپنی کم مائیگی کا احساس ستانے لگا۔ بیگ کئی روز تک اس نام کو ہر چیز، ہر جگہ اور ہر وقت لکھتا رہا۔ مسرت کا خیال عذاب بن کر اس کے اعصاب پر سوار تھا۔ وہ کچھ اداس رہنے لگا۔ بیگ کا ذہن کچھ پختہ ہو چلا تھا۔

غلام رسول نے اس کی اداسی کو بھانپ لیا۔ وہ اسے اس بازار لے جاتا۔ چلتے چلتے وہ ڈومنیوں، ہیجڑون اور دہلیز میں بیٹھی کسبیوں پر آوازے کستے اور لطف اندوز ہوتے۔ ابھی بیگ کو بالا خانے کی سیر کا شوق پیدا نہ ہوا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ وہ تینوں ہاتھوں میں ہار اور گجرے ہلاتے، پان چباتے، تانک جھانک کرتے جا رہے تھے، کہ عین گلی کے بیچ کھڑی بچی روتی کو روتے دیکھ کر بیگ کو فقرہ سوجھا۔

ڈومنی کی بیٹی ہو کر بے سری روتی ہے۔

تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑے، اور داد طلب نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ تھڑے پر بیٹھی عورت شعلہ کی مانند بھڑکی،

یہ ماں پر نہیں، باپ پر گئی ہے۔

اس کی ماں کی آواز میں طنز کی لپک بھی تھی، اور ملال کا دھواں بھی۔

غلام رسول نے مڑ کر دیکھا اور رک گیا۔

عورت کے چہرے پر پاوڈر کی تہہ یوں چڑھی تھی جیسے بجھتی چنگاری کی راکھ۔

سلیم کھسیانہ سا ہو کر بولا منہ تو دیکھو ماں کا۔

غلام رسول نے کس کر سلیم کے منہ پر تھپڑ مارا، اور کہا حرامی! یہ ماں نہیں، تو جا باپ کو ڈھونڈ لا۔

پھر وہ وہیں رک گیا۔ جانے وہ اس عورت سے بچی کے باپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا یا.....

بیگ اور سلیم چل دیئے، سلیم سوچ رہا تھا، کہ وہ آج ہی غلام رسول کے باپ کو تفصیلی خط لکھے گا، پھنے خاں کہیں کا،

کمرے میں آ کر وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنے اپنے راز کہنے لگے۔ بیگ نے سلیم کو بتایا کہ وہ غسل خانے کے مالک کی بیٹی پر بری طرح فریفتہ ہے کیا کرے؟ خط لکھو

سلیم نے فوراً مشورہ دیا۔ اور ہدایات بھی۔ کہا کہ کچھ اس انداز سے لکھو کہ خط لکھنے والے کی جنس کا پتا نہ چل سکے۔؟۔ جواب آیا تو سمجھو سلسلہ چل نکلا۔ نہ آیا تو اگلا گر بتایا جائے گا۔

بیگ نے سلیم کے پاؤں پکڑ لیے کہ آج سے تم میرے پیر و مرشد ہو۔ جذبات کی شدت سے بیگ کا چہرہ سرخ تھا۔ آنکھوں سے لہو کی گردش چھلکتی تھی، اس لئے اپنی ٹھوڑی سلیم کے گھٹنوں پر رکھ کر یوں دیکھا جیسے اس کے سامنے سلیم نہیں مسرت بیٹھی ہے۔

پھر دونوں نے مل کر محبت بھرا طویل خط لکھا۔ اس وقت سلیم کے حافظے میں غلام رسول کے باپ کو اطلاع دینے کا کہیں خیال تک نہ تھا۔ صبح کے ناشتے کے وقت وہ تینوں خوش و خرم تھے۔ غلام رسول بیگ کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا۔

شاباش، عالم پناہ، داتا ہو، دھنی ہو۔

بیگ اپنی سادگی سے لوگوں کی ہمدردیاں اور قرب حاصل کر لیتا تھا۔ ہوٹل یا دودھ دہی والے کے ساتھ حساب رکھنے کے لئے دوست اسے آگے کر دیتے تھے۔

دوکان دار اس پر بھروسہ کرتے تھے اس لئے کہ وہ سادہ لوح تھا۔ مکاری کی اس سے امید ہی نہ ہوسکتی تھی۔ لیکن بیگ تین آدمیوں کے ایک سو روپے میں انڈے۔ ٹوسٹ، مکھن، مرغ، گوشت کھلواتا۔ اور ہوٹل والے کی آنکھوں میں دھول جھونکتا۔ حساب کی کاپی میں اندراج کر کے ہوٹل والے کو دکھاتا۔ اور دوسرے دن کا حساب لکھتے ہوئے باقی دنوں کے حساب میں ہیرا پھیری کر دیتا۔ ربڑ والی پنسل کو وہ خود سے کبھی جدا نہ ہونے دیتا۔

مسرت کی طرف سے خط کا جواب جلدی آ گیا۔ لکھا تھا جیسے بھی ہو سکے مجھے ملو، مجھے بلاؤ یا خود چلے آؤ۔

یہ خط سب میں پڑھا گیا، اور تجویز ہوئی کہ باقی دوست رات کہیں بھی بسر کریں۔ بیگ کمرے میں رہے گا۔ مسرت کو اطلاع کر دی گئی۔

آج ہی ملو۔ برے کام میں صبر کہاں۔ رات کے دو ہی بجے تھے کہ سلیم اور غلام رسول لوٹ آئے۔ خیال تھا مطلع صاف ہو چکا ہو گا۔ غلام رسول نے دروازے پر ہاتھ مارا۔ وہ کھل گیا۔ اندھیرے کمرے میں کوئی بھی سرگوشی نہ ہوئی۔

کوئی ہے۔ بیگ، بیگ، مرزا عزت اللہ بیگ''

وہ اندر داخل ہو کر آوازیں دینے لگے۔ سلیم نے بتی جلانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ سوئچ بورڈ اپنی جگہ موجود نہ تھا۔

غلام رسول ماچس جلاؤ۔ وہ چیخا۔۔

ماچس کی دھندلی روشنی مین انہوں نے دیکھا، کہ دیوار کے ساتھ بیگ کی لاش پڑی ہے۔ بجلی کی تاریں اس کے بدن کے گرد لپٹی ہیں۔

موم بتی روشن کر کے بیگ کو ابتدائی طبی امداد پہنچائی گئی، تو وہ جی اٹھا۔ اس کے ہوش میں آتے ہی پہلا سوال سلیم نے کیا، کیا یہ قتل کی سازش تھی۔ بیگ نے نفی میں سر ہلایا۔

امیدوار وعدہ دیدار مر چلے۔

وہ آئی تھی۔ بیگ نے ان کے اطمینان کے لئے آواز نکالی۔

مزے ہو گئے پھر تو، سلیم چٹخارہ لیتے ہوئے بولا۔

لعنت ہے تم پر، غلام رسول بڑا بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ آئی تھی، پر تھوک کر بھاگ گئی۔ میں پکڑتا رہ گیا۔ اور میں نے سوچا، کہ ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔

بڑا چنچل معشوق ہے۔ سلیم نے مذاق اڑایا۔

بیگ قطعی شرمندہ نہ تھا۔ البتہ زرد رو اور کمزور دکھائی دیتا تھا۔ شعر پڑھتے اور حادثہ سے لطف اندوز ہوتے صبح ہو گئی۔ وہ خوف زدہ بھی تھے کہ دھر لیے جاتے تو کیا ہوتا، پولیس والے ذلیل کرتے۔ اتنا ہو کے رہا کہ مالک مکان نے کمرہ خالی کرنے کا الٹی میٹم دے دیا۔

اب جو مکان ملا۔ وہ کچی بستی میں گندے نالے کے پاس تھا، اس آبادی میں کوئی سفید پوش گھرانہ نہ تھا۔ تینوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ یہاں کسی ذہنی الجھن میں مبتلا ہونے کے امکانات کم سے کم تھے، عورتیں منہ کھولے کام کاج کرتی نظر آتیں، ان میں کوئی دل کشی نہ تھی، ہاں ان کی نظریں ان فیشن ایبل جوانوں کا تعاقب دور تک کرتیں، اور ان کو یوں محسوس ہوتا کہ وہ تینوں امیر ہیں۔ بہت خوبصورت ہیں۔ کوئی ان کے پاؤں تک آ نہیں سکتا۔

لیکن بیگ کو بینو چماری اور جوان جذبات سے آگئی کا خیال یاد آیا۔ اس آگئی سے اس کا بدن تپا تپا رہتا، اور اسے یوں لگتا، جیسے وہ نہایت لطیف بھاپ ہے۔ کہ فضا میں تیرتا پھرتا ہے۔ اور اب وہ جوہڑ کے گدلے پانی کی مانند ہو گیا ہے، کہ اس میں کوئی عکس نمایاں نہیں ہوتا۔

وہ ایک ایک کر کے اپنے گھروں سے گرہستی کی چیزیں اٹھا لائے، اور باقاعدہ

رہائش اختیار کی، تینوں اپنے آپ کو بہت سخی اور دیالو ظاہر کرتے۔ اور امتحانات قریب تھے، گرمیوں کی مجلس راتیں، غلام رسول قمیض اتارے، دھوتی لنگوٹا کسے لیمپ کے سامنے اونگھ رہا تھا۔ اور سلیم کتاب میں سے کچھ نقل کر رہا تھا، کہ بیگ وارد ہوا، اس نے آتے ہی غلام رسول کے ننگے بدن پر چپت لگاتے ہوئے کہا،

میں بقائم ہوش وحواس اعلان کرتا ہوں.....

کہ میں خودکشی کر رہا ہوں،،،، سلیم نے فقرہ مکمل کیا۔ میں امتحان نہیں دوں گا۔

..... بیگ منمنایا۔

کیوں؟..... دونوں ایک ساتھ چلائے

اس لئے کہ میری ہونے والی بیوی باہر کھڑی انتظار کر رہی ہے۔ کہ تم دونوں کھسکو،

سلیم کا منہ حیرت سے کھلا تھا، اور غلام رسول حسب عادت گالیاں دے رہا تھا،

اس ماں کو کھلاؤ گے کہاں سے، اور تمہیں یقین ہے کہ وہ۔

''ہاں میں جانتا ہوں کہ وہ بڑی پاک ہے۔ بیگ نے سینہ پھلا کر بتایا۔ میں اس سے شادی کرلوں گا،، نوکری کرلوں گا۔

غلام رسول کو نہ جانے کیوں ترس آ گیا۔ تھوڑی سی پس وپیش کے بعد عورت کو گھر میں رکھ لیا گیا، تینوں اس کی موجودگی میں عجیب سی آسودگی محسوس کرتے تھے، جیسے گھر میں صرف اس کی کمی تھی، باورچی خانے میں بیٹھی کتنی اچھی لگتی تھی، بیگ اس کو حمیدہ، حمیدہ کہتا ہوا پاگل ہوا جاتا تھا۔

ہائے تم کتنی اچھی عورت ہو،

مجھے گھر مل گیا۔ وہ ہولے سے جواب دیتی۔

انہی دنوں کسی نے بیگ کے باپ سے مخبری کر دی۔ وہ جوتا اٹھائے چلے آئے۔ آتے ہی گھر سر پر اٹھالیا۔

میں تجھے جائیداد سے عاق کر رہا ہوں۔ بدرو میں نے کیڑا پکڑ لیا، اور کہتا ہے مچھلی ہے۔ گندے، گندے، تو نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔ مجھے تو تمہارے تخم پر شک ہونے لگا ہے۔ حرامی،

دو چار دو ہتڑ بیگ کی کمر پر مارے، اور پاگلوں کی طرح دہاڑتے باہر نکل گئے۔ انہیں بیٹے نے مایوس کیا تھا۔

اس جنگ سے فارغ ہو کر سلیم اور غلام رسول مطالعہ میں مصروف ہو گئے، بیگ کہیں باہر گیا تو رات گئے واپس آیا۔ اس سے کسی نے بات نہیں کی کہ دل برداشتہ تھا۔ حمیدہ کی سسکیاں رات بھر سنائی دیتی رہیں۔ صبح سلیم ناشتے کے لیئے جگانے گیا، تو بیگ کو نیند میں مدہوش پایا۔ حمیدہ پاس بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ سلیم نے تفنن طبع کے طور پر چند آوازیں دیں، اور جھنجھوڑا، مٹھی میں دبا ہوا کاغذ کا پرزہ گرا۔ سلیم کا ماتھا ٹھنکا۔ لکھا تھا۔

.....دنیا والو، الوداع۔ میں اپنی مرضی سے مر رہا ہوں۔ کیوں کہ اک جان ہے میری، باقی سب تم لوگوں

نے ہتھیا لیا۔ حمیدہ جو بیوی بننے سے پہلے بیوہ ہو گئی۔ اس کا خیال رکھنا، واسطہ ہے خدا کا۔

دو چار طمانچے رسید کیے تو وہ جاگ اٹھا، آنکھیں بے نور، پتلیاں پھیلی ہوئیں، پاگلوں کی طرح تکتا تھا۔ حمیدہ صبح سے شام تک اس کی خدمت میں رہی، پھر جانے کیسے غائب ہو گئی۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کا خاوند دھندا کرواتا ہے۔ اور کہیں شریفوں کے محلے میں غیرت مندوں کی طرح رہتا ہے۔ حمیدہ کے اچانک جانے سے بیگ کی عقل کو نیا تازیانہ لگا۔ اور وہ دل کے معاملے میں قدرے سنبھل گیا۔ بیگ سنبھلا تو سلیم کے خانہ دل میں کوئی آن بسا۔ بیگ نے اس کا پورا ساتھ دیا۔ غلام رسول ڈانٹ دیتا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے اپنے آپ کو ترقی پزیر ثابت کر

نے کی کوشش کرتا۔ اس کا خیال تھا عشق غم کا ابال ہے۔ اس کے آمیزے میں لالچ اور خودغرضی شامل ہے۔ بس ذات کے اظہار کا نام کہہ لو۔

بعض لوگ کسی ٹیلے پر چڑھ کر اظہار کرنا پسند کرتے ہیں۔ اور بعض مرغ کی مانند کوڑے کے ڈھیر پر کھڑے ہو کر اذانیں دیتے ہیں۔ سلیم ٹیلے پر چڑھنا چاہتا تھا، مگر کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔

وہ دوستوں کے نام طویل خط لکھتا، اور فرض کر لیتا، کہ اپنی محبوبہ کو دکھڑے سنا رہا ہوں، یہی وجہ تھی کہ دوست اس کے دم سے دم دیتے تھے۔ لیکن ان کی آزمائش کا موقع قدرت نے اس وقت فراہم کیا۔ جب ایک امیر زادی خود ہی اپنے ہم جماعتوں کو پیار سے دیکھنے لگی۔ بیگ نے سلیم کی طرف پریم کی ڈور ڈال دی، وہ اپنے آپ کو لڑکیوں سے تعلقات قائم کرنے میں خود کو ماہر خیال کرتا تھا۔ موقع پا کر لائبریری میں فیروزہ کے پاس جا بیٹھا۔ اور نہایت یتیمانہ لہجے میں کہنے لگا۔

مس فیروزہ آپ کے پاس فلاں کتاب ہے۔ میرے دوست سلیم کو اشد ضرورت ہے۔ وہ بے چارہ کتاب خرید نہیں سکتا،

سلیم کے نام پر فیروز کے دل میں عجیب نازک سے جذبات جاگ اٹھے، جن میں مامتا، ہمدردی اور رحم کا عنصر زیادہ شامل تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ کمزور صورت سلیم یتیم ہے۔ اور اس کی خالت اس کا چچا کرتا ہے۔

ایک آدھ دن غور کرنے کے بعد فیروزہ نے سلیم کو کتاب بھجوا دی۔ سلیم وفور شوق میں بیگ کو شریک راز بنانے لگا، تو وہ شبعدہ بازوں کی طرح مسکرانے لگا۔

تمہیں معلوم جو ہم جانتے ہیں۔

بیگ کبھی کبھی ظل سبحانی شہنشاہ کی طرح گفتگو کرنے کے موڈ میں ہوتا، ایسے وقت مین کسی قریب کے پودے سے پھول یا پتا توڑ کر انگوٹھی اور شہادت کی انگلی میں تھام لیتا، اور بے اعتنائی سے گھماتے ہوئے یوں ناک کے قریب لے آتا گویا وہ سچ

مچ کا مغل شہزادہ ہو۔ اور بچول کی نزاکت تک اس کے خیال کی جولانی میں مانع ہو، وہ لوگ جو اسے نہیں جانتے تھے سانس روک لیتے۔ جیسے کوئی راز افشا ہونے والا ہے۔ لیکن یار لوگ پھول نوچ کر دور پھینک دیتے۔ چھوڑو آپے میں آجاؤ،

سلیم اس کے کارنامے کی داد دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

آج سے تم بھی گرو، میں تیرا گرو اور تو میرا۔

بیگ ایم، اے فائنل کے امتحان سے فارغ ہو کر بھی گھر نہ گیا۔ باپ اس کا پتا کرنے آتا تو وہ بہانے سے سرک جاتا، جولائی کا مہینہ گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، کمرے میں محفل جمی ہوئی تھی، معمولی شکل وصورت کی دو لڑکیاں اور ایک مرد بیگ پر تکیہ کیے بیٹھے تھے، کہ وہ جلد سے جلد انہیں فلم میں کام دلوائے۔ بیگ نے کچھ دنوں سے اپنے آپ کو انڈسٹری والا کہنا شروع کر دیا تھا۔ سو آج وہ لڑکیاں اپنے (Talents) ٹیسٹ کروانے چلی آئی تھیں۔ قدرے کم عمر لڑکی آواز اٹھاتی، شرما جاتی۔ بیگ ٹین کے بیچ پر تال دیتا۔ ڈسٹرب ہو کر گھر کی لگاتا۔

یوں کام نہ چلے گا، انڈسٹری تو حمام ہے حمام۔ شرم کرو گی تو دولت میں کیسے نہاؤ گی۔

چھوٹی کا منہ شرم سے سرخ ہو گیا، اور اس نے ایسی بھیگی نگاہ سے بیگ کو دیکھا کہ اسے پسینے میں کپکپی چھڑ گئی، بڑی بہن نے دبی دبی آواز میں اپنے ساتھی مرد سے کہا، ہمیں تو بھوک لگی ہے۔

بیگ اٹھا، اور سلیم کا بیف کیس کھول کر دس کا نوٹ نکال لایا۔ اور اس معدکو یوں حکم دیا جیسے سفت اقلیم بخش رہا ہو۔ جاؤ کھانا بازار سے آئے گا۔ آؤ فریدہ میں تمہیں پریکٹس دوں،

تم ملے پیا ملا، اب کوئی ارمان نہیں۔

فریدہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ بڑی بہن نے ایک گھونسہ کمر میں دیا اور کہا،

بیگ صاحب برا نہ مانیے بچی ہے،

بازار سے نان کباب آئے اور وہ لوگ کئی دن سے بھوکوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے۔

بیگ نے ان داتا کے سے مان کے ساتھ دو لقمے اٹھائے۔ اور فریدہ کے کندھے پر کہنی رکھ دی۔ بڑی کا ہاتھ منہ تک جاتے جاتے رک گیا۔ باہر کوئی دروازے پر کھڑا، دھڑ دھڑ پٹ بجا رہا تھا۔

آجاؤ، بیگ نے شاہوں کی سی بے نیازی کے ساتھ حکم دیا۔ غلام رسول ہراساں دکھائی دیتا تھا۔

بڑے بیگ صاحب باہر کھڑے ہیں۔ چھوٹے بیگ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ غڑاپ پلنگ کے نیچے گھس گیا۔ اور چادر نیچی کھینچ لی، بڑے میاں دو بے باک لڑکیوں کو بے تکلفانہ بیٹھے دیکھ کر ٹھٹھکے۔ پھر غلام رسول پر قہر کی نظریں برسیں۔ کہاں ہے وہ خبیث؟

وہ بمشکل تمام فقرہ مکمل کر پائے تھے کہ غلام رسول نے صفائی پیش کی۔ یہ میری بہنیں ہیں، اور یہ میرا بھائی ہے، اور چھوٹے بیگ صاحب تو ادھر آتے ہی کبھی کبھی ہیں۔

کہاں رہتا ہے وہ؟

قریب تھا وہ اپنی چھڑی سے غلام رسول کی مرمت کر دیتے۔

جی ہمیں نہیں معلوم، غلام رسول کی آواز میں گھبراہٹ تھی، بیگ صاحب چھڑی فرش پر پٹختے، کرسی پر گر سے گئے۔ بیٹے کو اتنی گالیاں دیں کہ الامان۔ گزشتہ اور آنے والی پشتوں تک کی عورتوں کو یاد کیا گیا۔ انہیں غلام رسول کی بہنوں تک کا بھی کوئی خیال نہ تھا۔

دیکھ بھئی غلام رسول اس کنجر خانے کا اصل انچارج تو ہے۔ وہ پلنگ پر چھڑیاں

برساتے ہوئے کہہ رہے تھے، بڑے میاں نے پہلو بدلا، لگتا ہے یہ میری اولاد ہی نہیں،

رنج سے بڑے بیگ کا چہرہ لٹک گیا۔ غلام رسول کسی سوچ میں ڈوبا ہوا ابھرا۔

قبلہ صاحب آپ کا بیٹا بعینہ ویسا ہی ہے، جیسا آپ فرماتے ہیں۔

بڑی بیگ صاحب کی گالیوں میں بہتا پرنالہ یک بارگی رک گیا۔ وہ دروازے کی طرف سرکتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ پولیس سے کہوں گا چھاپہ مارے،

ان کے جاتے ہی چھوٹا بیگ کپڑے جھاڑتے ہوا برآمد ہوا، اسے غصہ تھا، نہ ملال بلکہ نہایت ڈھٹائی سے قہقہے لگا رہا تھا۔

شام ہونے والی تھی مانجھی بصد منت بیڑی دریا پر اتارنے پر رضامند ہوا، منجدھار میں پہنچ کر چھوٹے بیگ نے اچانک سکوت توڑا،

بہت بہت شکریہ مانجھی، یہ لو چار روپے اور خدا حافظ۔

پھر وہ فضا میں باہیں اچھال کر چیخا، خدا حافظ اے دنیا والو۔ ہم نامراد جاتے ہیں۔

مانجھی ایک ہاتھ سے چپو سنبھالے، دوسرے ہاتھ سے بیگ کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اور کشتی ڈگمگ ڈولتی، ہر دم الٹ جانے کا خطرہ،

چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو۔ میں مرجانا چاہتا ہوں۔

کنارے پر کھڑے لوگوں نے آوازیں سنیں، اور سرما کی سانولی شام نے ایک کشتی کو الٹتے دیکھا۔ جو تیرنا جانتے تھے۔ وہ کود پڑے۔ اس بار بیگ پھر بچ گیا۔ لیکن پولیس کے ہاتھوں سے نہ بچ سکا۔ اب تک اس کے جرم دوستوں کی مہربانیوں نے پردہ راز میں رکھے ہوئے تھے، اس میں سربازار موت کو گلے لگانے کا حوصلہ نہ تھا۔ کچھ فریدہ بی کا عشق ہی ایسا زوردار تھا، کہ بیگ لہروں کے سینے پر دھاڑا،

مرتے ہیں، بس مرتے ہیں۔

کیس عدالت میں گیا، چشم دید گواہ بیگ کے کیا لگتے تھے، جو اس کی خاطر جھوٹ بولتے۔ نہ ہی اس کے پاس پیسے تھے کہ گواہ خرید سکتا، لواحقین میں سے کوئی بھی پیروی کرنے نہ آیا، دوست بھی کہیں کان لپیٹ کر نکل گئے، بڑے بیگ کو بیٹے کی قید کے صدمے نے مزید بوڑھا کر دیا، وہ کہتے تھے، نہیں چھڑاؤں گا۔ تجربہ ہونے دو دھکے کھا کر انسان بن جائے گا۔

ماں سوچتی تھی کہ شادی سارے دکھوں کا علاج ہے۔ اس کی بیماری عورت ہے۔ کوئی بھی ہو بھاگوان، اس کا چکراتا ہوا سر تھام کر کلیجے سے لگا لے۔ سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ اب چونکہ حالات پہلے کے سے نہ تھے، اس لئے لوگ ان کے ساتھ رشتہ جوڑنے میں ہچکچا رہے تھے۔ بیگ کے جیل جانے سے لٹیا بالکل ہی ڈوب گئی۔ سیدھی چڑھی، الٹے پاؤں لوٹا دی گئی۔

بی بی کس کی بات کرتی ہو؟

وہ آوارا، نکٹھو، سب کچھ مشہور ہو گیا۔

حالانکہ وہ آوارا ہرگز نہ تھا۔ اسے گھر میں والدین اور بہنوں کی طرف سے جو خلوص ملا۔ اسے اسمیں کوئی گہرائی اور گیرائی نظر نہ آئی۔ وہ کسی سے ٹوٹ کر پیار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی بھی محبوب اسے اتنی مہلت نہ دیتا۔ کہ وہ اپنی ذات کو عشق کی آگ سے بھسم کر سکے، اس کی ذرا سی پیش قدمی سے دوسرا فریق راہ فرار اختیار کر لیتا۔ بیگ محبت کے معاملے میں بڑا بدنصیب تھا۔

قید کے دنوں میں اسے اپنے ماضی اور طرز عمل پر غور کرنے کی فرصت ملی، گزرا ہوا وقت ناکامیوں کے نشانات چھوڑتا گیا۔ عمر کے آٹھائیس برس پورے ہو چکے تھے۔ مقدمے لڑتے لڑتے باپ کی کمر جھک گئی تھی، ماں کی صحت بگڑ چکی تھی، اور چھوٹی بہن کی تمام تازہ دم رنگت پر وقت کے سایے پڑنے لگتے تھے۔ اس نے اپنے

کردار کا محاسبہ کیا تو دل ڈوبنے لگا۔ وہ زندگی گزارنے میں کس قدر ناکام رہا تھا۔ بس اب کہ وہ ماں کے کہنے پر شادی کر لے گا، اسے اپنے انتخاب پر اعتماد نہ رہا تھا، اب وہ دنیا کے ہاتھوں کٹھ پتلی نہ بنے گا۔ وہ دنیا جو نہ پیار کرنے دیتی ہے اور نہ مرنے۔ اصل میں موت اور پیار دونوں اس کے بس میں نہ تھے۔ اس کے شب و روز آسودگی میں گزرتے، وہ کشمکش کی درد آمیز لذت سے محروم تھا۔ جہاں کہیں ایسے حالات ہوتے، وہ جھنجھلا اٹھتا

دکھ سے لطف اندوز ہونے کے لئے ذہن کی تربیت ہونی چاہیئے۔ بیگ کو یہ تربیت نصیب نہ ہوئی تھی۔

باپ کے ساتھ وہ سخت ناراض تھا، کہ اس کی رہائی کے لئے انہوں نے چنداں کوشش نہ کی تھی، بڑے بیگ صاحب کہتے تھے، اچھا ہے جتنے دن اندر رہے، کم از کم یہ یقین تو ہے کہ منہ کالا نہیں کرتا پھرتا۔ وہ اس سے ملاقات کرنے بھی نہ آئے، ماں اور بہنیں ایک دو بار چوری چھپے مل گئی تھیں۔ ماں کی آنکھوں میں محبت کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جیل کے سینٹری کی مدد سے کھانے کی کئی چیزیں گزار لائی تھی، وہ ماں جسے وہ سیدھی سادی سمجھتا تھا۔ کیسی ہوشیار اور حوصلہ مند ثابت ہوئی، کہ بڑے بیگ کو ملاقات کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی، بیگ یہ سب کچھ سوچتا ماں کے پاس بیٹھا تاسف کے آنسو بہاتا رہا، وہ قید ہونے سے کئی ماہ پہلے گھر نہیں گیا تھا، شاید اسے ماں کی ممتا کے اندھے پن سے چڑ تھی، کہ وہ بیٹے کی خوشنودی کی خاطر بعض اوقات شوہر کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتی۔ یا پھر ذمہ داریوں کا منفی احساس، کہ بیگ میں فرار کی صورت میں نمایاں تھا، ماں کے پاؤں پکڑ کر وہ بالکل پگھل گیا۔ ماں مجھے معاف کر دو۔ میں اب اچھا بننے کی کوشش کروں گا۔ میں نے دنیا کی سیاست کو سمجھ لیا ہے۔ یہ بڑی چالاک اور چاتر ہے۔

دو ماہ کی قید کاٹ چکنے کے بعد جب وہ گھر آیا تو

والدین نے اس کے لئے ایک لڑکی بطور بیوی چن چکے تھے، کلیم کا ایک حصہ فروخت کر کے روپے کا بندوبست کیا گیا تھا، زیور، سامان، سب کچھ اس کی شان کا تھا۔ کہ بڑے بیگ صاحب کو اپنی روایتی شان وشوکت کا گمان ایک بار پھر ہوا۔ ایک بار پھر انہیں محسوس ہوا کہ وہ لوگ معمولی نہیں۔ پرانے جاگیردار ہیں۔ شاہ خرچ اور شاہ دل ہیں۔

شادی ہوئی اور خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ بیگ چند دن اپنی خوشیوں میں گم رہا، کوئی پوچھتا تو مختصر جواب دیتا۔ اصل عشق تو بیوی کے ساتھ ہوتا ہے۔ باقی سب بکواس ہے۔

بیگ نے عشق کے اس زیور کے استعمال میں احتیاط اور استقلال نہیں برتا، جب ملمع اتر گیا تو وہ ایک بار پھر اصلیت کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ ماں کو بدگمانی تھی کہ بیوی کا ہو کے رہ گیا ہے۔ بہن کو شکایت کہ بھابھی ہر وقت پلنگ پر چڑھی بیٹھی ہے۔ گھر کے دھندے میں ہاتھ نہیں بٹاتی، بہو اپنی جگہ سچی کہ میاں کو مقدور بھر خوش کر لے تو پھر دوسرے لوگوں کا حال چال پوچھے۔ اور اپنا بتائے۔ ہر وقت گھر میں مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ

رہنے لگی، نکھٹو چھوٹا بیگ، اڑنے کے لئے پر تول رہا تھا،

بے وقوف جاہل عورت کے ساتھ میرا گزارا، ناممکن ہے۔ ماں نے گواہی دی کہ لڑکی جاہل ہونے کے ساتھ ساتھ بانجھ بھی ہے۔ بڑے بیگ صاحب کہتے تھے کہ سوت لانا پسندیدہ فعل ہے۔ اور ہماری نسل کا انحصار عزت اللہ بیگ پر ہے۔

بیگ کی شادی ایک چھوٹے سے واقعہ کی طرح وقوع پزیر ہوئی اور ختم بھی ہو گئی، بڑے بیگ صاحب کو روپے پیسے کے ضیاع کا قطعی ملال نہ تھا۔ بڑے لوگ بڑے نقصان ان کا معقولہ تھا۔

چھوٹے بیگ کا خیال تھا کہ اب وہ عورت کے چکر میں نہیں پڑے گا۔ ذہنی اور

عملی طور پر اپنے آپ کو علم کے حوالے کر دے گا۔ ایم، اے، سیاسیات کرتے ہوئے یونیورسٹی کی سطح پر سیاست کی مشق کرے گا۔ بعد میں ملکی معاملات میں حصہ لے گا،

اب وہ لیڈروں اور سیاست دانوں پر برملا تنقید کرتا،

طالب علموں کے جمعے لگا کر انٹ شنٹ تقریریں کرتا، سیاست اس کے لئے بہر حال بہتر تھی، کہ وہ کچھ دماغ سے کام لینے کے بارے میں سوچ رہا تھا،

الیکشن کے دنوں مین وہ اپنے نام کی خود ہی کنوینگ کرتا پھرتا، یا پھر اس کے ساتھ وہ لڑکے تھ یجو پیسے لے کر کام کرتے ہیں۔ وہ اس کے نام کے پلے کارڈ اٹھائے پھرتے اور پروپیگنڈہ کرتے، مگر جب الکیشن کے نتائج نکلے تو بیگ پانچ ووٹ لے کرنا کام ہو گیا۔ یہ پانچ ووٹ رابعہ اور اس کی چند دوستوں نے ڈالے تھے، رابعہ بیگ کی کلاسفیلو تھی اور وہ اسے بہن کہہ کر پکارتا تھا۔ بہن نے حتی الوسع مدد کی، وہ لڑکیوں سے کہتی تھی کہ یونیورسٹی میں ایک ہی لڑکا کام کا ہے۔ باقی ساری یونیورسٹی تو عاشقوں سے پٹی پڑی ہے۔

بیگ کو اس ناکامی پر اپنے پرانے دوست بہت یاد آئے۔ جو جائز اور ناجائز میں اس کے ساتھ خلوص برتتے تھے۔ اب یہاں نئی پود آئی تھی، ایک سال میں زمانہ بدل گیا تھا،

سلیم کو شہر سے باہر ملازمت مل گئی اور وہ امیر زادی کے خیال کو چھوڑ چھاڑ رزق کی تلاش میں

بھاگ گیا۔ غلام رسول ایم، اے، کے بعد گاؤں میں زمینوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ اور اسی دوران اس کی شادی بھی ہو گئی۔ بیگ اکیلا تھا، اور بے کار، وہ انہیں خط لکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا، برے وقتوں میں اچھے دوست یاد آتے ہیں۔

ادھر رابعہ کے خلوص میں اسے پیار کی خوشبو آئی، وہ اس الجھن مین تھا کہ رابعہ

کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرے یا نہ کرے، پھر اس نے سلیم کو لکھا کہ معاملہ دگرگوں ہے۔ دوڑو، مدد چاہیئے۔

رابعہ کسی مفضل علاقے میں رہنے والی تھی، ادیب عالم، منشی فاضل اور جانے کیا کیا فاضل تھی۔ اب باقاعدہ طالب علم بن کر ڈگری لینا چاہتی تھی، رنگت کھلتی ہوئی، نقوش اچھے ہوتے تو اپنا ثانی نہ رکھتی، اتنی بات ضرور تھی کہ بیگ کی سابقہ محبوباؤں سے بہتر تھی۔ بیوی کے ساتھ گم ہوک رپیار کرنے کی صورت میں بھی وہ اسے محبوباؤں کی فہرست میں شامل نہ کر سکا تھا۔ حالانکہ وہ قبول صورت تھی، محبوب کے تصور کے ساتھ محرومی اور مہجوری کا خیال اسے حسین تر بنا دیتا ہے۔ اصل میں فاصلہ حسن ہے۔ فاصلہ عشق ہے۔ اور فاصلہ ہی خدا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاہنے والا محبوب کے سامنے یوں جھکتا ہے، جیسے معبود کے سامنے۔

رابعہ بی بی کے لئے بیگ کے دل میں جو کونا تھا۔ اس کی خبر شاید بیگ کو بھی نہ تھی۔ یہ کونسا کوئی راج سنگھاسن تھا، کہ صرف رابعہ ہی اس پر متمکن تھی، شریف گھرانے کی شریف النفس لڑکی، اس بار بیگ کو محسوس ہوا کہ عشق تو کرب ہے۔ لذت میں ڈوب اہوا۔ اس میں مسرت کم سے کم ہے۔ رابعہ کے خیال نے اسے شاعر بنا دیا۔

رابعہ کی یاد میں اس کی تنہائیاں ایسے آباد تھیں، جیسے بھیگی رات میں جگنو، بیگ کی عمر کی مٹی کو کئی بار برساتوں نے بھگو دیا تھا۔ بڑے بیگ صاحب کو کلیم کے کچھ اور حصے مل گئے تھے۔

وہ شہر میں پختہ مکان بنا کر باقاعدہ زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اب انہیں بیٹے پر مکمل اعتماد تھا، جب سے اس نے کلثوم کو طلاق دی تھی وہ اس کی دور اندیشی کے قائل ہو گئے تھے۔ اور اب تو بیگ

خانگی معاملات میں پوری طرح دخیل تھا۔ وہ باپ کو مشورے دیتا کہ چھوٹی

بہن کے فرض سے فارغ ہو کر وہ اپنے بارے میں سوچے گا۔

جن دنوں وہ یونیورسٹی الیکشن میں حصہ لے رہا تھا۔

بڑے میاں نے جی بھر کر ناز اٹھائے تھے، وہ بیٹے کی سیاست دانی سے بہت خوش تھے۔ کم از کم مردوں والا کھیل تو تھا۔

شہر میں الاٹ شدہ رقبہ پر ساٹھ کمروں کا محل بنانے کا پروگرام بیگ کی عین خواہش تھی، جس مین جدید فن تعمیر کے ساتھ ساتھ غلام گردشیں بھی ہوں

سنگ مرمر کا تالاب اس لئے ضروری تھا، کہ اس کے کنارے رابعہ بھی نور جہاں کے طرح چہل قدمی کر سکے، نقشہ منظور ہو گیا۔ مٹھائی تقسیم کی گئی، بکرے ذبح کر کے بنیادیں کھودی گئیں۔

چند دنوں کے اندر اندر احاطہ کی دیوار کھنچ گئی۔

گیٹ لگا دیا گیا۔ نام کے پتھر پر لکھا تھا۔

رابعہ منزل''

وہ اس پتھر پر ہاتھ رکھے کسی سے تصویر کھنچوا رہا تھا۔ کہ بڑے میاں اچانک آ پہنچے۔ پتھر پر نظر کیا گئی۔ کہ پٹرول میں جلتی تیلی گری۔ راجوں مزدوروں کے سامنے ایک زناٹے کا تھپڑ بیگ کے منہ پر پڑا۔

''رابعہ کون ہے کنجرا''

اس واقعہ کے بعد جس نئے نظام کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ وہ درہم برہم ہو گیا۔ بیگ پھر گھر سے نکل گیا۔ ماں بیٹے کا انتظار کرتے کرتے چل بسی۔ اور رابعہ شادی کے بعد دو بچوں کی ماں بن گئی۔

بیگ سلیم کے کمرے میں کھڑی چارپائی پر لیٹا بڑبڑا رہا تھا۔ میں تمہارا ہوں صرف تمہارا،، سلمٰی کی بچی۔ اور سلمٰی کی پاس پورٹ سائز تصویر اس کے پہلو میں دبی خاموش تھی۔ تمہارا ہوں تمہارا خدا کی قسم۔

اب سلمیٰ اس کی محبوبہ تھی اسکے نہ ملنے کی صورت میں وہ پھر خودکشی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ آخری بار ہوگی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ گاڑی کے نیچے سر دے دے گا۔کوئی بچاکے تو دیکھے۔ایسی کی تیسی کسی کی، سلمیٰ ہی کی قسم ہے۔

پھر وہ قریب پڑے ہوئے گلدان میں سے پھول توڑ کر انگلیوں مین نچانے لگا۔اس کے چہرے پر نوعمر شہزادوں کا سا الابالی پن تھا، اور ہلکی ہلکی مسکراہٹ، کہ ایک ماضی کی یادگار تھی اور ایک مستقبل کی آئینہ دار۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

حرام جادی

افسانہ نگار : محمد حسن عسکری

دروازہ کی دھڑ دھڑ اور کواڑ کھولو کی مسلسل ضدی چیخیں اس کے دماغ میں اس طرح گونجیں، جیسے گہرے تاریک کنویں میں ڈول گرنے کی طویل، کراہتی ہوئی آواز۔ اس کی پرخواب اور نیم رضامند آنکھیں آہستہ آہستہ کھلیں، لیکن دو سے لمحہ ہی منہ اندھیرے کے ہلکے ہلکے اجالے میں ملی ہوئی سرمہ جیسی سیاہی اس کے پپوٹوں میں بھرنے لگی، اور وہ پھر بند ہو گئیں۔ آنکھوں کے پردے بوجھل کمبلوں کی طرح نیچے لٹک گئے، اور ڈلوں کو دبا دبا کر سلانے لگے۔ وہ اس سحر خیز حملہ آور کی تازہ یورش کے خلاف اپنے روزن بند کر لینا چاہتے تھے،.....اور پھر بھی وہ بھنبھنا رہے تھے،

امید و بیم کی یہ کشمکش جسے نیند شاید جل دہی اپنے دھارے میں غرق کر لیتی، زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی، اب تو دروازے تک کی چولیں تک ہلی جا رہی تھیں، اور آوازیں زیادہ بے صبر، بے تاب، کرخت اور بھرائے ہوئے گلے سے نکل رہی تھیں۔ کھولو، کھولو۔ یہ آوازیں پتلی، نوک دار تتلیوں کی طرح دماغ میں گھس کر نیند کے پردوں کو تار تار کیے دے رہی تھیں۔ وہ یہ بھی سن رہی تھی کہ پکارنے والا کھولو، کھولو کے وقفہ کے درمیان آہستہ سے ناخوشگوار ارادوں کا اظہار بھی کر دیتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کوئی شخص اسے سڑک کے ڈھیلے استعمال کرنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ آخر اس نے آنکھیں پوری کھول ہی دیں اور نصیبن سے کہا دیکھو تو کون ہے۔

یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی جب سے وہ اس قصبے میں مڈوائف ہو کر آئی تھی، یہی چیخیں، یہی دھڑ دھڑاہٹ، فرض اور آرام کی یہی تلخ کشمکش اور پسپائی.....سب اسی طرح، اسے صبح ہی اٹھ کر جانا پڑتا تھا، اور پھر اس کا سارا دن نو واردوں کو احتجاجانہ چیختے، چلاتے، ہاتھ پاؤں پھینکتے دنیا میں آتے ہوئے دیکھنے

میں، کچھ دن آئے ہوؤں کی رفتار ترقی کے معائینہ میں اور آمد و رفت کے اندراج کے لئے ٹاون ایریا کے دفتر تک بار بار دوڑنے میں گزر جاتا۔ اسے دوپہر کو کھانا کھانی اور آرام کرنے کا وقت ہزار کھینچ تان کے بعد ملتا۔ اور وہ بھی یقینی نہ تھا، کیونکہ بچے پیدا ہونے میں موقع کا مطلق لحاظ نہیں کرتے، صبح چار بجے، دوپہر کے بارہ بجے، رات کے دو بجے..... ہر گھنٹہ ہر گھڑی اسے کوہ ندا کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا۔ اور بچے ایسے تھ یکہ تیزی سے چلے آرہے تھے۔ جیسے پہاڑی ندی میں لڑھکتے ہوئے پتھر، ضبط ت ولید کے چرچے دولت نگر کو شہر سے ملانے والی کچی اور گڑھوں والی سڑک کو طے نہ کر سکتے تھے، اور اگر بالفرض محال وہ رینگتے ہوئے وہاں تک پہنچ بھی جاتے تو قصبے والے انہیں درخور اعتنا نہ سمجھتے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بچے خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں انسان کا کیا دخل، ۱۸ سالہ لڑکے، ۵۶ سالہ بڈھے، الھڑ لڑکیاں سب کے سب حیرت انگیز تن دہی اور یک جہتی کے ساتھ سڑکوں کی نالیوں میں کھیلنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ کیے چلے جارہے تھے، گویا وہ قومی دفاع کی خاطر کام کرنے والے مزدور ہیں۔ پھر وہ بے چارے کرتے بھی کیا، وہ تو خدا کے حکم سے بے بس تھے، غرضیکہ بچے چلے آرہے تھے۔ کالے بچے، پیلے بچے، پرنچے مرگ کی طرح سرخ بچے، اور کبھی کبھی گورے بچے۔ دبلے پتلے ہڈیوں کا ڈھانچہ یا بعض موٹے تازے بچے، مرے ہوئے بالوں والے، چپٹی ناک والے، چھچھوندر کی طرح گلگلے، لکڑی جیسے سخت، ہر رنگ اور ہر قسم کے بچے۔

ایملی نے اپنی دادی سے سنا تھا، کہان کے بچپن میں پاؤ، پاؤ بھر کے مینڈک برسے تھے۔ وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی اور اس وقت اسے بے ساختہ ہنسی بھی آجاتی تھی،..... کہ یہ بچے وہی برسنے والے مینڈک ہیں۔ پاؤ پاؤ بھر کے زرد زرد مینڈک اور اسے انہی زرد مینڈکوں کی بارش کے ہر قطرے کو برستے ہوئے دیکھن یکے

لئے ہر روز قصبے کی ٹوٹی پھوٹی روڑوں کی سڑکوں، تنگ و تاریک سیلی ہوئی گلیوں گرد وغبار کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں، بھونکتے ہوئے لال پیلے کتوں اور کسانوں کی گاڑیوں اور گھاس والیوں سے ٹھسے ہوئے بازاروں میں سارا سارا دن گھومنا پڑتا۔ پتلی پتلی سڑکوں پر دونوں طرف ریت کا حاشیہ ضرور بنا ہوتا۔ اور پھر نالیاں تو عین سڑکوں کے بیچوں بیچ بہتی تھیں۔ جن کی سیاہی کسی گنوارن کے بہتے ہوئے کاجل کی طرح سڑک کا کافی حصہ غصب کئے رہتی تھی۔ صفائی کے بھنگی نالیوں کی گندگی سمیٹ سمیٹ کر سڑک پر پھیلا دیتے تھے۔ جن سے اپنی ساڑھی کو محفوظ رکھنے کے لئے ایملی کو ہلکے ہلکے فیروزی سینڈل کی بجائے اونچی ایڑی والا جوتا پہننا پڑتا تھا۔ گو اس صورت میں سڑک پر پڑے اور ابھرے ہوئے لاتعداد کنکر اس کے پیروں کو ڈگمگا دیتے تھے۔ راستہ میں گلی ڈنڈا، اور کبڈی کھیلنے والے لڑکوں کا لاابالی پن ہر دفعہ اس کے کپڑوں پر اپنا نشان چھوڑ جاتا۔ مگر خیر شکر تھا کہ وہ ہر دفعہ اپنی آنکھیں اور دانت سلامت لے آئی تھی، اور یہاں کی گرمی، اسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں کی گرمی سے گھل، گھل کر ختم ہو جائے گی۔ ان تنگ سڑکوں پر بھی سورج اتنی تیزی سے چمکتا کہ اس کے بدن پر چنگاڑیاں ناچنے لگتیں۔ اور اسکی نیلے پھولوں والی چھتری محض ایک بوجھ بن جاتی۔ اور جب وہ اپنی اونچی ایڑیوں پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی، دھوپ میں جلتی بھنتی سڑکوں پر سے گزرتی، تو اسے دور آلھا گانے کی آواز، ڈھول کی کھٹ کھٹ

اور درختوں کے نیچے تاش کی پارٹیوں کے بلند اور کرخت قہقہے، دوپہر کی نیند حرام کر دینے والی بوجھل مکھیوں کی بھن بھناہٹ کی طرح بیزار کن اور پراستہزا معلوم ہوتے۔ اور وہ دو چار مہینے پہلے چھوڑے ہوئے شہر کا خیال کرنے لگتی۔ مگر شہر اس وقت وہ کوابوں کی سرزمین بن جاتا ہے۔ جسے صبح اٹھ کر ہزار کوششوں کے باوجود یاد نہیں کیا جا سکتا۔ اور جس کی لطافت کا یقین دن بھر دل کو بے چین کیے رکھتا ہے۔ اسے کچھ روشنی سی معلوم ہوتی..... ایک چمک، ایک کشادگی ایک پہنائی،،،،، کچھ ہر

یالی اس کے سامنے تیرتی.....اور پھر وہ اس تپتی کنکروں، اور ریت والی سرک پر لڑکھراتی، سنبھلتی چل رہی ہوتی۔ بجلی کے پنکھے والے کمرے کا تصور تک اس تپش اور سوزش کو کم کرنے میں اس کی مدد نہ کرتا تھا۔ لیکن ہاں جب کبھی وہ خوش قسمتی سے رات کو فارغ ہوتی اور اسے اپنے بستر پر کچھ دیر جاگنے کا موقع مل جاتا، تو اس وقت شہر کی زندگی کی تصویری، سینما کے پردوں کی طرح پوری طرح روشنی اور صفائی کے

ساتھ اس کی نظروں کے سامنے گزرنے لگتے۔ اور وہ جس تصویر کو جتنی دیر چاہے ٹھہرا لیتی۔ لیکن جب وہ ان تصویروں سے لطف اٹھانے کے درمیان ان مناظر کو یاد کرتی، جن سے اسے ہر وقت دوچار ہونا پڑتا تھا، تو اس کی خستگی اور بے زاری رفتہ رفتہ عود کر آتی، گھر کی دیواریں مع تاریکیوں کے اس پر جھک پڑتیں۔ دل بھینچنے لگتا، سانس دشوار ہو جاتا۔ اور اس کا سر گھمنی کھا کھا کر نیند کی بے ہوشی میں غرق ہو جاتا۔ اور وہ خواب میں دیکھتی کہ وہ پھر اسی شہر کے ہسپتال میں پہنچ جاتی ہے۔ مگر ان در و دیوار سے بجائے رفاقت کے بے گانگی ٹپکتی ہے۔ اور خود اس کے اعضاء منجمد اور نا قابل حرکت ہو گئے ہیں۔ اور کوئی نامعلوم خوف اس پر مسلط ہے۔ وہ صبح تک یہی خواب تین چار مرتبہ دیکھتی۔ اور دراصل اس کے لئے ان زندگیوں کا تعاقب ہونا بھی چاہیئے تھا۔ ایسے ہی اثرات پیدا کرنے والا، مانا کہ شہر میں بھی ایسی ملی ہوئی گلیاں، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں گرد و غبار اور شریر لڑکے

موجود تھے اور وہ ان کے وجود سے بے خبر نہ تھی۔ لیکن وہ تو ہوا کی چڑیوں کی طرح ان سب سے بے پرواہ اور مطمئن تانگے کے گدوں پر جھولتی ہوئی ان اطراف سے کبھی دسویں پندرھویں گزر جایا کرتی تھی۔ اس کی دنیا تو ان علاقوں سے دور صدر اسپتال میں تھی۔ کتنی کھلی ہوئی جگہ تھی وہ،

اور وہاں کی ہوا کا لطف تو ساری عمر نہ بھول سکے گی۔ اسپتال کے سامنے تارکول کی چوڑی سڑک تھی جس پر دن میں دو بار جھاڑو دی جاتی تھی، اور جو ہمیشہ شیشے کی

طرح چمکا کرتی تھی۔ اور جب وہ اپنی سہیلی ڈینا کے ساتھ اس پر سیر کو نکلتی تھی، ت ودور دور تک پھیل یہوئے کھیتوں اور میدانوں پر سے آنے والی ہوا کے جھونکے چہرے اور آنکھوں پر لگ لگ کر دماغ کو ہلکا کر دیتے تھے۔ اس کی ساڑھی پھڑ پھرانے لگتی اور ماتھے پر بالوں کی ایک لڑی تیرتی، اور اس کی رفتار سبک اور تیز ہو جاتی۔ ایسے وقت باتیں کرنا کتنا خوشگوار اور پر لطف ہوتا تھا۔ گرد وغبار کا تو یہاں نام بھی نہ تھا۔ مئی، جون کے جھکڑ بھی اسپتال کی سفید اور شیشے والی عمارتوں پر سے سنسناتے ہوئے شہر کی طرف گزرتے چلے جاتے تھے۔ اور بجلی کے پنکھے سے سرد رہنے والے کمرے میں دوپہر کی سختی اور اداسی اپنا سایہ تک نہ ڈال سکتی تھی۔ اور جب وہ پر وقار انداز سے ساڑھی کی پلہ سنبھالتے ہوئے گزرتی تھی تو اسپتال کے نوکر چاروں طرف سے اسے میم صاحب کہہ کر سلام کرنے لگتے تھے، گو یہاں بھی اسے سب لوگ میم صاحب ہی کہتے تھے، سڑکوں پر جھاڑو دینے والے بھنگی اسے آتے دیکھ کر تھم جاتے تھے۔ بلکہ قصبہ کے زمیندار صاحب اسے آپ کہہ کر مخاطب ہوتے۔ مگر پھر بھی یہاں وہ بات کہاں حاصل ہو سکتی تھی، وہ رعب وہ دبدبہ، وہ مالکانہ احساس۔ وہاں تو اس کی شخصیت اسپتال کا جزو لاینفک تھی۔ اس سفید، سرد اور متین عمارت اور

اس کے غیر مرئی مگر اٹل قانونوں اور اصولوں کا ایک زندہ مجسمہ۔ اسپتال کے نشتر کے سامنے آنے کے بعد کوئی شخص احتجاجانہ حرکت نہ کر سکتا تھا۔

اور اس طرح اس کی حدود مین داخل ہونے والی ہر چیز کو اس کی مرضی کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ جب اس کا مریضوں کے معائینہ کا وقت آتا تھا تو وارڈ میں پہل یہی سے تیاریاں ہونے لگتی تھیں۔ وہ دو روپے روز کرایہ دینے والیوں تک کو جھڑک دیتی تھی۔ کیونکہ اسے اپنے صاف کمروں میں پان کی پیک دیکھنا گوارہ نہ تھی۔ وہ بڑی بڑی نازک مزاجوں کو ذرا سی بے احتیاطی اور ہدایات کی خلاف ورزی پر ڈانٹتی تھی،

اور ہمیشہ تم کہہ کر بولتی تھی۔ مگر یہاں کی عورتیں تو بہت ہی منہ پھٹ تھیں۔ وہ اس سے ہراساں اور خوف زدہ تو ضرور تھیں، مگر اسے دوبدو جواب دینے سے نہ چوکتیں۔ تھوڑے دن تک ان پر اپنا اختیار جمانے کی کوشش کرنے کے بعد اب وہ تھک چکی تھی، اور ان کی باتوں میں زیادہ دخل نہ دیتی تھی، اور صفائی اور سلیقہ کی تو ان عورتوں کو ہوا تک نہ لگی تھی، زچہ کو گرمی میں بھی فوراً ایک کمرہ میں بند کر دیا جاتا۔ جس میں جاڑوں کے لحاف، بچھونے، چادروں اور دوسری جنسوں کے مٹکے، ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، برتن، کوئلوں کا گھڑا، سوت اور روئی کی گٹھڑیاں، سب الم غلم بھرے ہوتے تھے، اور ایک انگیٹھی پر تو گھٹی چڑھا دی جاتی تھی، بعض جگہ تو جلدی جلدی کمرے میں گوبری ہونے لگتی تھی، جو پیروں سے اکھڑ اکھڑ کر فرش کو چلنے کے قابل بھی نہ رہنے دیتی تھی، اور جس کی سیلن انگیٹھی کی گرمی سے مل کر سانس لینا دشوار کر دیتی تھی، گھر کی سب عورتیں اور وہ کم سے کم چار ہوتی تھیں اپنے بدبودار کپڑوں سمیت کمرے میں گھس آتیں، اور گھبراہٹ میں سارے سامان کو ایسا الٹ پلٹ کر دیتیں کہ ایک ذرا، کتر تک نظر نہ آتی۔ اندر کی گھسر پھسر، گڑ بڑ، کراہوں، یا اللہ، یا اللہ، اور عورتوں کے بار بار اندر باہر آنے جانے سے گھر کے بچے جاگ جاتے تھے، اور اپنے آپ کو اماں کے قریب نہ پا کر چیخنا شروع کر دیتے تھے، اور ان کی بڑی بہنیں چمکار، چمکار کر اور تھپک تھپک کر انہیں بہلانے کی کوشش کرتیں، ارے چپ، چپ دیکھ بھیا آیا ہے..... صبح کو دیکھو منا سا بھیا..... مگر صبح کو منا سا بھیا دیکھنے کی امید انہیں کوئی تسکین نہ دے سکتی تھی، اور ان کی روں روں دھاڑوں کی شکل اختیار کر کے کمرہ کے خلفشار میں اور اضافہ کر دیتی۔ یہ تو خیر جو کچھ تھا سو تھا، کثیف بستروں پر لیپ چڑھے تکیوں، پسینے سے سڑے ہوئے کپڑوں اور مدتوں سے نہ دھلے ہوئے بالوں کی بدبو، جسے گرمی اور بھی دوآتشہ کر دیتی تھی، اس کا جی الٹنے لگتا تھا، وہ تمام وقت ہر چیز سے دامن بچاتی کھڑی کھڑی پھرتی تھی۔ اس کمرہ میں ایک گھنٹہ گزارنا گویا جہنم

کے عذابوں کے لئے تیاری کرنا تھا۔ یہ مانا کہ خود اسے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا، کیونکہ قصبے کی عورتیں اپنے آپ کو نئے نئے انگریزی تجربوں کے لئے پیش کرنے اور اپنے آپ کو ایک اجنبی اور عیسائی مڈوائف کے جوان دیکھے اور مشتبہ آلات سے مسلح تھی، ہاتھوں مین دے دینے کے لئے قطعاً تیار نہ تھیں۔ انہیں تو قصبے کی پرانی دائی اور پھوٹے ہوئے گھڑے کے ٹھیکروں پر ہی اعتقاد تھا۔ تاہم ان کے مردوں نے ٹاؤن ایریا سے ڈر کر انہیں اس پر راضی کرلیا تھا۔ کہ وہ نئی عیسائی مڈوائف کی کمرے میں موجودگی برداشت کرلیں۔

اس طرح عملی حیثیت سے تو اس کا کام بہت کم ہوگیا تھا۔ لیکن آخر ذمہ داری تو اس کی ہی تھی، اور وہی ٹاؤن کمیٹی کے سامنے ہر بھلائی برائی کی جواب دہ تھی، اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا گویا ہواؤں سے لڑنا تھا، اکثر نوگرفتار اتنا چیختیں چلاتیں اور ہاتھ پاؤں مارتیں کہ انہیں قابو میں کرنا مشکل ہوجاتا، یا پھر ایسی سہم جاتی تھیں کہ وہ ڈر کے مارے ذرا سی حرکت نہ کرتی تھیں۔ تین، تین، چار، چار بچوں کی مائیں تو اور بھی آفت تھیں۔ وہ اپنے تجربوں کے سامنے اس ساڑھی پہن ک ربا ہر گھومنے والی عیسائی عورت کی انوکھی ہدایتوں کو کوئی وقعت دینے پر تیار نہ تھیں، وہ اپنی آہوں کے درمیان بھی رک کر دائی کو مشورہ دینے لگتیں۔ اور ایملی کو دانتوں سے ہونٹ چبا چبا کر خاموش رہ جانا پڑتا۔ اور دائی تو بھلا اسکی کہاں سننے والی تھی، اسے اپنی برتری اور مڈوائف کی نااہلی کا یقین تو خیر تھا ہی، مگر اس کی موجودگی سے اپنی آمدنی پر اثر پڑتا دیکھ کر اس نے ایملی کی ہر بات کی تردید کرنا اپنا فرض بنالیا تھا، گو ایملی نے اس کے طنزیہ جملوں کو پینے کی عادت ڈال لی تھی، لیکن اس کا دل کوئی پتھر کا تھوڑے ہی تھا۔ دائی کے طرز عمل کو دیکھ دیکھ کر دوسری عورتیں بھی دلیر ہوگئی تھیں۔ اس کی طرف توجہ کیے بغیر ہی وہ پلن گلو گھیر لیتی تھیں۔ اور وہ سب سے پیچھے چھوڑ دی جاتی تھی۔ اب اس کے سوا کیا رہ جاتا تھا کہ وہ جھنجھلا جھنجھلا کر پیر پٹخے اور انہیں پکار پکار کر اپنی طرف

متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔

ان سب آزمائشوں سے گزرنے کے بعد اسے اندراج کے لئے ٹاؤن کمیٹی جانا پڑتا تھا، اسے دیکھ کر بخشی جی کی آنکھیں چمکنے لگتیں، اور ان کے پان میں سنے ہوئے کالے دانت نیم تمسخرانہ انداز میں چھوٹی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں سے باہر نکل آتے۔ اور وہ اسکی طرف کرسی کھسکاتے ہوئے کہتے ''کہو، میم صاحب۔ لڑکا کہ لڑکی'' مونچھوں کے ان گھن یکالے بالوں کی قربت انہیں ہراساں کر دیتی۔ اور اسے ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے ان بالوں میں ایک ایک بجلی کی لہر دوڑ جائے گی، اور وہ سیدھے ہو کر اس کے چہرے سے آن ملیں گے، وہ نفرت اور خوف سے پیچھے سمٹ جاتی، اور بخشی جی سے نظریں بچاتی ہوئی جلد سے جلد اپنا کام کرنے کی کوشش کرتی۔

یہ سارے مرحلے طے کرتی ہوئی وہ عموماً آٹھ، نو بجے رات کو تھکی ہاری اپنے گھر پہنچتی، جب پیر کہیں سے کہیں پڑ رہے ہوں۔ سر بھنایا ہوا ہو، جب جسم کا کوئی بھی عضو ایک دوسرے کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہو تو بھلا بھوک کیا خاک لگ سکتی ہے۔ وہ جوتا کھول کر پیر سے کونے میں اچھال دیتی۔ اور کپڑے اس طرح جھنجھلا جھنجھلا کر اتارتی کہ دوسرے دن نصیبن کو انہیں دھوبی کے یہاں استری کروانے کے لئے لے جانا پڑتا۔ الٹا سیدھا کھانا حلق سے نیچے اتار کر وہ بستر پر گر پڑتی، تکیے پر سر رکھتے ہی درخت، دیواریں، ساری دنیا اس کے گرد تیزی سے گھومنے لگتی، بھیجا دھڑ دھڑا کر کھوپڑی مین سے باہر نکل کر بھاگنے کی کوشش کرتا، سر تکیے

میں گھسا جاتا مگر تکیہ اسے اوپر اچھالتا معلوم ہوتا۔

بازو شل ہو جاتے، ہتھیلوں میں سیسہ سا بھر جاتا، اور ہاتھ اوپر نہ اٹھ سکتے۔ اس طرح ٹانگیں بھی حرکت سے انکار کر دیتیں۔ اور کمر تو بالکل پتھر بن جاتی۔ وہ اپنے پرانے اسپتال کو یاد کرنا چاہتی مگر وہ کسی بھی چیز کو پوری طرح یاد نہ کر سکتی۔

کھڑکی کا کواڑ، مریض کی آہنی چارپائی کا پایہ، موٹر کے پہیئے، نیم کے پیڑ کی چوٹی، پان میں سنے ہوئے کالے دانت، اور گھنی سخت مونچھیں، یہ سب باری باری سامنے آتے اور غائب ہو جاتے۔ وہ کھڑکی کے کواڑ مین ایک کمرہ جوڑنا چاہتی، مگر اس میں زیادہ سے زیادہ ایک چٹخنی کا اضافہ کر سکتی تھی، بلکہ بعض اوقات آہنی چارپائی کا ایک پایہ تو ایک کھونٹے کی طرح اس کے دماغ میں گڑ جاتا۔ اور کوشش کے باوجود بھی ٹس سے مس نہ ہوتا، نیم کی چوٹی کو کبھی ایک تنا حاصل نہ ہو سکتا..... پھر نیم کی ہری ہری چوٹی پر ایک ریت کے حاشیہ والی نالی بہنے لگتی، اور کھڑکی کے شیشے پر پان میں سنے ہوئے کالے دانت مسکراتے اور گھنے سخت بالوں والی مونچھیں بے تابی سے ہلتیں..... مختلف شکلیں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو جاتیں، اور دماغ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لڑتی، جھگڑتی، ٹکراتیں، روندتی، دوڑتی،،،،، سیاہ آسمان پر روشن ان گنت تاروں کے گچھے، بنگوں کی طرح آنکھوں میں گھس گھس کر ناچنے لگتے اور جلتی ہوئی آنکھیں کنپٹیوں کی خواب آور بھد بھد سے آہستہ آہستہ بند ہو جاتیں۔ سونے کے بعد تو ان کی شکلوں کے اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے۔ جو باری باری آتے، اور اس کے دماغ پر مسلط ہو جانا چاہتے تھے۔ اتنے ہی میں ایک دوسرا آ پہنچتا۔ اور پہلے والے کو دھکے دے کر نکال دیتا۔ ابھی یہ کش مکش ختم بھی نہ ہوتی کہ تیسرا، آدھمکتا۔ ان سب کی حریفانہ زور آزمائیاں اسے بار بار چونکا دیتیں۔ اور وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ آنکھ کھول دیتی۔..... پھر آنکھوں میں تاروں کے گچھے کے گچھے بھرنے لگتے۔ کہیں صبح کے قریب جا کر یہ شکلیں تھکتیں، اور اپنی رزم گاہ سے رخصت ہوتیں۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چلنی شروع ہو جاتی، اور ایملی نیند میں بالکل بے ہوش ہو جاتی، مگر اس کی نیند پوری ہونے سے پہلے کواڑ کھولو کی مسلسل اور ضدی چیخیں اس کے دماغ میں گونجتیں..... وہی چیخیں، وہی دھڑ دھڑاہٹ، فرض اور آرام کی وہی تلخ کش مکش، وہی جھلاہٹ اور پسپائی۔

نصیبن باہر سے لوٹ آئی۔ اسے شیخ صفدر کے ہاں سے بلایا گیا تھا، اور پکارنے والے نے بار بار کہا تھا کہ جلدی بلایا ہے..... جلدی..... ہر ایک یہی کہتا ہوا آتا ہے جلدی..... آخر وہ کیوں جلدی کرے، کیا وہ ان کی نوکر ہے یا وہ اسے دولت بخش دیتے ہیں۔ ہونہہ جلدی..... کیا وہ نہ پہنچے گی تو سب مر جائیں گے

اور پھر وہ کریں گی ہی کیا اسے بلا کر..... کہتی ہیں چڑیلیں اسے کیا خاک آتا ہے،..... کیا خاک آتا ہے..... کچھ نہیں آتا ہے، جیسے جیسے آلے اس نے دیکھے ہیں ان لوگوں نے تو خواب میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔ چمک دار۔ تیز، ہاتھی دانت کے دستے والے،

اور وہ ڈاکٹر کارٹ فیلڈ کے لیکچر، وہ نقشے دکھا دکھا کر جسم کے حصوں کو سمجھاتی تھی،..... کچھ نہیں آتا..... ہونہہ

ایملی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی، پہلے تو اس کا جی چاہا کہ کہلوا دے کہ وہ جلدی نہیں آ سکتی، وہ بالکل نہیں آئے گی۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ لوغ محض جاہل ہی تو ہیں۔ ان کے کہنے سے اس کا بگڑتا ہی کیا ہے، اور آخر ذمہ داری تو اس کی ہی ہے،

چنانچہ اس نے نصیبن سے کہا، کہہ دو چلو میں آ رہی ہوں، مطمئن ہو کر اس نے کروٹ لے لی، سر کو تکیے پر ڈھیلا چھوڑ دیا، آنکھیں بند کر لیں۔ ایک بازو کو بستر کی ٹھنڈی چادر پر پھیلا دیا، اور ہاتھ چہرے پر رکھ لیا۔ اس نے چاہا کہ دماغ کو بالکل کالی کر لے اور جسم کو ساکت، مگر پھر وہی تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک پتھ رد ماغ کو آ کر لگتا،، جلد۔ جس سے اس کے ماتھے اور کن پٹیوں کی نسیں تن جاتیں

اور ٹوٹتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اسے جلدی جانا تھا جلدی، اور اس کام کے تو وہ ٹاؤن کمیٹی سے تی سر و پے ماہوار پاتی تھی، جلد جانا تھا۔ لیکن آخر وہ فرض پر صحت تو قربان نہیں کر سکتی تھی، کل رات ہی اسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ انسان ہی تو تھی نہ کہ مشین، اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے سر میں درد ہو رہا ہے، کمر بیٹھی جا رہی ہے،

کندھے اور ٹانگیں بے جان ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں جلدی اٹھ جانا مضر ہو گا۔ ابھی آخر چار مہینے میں اسے چار دفعہ بخار آ چکا تھا۔ اور پھر وہ وہاں جا کر بنا ہی کیا لے گی۔ ان لوگوں کو ایسیکیا خاص ضرورت ہے اس کی..... تھوڑا سا اور سو لینا ہی بہتر ہے۔ وہ سو جاتی، مگر انگلیوں کے بیچ میں ہو کر صبح کی روشنی آ رہی تھی، اس کی آنکھوں کو بند نہ ہونے دیتی تھی، اس نے ہاتھ آنکھوں پر کھسکا لیا۔ اور آنکھیں خوب بھینچ کر بند کر لیں، اب اسے جھپکیاں آنا شروع ہو گئیں مگر ہر دفع دودھ لو دودھ، ابے او کلو ہوئے۔ اٹھ، ہٹ، ابے پڑھنے نہیں جانے کا۔؟ کی صداؤں، اور نصیبن کے لکڑیاں توڑنے اور دیگچیاں اٹھانے کی آواز سے ہو جاگ پڑتی تھی۔ سونے سونے کی کوشش کرتے کرتے اسکی آنکھوں میں پانی بھر آیا، سر میں درد ہونے لگا، ماتھا جلنے لگا، وہ مایوس ہو کر سیدھی لیٹ گئی اور بازوؤں

آنکھوں پر رکھ لیے۔ اب اس کے اعضا اور بھی بوجھل اور نا قابل حرکت ہو گئے۔ اور وہ ان صداؤں، آوازوں، ان تحکمانہ طلبیوں..... جلدی بلایا ہے۔ اس صبح کے چاند نے، اس قصبہ پر دانت پیسنے لگی۔ جس کے نیچے ان میں سے کسی کی بھی پہنچ نہ ہو، جہاں وہ ان سب سے..... اپنے آپ سے غافل ہو جائے، اپنے کو کھو دے..... اسے محسوس ہو کہ دو مضبوط اور مدت کے آشنا بازو اس کے جسم کا حلقہ کیے بھینچ رہے ہیں۔..... سر کی درد کو گویا یکا یک کسی نے پکڑ لیا..... دو آنکھیں بھی ذرا دور چمکیں، مسکراتی ہوئی معلوم ہوئیں، اور اسنے اپنے آپ کو ان بازوؤں کی گرفت میں چھوڑ دیا۔ جسم ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا تھا۔ سر ہلکے ہلکے جھکولے کھاتا موجوں پر بہا جا رہا تھا۔ سکون تھی، خاموشی تھی، اور صرف دل کے مسرت سے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی..... دو بازوں اس کے جسم کو بھینچ رہے تھے، دو مضبوط اور مدت سے آشنا بازوؤ.....

اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ صبح کی چاندنی میں چمک آ گئی تھی،

نصیبن نے چولھے پر دیگچی رکھی، بکری والا محلے سے جانے کے لئے بکریاں جمع کر رہا تھا۔ اور کنویں کی گراری زور زور سے چل رہی تھی، اس کی آنکھیں اوپر اٹھیں اور ہوا میں کسی چیز کو تلاش کرنے لگی، دو بادامی سائے اترنے لگے، آنکھوں کے پردے پھڑکے، اور پلکیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے مل گئیں..... گویا وہ ان سایوں کو پھنسالینا چاہتی ہیں۔ سائے کچھ دور پر رک گئے، وہ ڈگمگائے اور دھندلے ہوتے ہوتے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ آنکھیں صبح بے رنگ آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی گردن ڈھلک گئی، اور بازو دونوں طرف گر پڑے..... دومدت کے آشنا بازو..... مگر وہ یہاں کہاں.....

چند لمحے بے حس رہنے کے بعد وہ ولیمن ک ویاد کرنے لگی، لمبے لمبے پیچھے الٹے ہوئے بال، چوڑا سینہ، سرخ سرخ ڈوروں والی جلد، جلد پھرتی ہوئی آنکھیں، موٹا سا نچلا ہونٹ، کان کی لو تک کٹی ہوئی قلمیں، سانولے رنگ پر منڈھی ہوئی داڑھی کا گہرا نشان، آنکھوں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈیاں اور مضبوط بازو..... دن میں کتنی کتنی دفعہ اس کے بازو اسے بھینچتے تھے۔ اور ان کے درمیان وہ بالکل بے بس ہو جاتی تھی، جھنجھلا پڑتی، مگر اس کے جواب میں اس کا پیار اور بڑھ جاتا..... اور اس کے دونوں گالوں پر وہ نم آلود بوسے..... اور دن مین کتنی مرتبہ اس کے منہ سے شراب کی تیز بد بو تو ضرور آتی تھی، مگر وہ کیسے جوش سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھالیتا۔ اور پاگلوں کی طرح اس کے چہرے، ہاتھ، گردن، سینے سب پر بوسے دے ڈالتا۔ اور پھر قہقہے مار مار کر ہنستا تھا۔ میری جان..... ہاہا..... اے، می، لی..... ڈی ر..... پیاری..... ہا، ہا، ہا..... اور وہ اسکی کیسی نگہداشت کرتا تھا۔ اور وہ اس سے اپنے بازوؤں میں پوچھتا، اس مہینے کیسی ساڑھی لاؤ گی؟ میری جان..... ہیں؟..... اس سینے پر تو سرخ کھلے گی، کہو کیسی رہی،؟ ہاہاہاہا،..... اور وہ اسے دوپہر میں تو کبھی نہ نکلنے دیتا۔ اگر اسے ایسے وقت بلایا جاتا تو کہلا دیتا مس ولیمن سو رہی ہیں۔

اور وہ اس کے اٹھنے سے پہلے چائے تیار کرا کے اپنے آپ اس کے قریب میز پر رکھ دیتا۔ اور اسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا، مگر وہ یہاں کہاں؟ ۔ اگر وہ یہاں ہوتا، تو اتنی سویرے اسے کہیں نہ جانے دیتا۔ وہ یہاں ہوتا تو وہ خود کہیں نہ جاتی ۔ وہ تو ایسے کواڑ پیٹ کر جگانے والے کا سر توڑ دیتا..... لیکن وہ یہاں کہاں..... وہ اس کے پاس ہوتا تو وہ خود یہاں کیوں ہوتی ۔

لیکن..... کچھ دوسری شکلیں ابھریں..... اچھا ہی ہے وہ اس کے پاس نہیں ہے ..... اس کے بال الجھے ہوئے اور پریشان تھے، اور وہ اس طرح دانتوں سے ہونٹ چبا رہا تھا، گویا ان کا قیمہ کر کے رکھ دے گا۔ اور اس نے اسے کس بے رحمی سے بید سے پیٹا تھا، لے..... اور لے گی..... بڑی بن کے آئی ہے وہاں سے وہ..... اگر میم صاحب شور سن کر نہ آ جاتیں، تو نہ معلوم وہ اسے کتنا اور مارتا..... ایملی اپنے بازوؤں پر نشان ڈھونڈنے لگی..... ایسے ظالم سے تو چھٹکارا ہی اچھا، کیسی خونی آنکھیں اور آخر میں تو وہ کتنی شراب پینے لگا تھا..... مگر وہ ہوتا تو اسے اتنی سویرے کہیں نہ جانے دیتا، ..... مانا کہ وہ روز اکے ساتھ کتنی دیر ٹہلتا رہتا تھا۔ لیکن ظاہراً تو اس کے ساتھ اس کا برتاؤ ویسا ہی رہا۔ اگر وہ خود اتنا نہ بگڑتی، اور اٹھتے، بیٹھتے اسے طعنے نہ دیتی تو شاید بات یہاں تک نہ پہنچتی..... وہ اسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا، اور وہ لمبے منہ پر ہڈیاں نکلی ہوئی، سوکھی جیسے لکڑی ہو..... اور فراک پہننے کا بڑا شوق تھا آپ کو، بڑی میم صاحب بنتی تھی، چار حرف انگریزی کے آ گئے تھے تو زمین پر قدم نہ رکھتی تھی، مارے شیخی کے..... نہ جانے اسے کیا چیز لگی ہوئی تھی، اس میں جو وہ ایسا لٹو ہو گیا تھا..... اس نے خواہ مخواہ فکر کی، وہ خود اسے تھک کر چھوڑ دیتا،..... وہ اسے تھوڑے دن یونہی چلنے دیتی تو کیا تھا..... مگر اس نے اسے کس بے رحمی سے مارا تھا۔..... ہاں..... مار ہی لیا تو کیا تھا، وہ خود بھی شرمندہ معلوم ہوتا تھا، اور اس کے سامنے نہ آتا تھا۔ اور اگر ڈینا اسے اتنا نہ بہکاتی تو وہ شاید طلاق بھی نہ لیتی بس وہ اسے ذرا مزہ لینے کو اسے اکساتی

رہی ...... یہ اچھی دوستی ہے...... اب وہ ڈینا سے نہیں بولے گی، اور اگر وہ ملے گی بھی تو وہ منہ پھیر کر چل دے گی۔ اور جو ڈینا اس سے بولے گی تو وہ صاف کہہ دے گی کہ وہ دھوکا دینے والوں سے نہیں بولنا چاہتی، ...... ڈینا بگڑ جائے گی تو بگڑا کرے، اب وہ شہر کے اسپتال سے چلی ہی آئی، اب کوئی روز کا کام کاج تو ہے نہیں، کہ بولنا ہی پڑے......

وہ اسی طرح ڈینا کی مکاری پر پیچ وتاب کھاتی رہی، اگر نصیبن اسے نہ پکارتی، اجی میم صاحب اٹھو، سورج نکل آیا، وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی اور چاروں طرف دیکھا، اب تو واقعی اسے چلنا چاہیئے تھا۔ مگر پھر بھی اس نے پلنگ سے اترنے سے پہلے کئی بار انگڑائیاں لیں، اور تکیہ پر سر رگڑا۔

وہ منہ دھوکر چائے کے انتظار میں پھر بستر پر آ بیٹھی، نصیبن لکڑیاں چولہے میں ٹھیک کرتی ہوئی کہہ رہی تھی وہ منیا ین کہہ رہی تھی تمہاری میم صاحب تو عید کا چاند ہو گئیں۔ کبھی آ کے بھی نہیں جھانکتیں...... اجی ہو ہی آؤ، کسی دن بڑا یاد کرے ہیں تمہیں۔

ہو ہی آئے ان کی طرف...... کیا کرے وہ جا کر میلے کچیلے پلنگوں پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ ٹوٹے ٹاٹے، کیا باتیں کرے وہ یہاں کی عورتوں سے؟ بس انہیں تو قصے سناتے جاؤ۔ کہ اس کے بچہ مرا ہوا پیدا ہوا، اس کو اتنی تکلیف ہوئی، اس کو ایسی بیماری تھی، کہاں سے لائے وہ ایسے قصوں کو، اور کوئی بات جیسے آتی ہی نہیں انہیں ......اور پھر یہ لوگ کتنے بدتمیز ہیں۔

سڑے ہوئے کپڑے لے کر سر پر چڑھی جاتی ہیں۔ اسے ان لوگوں کے ہاتھ کا پان کھاتے ہوئے کتنی گھن آتی ہے مگر مجبوراً کھانا پڑتا ہے،،،، جب وہ اس سے باتیں کرتی ہیں تو ہلکے ہلکے مسکراتی جاتی ہیں،

جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہوں کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو اور سارے گھر کو

دیکھتی جاتی ہیں۔ گویا وہ چور ہے اور ان کی آنکھ بچتے ہی وہ کوئی چیز اڑا دے گی،.....
یہ اس سے سب عورتیں جھجکتی کیوں ہیں، کیا وہ ان کی طرح کی عورت نہیں ہے؟ کیا
وہ کوئی ہوا ہے؟۔ عجب بے وقوف ہیں یہ عورتیں؟ اور ہاں جب وہ ان کے ہاں جاتی
ہے تو ان کے اشارے سے جوان لڑکیاں جلدی جلدی بھاگ جاتی ہیں۔ وہ اندر
سے جھانک جھانک کر اسے دیکھتی ہیں، اور اگر اسکی نظر پڑ جائے تو وہ فوراً ہٹ
جاتی ہیں۔ اور اندر سے ہنسنے کی آوازیں آتی ہیں۔ اور اگر انہیں اس کے سامنے آنا ہی
پڑے تو خوب دوپٹے کو اوپر سے نیچے تانے ہوئے اور بدن چراتی ہوئی گزر جاتی
ہیں۔ جیسے ان کی نظر اسمین سے کچھ چھٹا لے گی۔ یا اس کی نگاہ پڑ جانے سے ان کو
کوئی گندگی لگ جائے گی،..... ان کی یہ حرکت اسے بالکل ناپسند ہے، کیا انہیں اس
پر اعتماد نہیں۔ یا وہ اس پر شک کرتی ہیں،..... اس سے تو ان کو یہاں نہ جانا ہی اچھا،
..... بیٹھیں اپنی لڑکیوں کو لے کر اپنے گھر میں، اور وہ گندے بچے، مٹی میں سنے
ہوئے، ناک بہتی ہوئی، آدھے ننگے، پیٹ نکلا ہوا۔ وہ سامنے آکر کھڑے ہو جاتے
ہیں۔ اور اسے یوں دیکھتے ہیں جیسے وہ نیا پکڑا ہوا عجیب وغریب جانور ہو،..... اور
جب وہ ان سے بولتی ہے تو وہ باہر بھاگ جاتے ہیں۔..... وحشی ہیں بالکل
جانور..... بالکل..... یہ ضرور ہے کہ اس کے وہاں پہنچتے ہی جھاڑو شروع ہو جاتی
ہے۔ مارے گرد کے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذرا خیال نہیں تندرستی کا انہیں،
اور کوئی کیوں ان کے ہاں جا کر بیماری مول لے، اور ان کے مرد، کتنی شرم آتی ہے
اسے ان حرکتوں سے، وہ ہمیشہ ڈیوڑھی میں راستہ گھیرے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اور جب
تک وہ بالکل قریب نہ پہن چجائے نہیں ہٹتے..... ارے حقہ ہٹاؤ، حقہ ہٹاؤ،، اٹھتے
اٹھتے ہی اتنی دیر لگا دیتے ہیں، کہ وہ گھبرا جاتی ہے۔ جان کے کرتے ہوں گے یہ ایسی
باتیں..... تاکہ کھڑی رہے وہ تھوڑی دیر وہاں،..... اور جب وہ اندر پہن چجاتی ہے
تو قہقہوں کی آواز آتی ہے۔ عجب بدتمیز ہیں۔..... انگریزوں کے ہاں کتنی عزت ہو

تی ہے۔عورتوں کی وہ بڈھے پادری صاحب جو آیا کرتے تھے، بہت اچھے آدمی تھے بے چارے۔ ہر ایک سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتے تھے بے چارے، بلکہ اسے تو وہ پہچان گئے تھے۔.....سب مل کر جایا کرتے تھے اتوار کو گرجا،.....وہ خود، ڈینا، کٹی، میری، شیلا اور ہاں مرسی.....مسز جیمس کا کتنا مذاق اراتے تھے،.....سب مل کر.....سب سے پیچھے چلتی تھیں، ہڈیوں کا ڈھانچہ تھیں بس.....چھتری ہاتھ میں لیے ہوئے ہانپتی ہوئیں، اور ان میں تھا ہی کیا، ہڈیوں کا ڈھانچہ تھیں بس، اور گرجا سے لوٹتے ہوئے اور بھی مزہ آتا۔ سب چلتے تھے، آپس میں ہنسی، مذاق کرتے ہوئے۔.....اف شیلا کس قدر ہنسوڑ تھی، کیسے کیسے منہ بناتی تھی، اور جب ہنسنے پہ آتی تو رکتی ہی نہیں تھی، مگر یہاں وہ سب باتیں کہاں.....اب تو جیسے وہ آدمیوں میں رہتی ہی نہیں.....اور واقعی کیا آدمی ہیں یہاں والے؟ اول تو اسے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی، ہر وقت پاؤں میں چکر رہتا، اور پھر ایسوں سے کوئی کیا ملے،.....جیسے جانور.....نہ کوئی بات کرنے کو، نہ کوئی ذرا ہنسنے بولنے کو.....بس آؤ، اور آ کر پڑ رہو۔

اور رہ گئی نصیبن

تو اسے اس کے سوا کوئی بات ہی نہیں آتی کہ اس کا بیٹا بھاگ گیا۔ اس کی اپنے میاں سے لڑائی ہو گئی، اس کی برات یہاں بڑے دھوم دھام سے آئی تھی۔ اسے کیا ان باتوں سے ہوا کرے،.....یا بہت ہوا تو اسے ڈراتی رہے گی چوروں کے قصے سنا سنا کر،.....ایک دفعہ اس نے سنایا تھا کہ ایک دوسرے قصبے کی مڈوائف کو کچھ لوگ کس طرح بہکا کر لے گئے تھے، اور اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا۔ بکتی ہے وہ، بھلا کہیں یوں بھی ہوا ہے۔ لیکن کہیں اگر اس کے ساتھ.....مگر نہیں بیکار کا ڈر ہے.....جو یوں ہوا کرے تو لوگ گھر سے نکلنا چھوڑ دیں۔.....بھلا دنیا کا کام کیسے چلے،.....مگر ایسی جگہ کا کیا اعتبار، کیا ہو کیا نہ ہو۔ کوئی ساتھ بھی تو نہیں.....اور اگر وہ مدواء فنہ بنتی تو اچھا تھا خود تو وہ ٹیچر بننا چاہتی تھی۔ بلکہ پاپا بھی یہی چاہتے تھے، مگر

ماما ہی کسی طور راضی نہ ہوئیں، کتنے دن ہو گئے پاپا کو مرے ہوئے..... بارہ سال اور کتنا زمانہ گزر گیا ہے۔ جیسے کل کی بات ہو..... کتنا پیار کرتے تھے وہ اسے..... بلکہ سکول بھی پہنچانے جایا کرتے تھے..... کلاس میں اس کی سیٹ میز کے پاس تھی۔ اور وہ انگریزی کے ماسٹر صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔..... بے چارے چاہے وہ کام کر کے نہ لے جائے، مگر کبھی کچھ نہ کہتے تھے،..... اور لڑکے تو اسے نہ جانے کیا سمجھتے تھے، سب کے سب ماسٹر کی نظریں بچا کر اسے دیکھتے رہتے۔..... ارے وہ موٹا کرم چند، بھلا وہ بھی تو اس کی طرف دیکھتا تھا، جسے وہ بڑا خوبصورت سمجھتی تھی۔ ..... اور ہاں وہ عظیم بڑا بھولا تھا بے چارہ، سوکھا سا زرد، مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اس کی،، دیکھتا تو وہ بھی رہتا تھا اس کی طرف مگر جب وہ دیکھتی تو شرما کر نظریں نیچی کر لیتا، اور رومال نکال کر منہ

منہ پونچھنے لگتا، اور اس دن وہ دل میں کتنا ہنسی تھی، جس دن اتفاق سے وہ جلدی آ گئی تھی، برآمدے میں دوسری طرف وہ آ رہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچی تو اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا، اس کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔ اور کچھ کہنے سا لگا، ڈرتے ڈرتے عظیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، اور پھر جلدی سے چھوڑ دیا اسے گھبرایا ہوا دیکھ کر وہ خود کتنا پریشان ہو گیا تھا۔

اور اس نے بہت گڑگڑا کر کہا تھا کہیئے گا نہیں۔

وہ کتنے دن اس بات کو یاد کر کے ہنستی رہی تھی۔..... کتنا سیدھا تھا واقعی وہ ابھی سکول میں رہتی تو کتنا مزہ آتا، مگر وہ زمانہ تو اب گیا، اب تو وہ یہاں دنیا سے الگ پڑی ہے۔ کوئی بات تک کرنے کو نہیں، کسی کا خط تک نہیں آتا۔ وہ روزانہ ڈاکیے سے پوچھتی اس کا کوئی خط تو نہیں مگر وہ وہی جواب دیتا، نہیں۔ اور جو آیا بھی تو بس وہی لمبے بادامی لفافے، ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کی ہدایتیں، یوں کرو اور ووں کرو، کوئی اسکی مانے بھی جو وہ یوں کرے،..... خواہ مخواہ کی آفت، اور پھر خط آئے بھی تو کہاں سے

.....آنٹی ہی دلی سے خط بھیج دیا کریں۔مگر وہ تو برسوں بھی خبر نہ لیتیں۔ایک دفعہ جانا چاہیئے اسے دلی، اچھا شہر ہے.....کیا چوڑی سڑکیں ہیں.....اور سینما کس کثرت سے ہیں۔اور وہ خیر ہے ہی.....مگر ہو.....

کائین کائیں نے اسے چونکا دیا تھا۔دھوپ بھی آدھی دیوار تک اتر آئی تھی،کوا زور زور سے چیخ رہا تھا اور وہ بستر پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔اسے جلدی جان اچاہیئے تھا۔اس نے ایسے ہی اتنی دی رکر دی۔وہ نصیبن پر اپنا غصہ اتارنے لگی، کہ اس نے چائے کیوں نہ لاکر رکھی،مگر وہ سمجھ رہی تھی کہ میم صاحب سو رہی ہیں۔اور واقعی ہی اسنے خیال کیا کہ اس سے تو وہ سو لیتی تو اچھا تھا،اس نے دوبارہ چائے پی، الٹا سیدھا منہ دھویا،اور کپڑے بدلنے چلی گئی،ٹرنک کھول کر وہ سوچنے لگی کہ کونسی ساڑھی پہنے.....سفید سرخ کناروں والی،مگر کیا روز روز ایک ہی رنگ.....اور پھر سفید ساڑھی میلی کتنی ہو جاتی ہے۔اس کی بہار تو بس ایک ہی دن کی ہے دوسرے دن کسی کام کی نہیں رہتی۔نیلی ساڑھی نیچے سے چمک رہی تھی اسے ہی کیوں نہ پہنے،مگر اسے نیلی ساڑھی پہنے دیکھ کر تو لوگ اور بھی باؤلے ہو جائیں گے۔وہ جدھر سے نکلتی ہے۔سب لوگ اسے گھورنے لگتے ہیں،اسے بہت بری لگتی ہے لوگوں کی یہ عادت، اور ان زمینداروں کو دیکھو ویسے بڑے شریف بنتے ہیں۔جب وہ آگے بڑھ جاتی ہے تو وہ ہنسنے لگتے ہیں آوازے کستے ہیں۔کیا وہ سمجھتی نہیں۔کوئی کھانسنے لگتا ہے،ذرا شہر میں کر کے دیکھیں ایسی حرکت.....مزہ چکھا دیتی انہیں۔ان ہی کی وجہ سے تو اس نے رنگدار ساڑھیاں پہننا چھوڑ دی تھیں۔اور سفید پہننے لگی تھی۔مگر وہ پھر بھی نہیں مانتے۔اب اگر آج نیلی ساڑھی پہن ک رجائے گی تو نامعلوم کیا کیا کریں،مگر وہ کوئی ان سے ڈرتی ہے۔کیا اسے کھا جائیں گے۔اب وہ پھر رنگدار ساڑھیاں پہنا کرے گی،ہنسیں گے تو ضرور مگر دیکھیں وہ اس کا کیا بناتے ہیں.....آج ضرور نیلی ساڑھی پہنے گی۔

نیلی ساڑھی پہن کر بال بنانے کے لئے اس نے اپنے سامنے آئینہ رکھا، کم خوابی کی وجہ سے اس کی آنکھیں کچھ لال اور سوجی ہوئی سی تھیں۔ وہ ہاتھ میں آئینہ اٹھا کر غور سے دیکھنے لگی۔ مگر یہ اس کا رنگ کیوں خراب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور کھال بھی کھردری ہو چلی تھی، جب وہ لڑکی تھی تو اسکے چہرے پر کتنی چمک تھی۔ رنگ سانولا تھا مگر چمک دار تھا۔ مگر اب.....

اس نے آئینہ رکھ دیا اور حسرت سے اپنے جسم کو اوپر سے نیچے تک دیکھا، جیسے مور اپنے پروں کو۔ اس کے بازوؤں کا گوشت لٹک آیا ہے، اور ہاتھ اب کتنے سخت ہو گئے ہیں۔ بال بھی سوکھے سوکھے اور ہلکے رہ گئے ہیں۔ پہلے وہ کتنا دوڑتی بھاگتی تھی۔ اور ذرا نہ تھکتی تھی، مگر اب تو تھوڑی ہی دیر میں اس کی کمر ٹوٹنے لگتی ہے۔

اس نے ایک لمبی سی انگڑائی لی اور پھر ایک لمبا سا سانس لیا۔ بے رونق چہرے، اور پلپلے بازوؤں نے اسکا رنگ اڑا دیا تھا۔ اس نے بال ایسی بے دلی سے بنائے کہ بہت سے تو ادھر ادھر اڑتے رہ گئے۔ اس کا دماغ سمٹ کر آنکھوں کے پپوٹوں میں آ گیا تھا۔

جب اس نے آئینہ رکھا تو اسے میز کے کونے میں بائیبل رکھی نظر آئی۔ یہ بچپن میں سال گرہ کے موقعہ پر پاپا نے اسے دی تھی، مدتوں سے اسے اس نے دیکھا تک نہیں تھا۔ اس پر گرد پڑی تھی۔ اس کتاب نے اسے پھر پاپا کی یاد دلا دی۔ وہ اسے اٹھانے پر مجبور ہو گئی۔ پہلے ہی صفحہ پر اس کا نام لکھا تھا۔ اب کہ جب وہ شہر جائے گی تو ہر اقلم ضرور خریدے گی۔ مگر وہ قلم لے کر کیا کرے گی اسے کونا سا بڑا لکھنا پڑھنا ہے۔

اس کے پاپا اسے بائیبل پڑھنے کی کتنی ہدایت کیا کرتے تھے، اور وہ بائیبل کے ورق الٹنے لگی، پیدائش، خروج.....استثنا.....روت.....یرمیاہ.....حقوق.....متی.....لوقا.....

لوقا.....رسولوں کے اعمال.....کہاں سے پڑھے.....آدم

.....نوح.....طوفان.....ابراہیم کشتی .....صلیب.....مسیح.....گرجا کا گھنٹہ گھر.....سب مل کر گرجا جاتے تھے، ہنسی مزاق کرتے تھے۔

اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ کہاں سے پڑھے۔اور اسے جلدی جانا تھا۔اتنا وقت بھی نہیں تھا، مگر اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب وہ ہر روز بائیبل پڑھا کرے گی۔ورنہ کم سے کم اتوار کو ضرور پڑھا کرے گی۔.....لیکن دعا تو مانگ ہی لینی چاہیئے۔بہت ہی بری بات ہے۔ماما دعا مانگے بغیر کبھی نہیں سونے دیتی تھیں۔اور پھر اس میں وقت بھی کچھ نہیں لگتا۔اور لگے بھی تو کیا ہے۔دنیا کے دھندے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اس نے دماغ کو ساکن بنانا چاہا، اور آنکھیں بند کرلیں، مگر اس کے باوجود پہلے اس کی ماما اور پھر پاپا آنکھوں میں گھس آئے، اس نے آنکھیں کھول کر سر کو جھٹکے دیئے۔آخر دماغ بالکل خالی ہوگیا۔اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں، اور دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔اے میرے باپ تو جو آسمانوں پر ہے، جو پاک مانا جاتا ہے۔تیری بادشاہی آئے۔جیسے تیری مرضی آسمان پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر ہو۔ہماری روز کی روٹی ہمیں دے۔اور ہمارے قصوروں کو معاف کر، جیسے ہم بھی اپنے قصوروں کو معاف کرتے ہیں۔کیونکہ قدرت جلال ابد تک تیرا ہی ہو۔آنکھیں کھولنے پر اس نے کچھ اطمینان سا محسوس کیا۔اس کی جی چاہا کہ وہ کوئی خاص دعا مانگے۔اس کا تبادلہ شہر میں ہو جائے۔مگر اس صورت میں اسے ولیمن کا سامنا کرنا پڑے گا۔اس سے تو یہ قصبہ ہی بہتر ہے۔وہ ایک کہانی تھی کہ ایک پری نے ایک شخص سے تین باتیں پوری کرنے کا وعدہ کیا.....پھر آخر کیا.....

سڑک پر پہنچ کر اس پر محض جلدی پہنچنے کا خیال غالب تھا۔اور وہ سڑک کی نالی، ریت سب سے بے پرواہ اپنا راستہ طے کرنے میں لگی تھی۔سڑک پر کھیلنے والے لڑکے ابھی تک نہ نکلے تھے۔اس لئے اسے اپنی آنکھ، کان، ناک کی حفاظت کی ضرورت نہ تھی۔جب وہ دیوار کے سایہ مین سے گزرتی تو اس کے پاؤں اور بھی

تیزی سے اٹھنے لگتے۔

وہ جل دہی بازار میں پہنچ گئی۔ شیخ صفدر علی کا مکان اب تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا۔ اور اطمینان سا ہو گیا تھا کہ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ چلی جا رہی تھی کہ اس کی نظر ایک دکان دار پر پڑی۔ وہ اپنے سامنے والے کو آنکھ سے اشارہ کر رہا تھا، اور مسکرا رہا تھا۔ ممکن ہے وہ پہلے سے کسی بات پر ہنس رہے ہوں، وہ آگے بڑھی تو آواز آئی بھئی آج آسمان نیلا ہے۔ بڑے دن مین ایسا ہوا ہے آج..... اس نے چاہا پلٹ کر چھتری رسید کر دے۔ اس ب دتمی زکے چاہے کچھ بھی ہو، آج وہ کھڑی ہو جائے۔ اور صاف صاف کہہ دے، کہ وہ ان لوگوں کی باتیں اچھی طرح سمجھتی ہے۔ اب اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ پیر من من کے بھاری ہو گئے تھے، جس سے وہ کئی دفعہ چلتے چلتے ڈگمگا گئی۔ وہ اپنی ساڑھی میں کچھ سکڑ سی گئی۔ اس نے پلہ اچھی طرح سینے پر کھینچ لیا۔ اور سر جھکا کر قدمون کو سڑک پر سے اکھاڑنے لگی۔

جب وہ شیخ صفدر علی کے مکان پر پہنچی تو کچھ لوگ ڈیوڑھی میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے۔ اور ایسے شکایت آمیز لہجے میں جیسے اس نے کوئی نایاب موقع ہاتھ سے نکل جانے دیا ہو، جس پر شیخ جی کو اس سے ہم دردی تھی بولے:

اخاہ۔ میم صاحب! بڑی ہی دیر کر دی تم نے تو۔

جی ہاں..... وہ ذرا دیر ہو گئی۔ کہتی ہوئی وہ زنانہ کی طرف بڑھی، جب وہ دروازہ پر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ قصبہ کی پرانی دائی بائیں ہاتھ پر کپڑے اور داہیں ہاتھ سے لوٹا ہلاتی صحن سے گزر رہی تھی۔ یہ کہتی ہوئی، جرا دیکھ تو..... ابھی تک نہ نکلی گھروے سے حرام جادی!

شادی کی ضرورت

افسانہ نگار: محمد احسن فاروقی

نجمہ نے اپنی سہیلیوں کے جھنڈ میں شامل ہو کر ایک اشتہار نکالا، اور کہنے لگی دیکھو یہ عجیب اشتہار ہے۔

اشتہار کسی خبر کا تراشہ تھا۔ اور اس پر موٹے موٹے حرفوں میں شادی کی ضرورت''

لکھا ہوا تھا، کئی لڑکیوں نے دیکھا۔ وہ بولیں ایسے روز ہی اشتہار نکالا کرتے ہیں، قیصر نے اشتہار کے برابر ایک تصویر دیکھی، اور کہنے لگی یہ لوگ اشتہار کے ساتھ تصویر بھی دیتے ہیں، کہ ان کی شکل وصورت سے بھی کوئی مرعوب ہو جائے۔ تصویر بنوا لیتے ہیں کسی اچھے فوٹو گرافر سے تا کہ اچھی ہی لگے۔ اصل میں وہ اتنے اچھے نہیں ہوتے،

کیا تم نے آزمایا ہے، روز ہی آزماتی رہتی ہے۔ زرینہ بولی آخر اسے اچھی صورت ہی کی تلاش ہے۔

تم اپنی اپنی اڑانے لگیں سنو تو اشتہار میں کیا لکھا ہے۔ نجمہ بولی۔

مجھے صورت شکل کی ضرورت نہیں، آدمی مالدار ہونا چاہیئے'' انجم نے کہا

نجمہ نی ترش رو ہو کر کہا اچھا سنو تو پھر اپنی اپنی اڑاتی رہنا،

فہمیدہ نے اپنی عینک کا برج سنبھالتے ہوئے کہا۔ مال دار صورت شکل اچھی۔ یہی کچھ لکھا ہوگا۔ مجھے عالم اور قابل آدمی چاہیئے۔

اچھا نجمہ نے کہا۔ پہلے تم سب اپنی اپنی پسند دبتا ہی لو، جب میں اشتہار پڑھوں گی۔ زرینہ تمہیں مصنف چاہیئے، عمدہ اور مشہور تم مجھے بتا چکی ہو۔ فہمیدہ کو عالم

اور قابل یعنی ان کے الفاظ بھی انیکچول چاہیئے، انجم ک ورو پیہ کا ڈھیر چاہیئے۔ بڑا بینک بیلنس اور دو ہزار کی تنخواہ۔ شاہدہ کو جیسے زرینہ کہہ چکی ہے، اچھی صورت کا اور تندرست مرد چاہیئے۔ اور قیصر تمہیں کیا چاہیئے۔ یہ سب کچھ ہی چاہیئے۔

ایسا ممکن ہی نہیں شاہدہ بولی،

خیر اب اشتہار کو سنو، ایسا ممکن ہے جب ہی تو میں نے اشتہار کو کاٹ لیا ہے۔ سنو تو، اب باتیں نہ بناؤ

۔بعد میں جتنی چاہے باتیں کر لینا۔

اچھا، اچھا، اچھا...... سب نے کہا اشتہار پڑھو ہم نہ بولیں گے

نجمہ پڑھنے لگی،

شادی کی ضرورت

ایک صاحب کو رشتہ کی ضرورت ہے۔ ان کو لڑکی مین کچھ نہیں دیکھنا ہے۔ ان کے حالات یہ ہیں۔

(۱) مال دار شخص ہیں۔ ایک لاکھ کا بینک بیلنس ہے۔ دو ہزار کی تنخواہ ہے۔ اچھا بنگلہ ہے جو ذاتی ہے۔ عمدہ موٹر رکھتے ہیں۔

مجھے ان سے دلچسپی ہو گئی۔ انجم بولی،

ٹھہرو، سنو آگے، نجمہ نے کہا

(۲) تعلیم اعلیٰ ترین ہے۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری انگلستان سے حاصل کر رکھی ہے۔ ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔

خوب فہمیدہ نے کہا

(۳) مشہور مصنف ہیں، نقاد، افسانہ نگار، مضمون نگار وغیرہ، شاعری بھی کرتے ہیں۔

زرینہ نے کہا تصویر دیکھوں مشہور رہوں تو رسالوں میں تصویر ضرور چھپی ہو گی،

میں نے ضرور دیکھی ہوگی میں پہچان لوں گی، اور وہ اشتہار نجمہ کے ہاتھ سے لینے کے لئے بڑھی، نجمہ نے اپنا ہاتھ الگ کرتے ہوئے کہا بے قراری کس چیز کی ہے، پہچان لینا بعد میں۔ ابھی اشتہار تو پورا کرنے دو،

(۴) صورت شکل اور پرسنالٹی کا اندازہ تصویر سے لگالیجئے۔

اشتہار ہمیں دو، ہم غور سے شکل دیکھیں گے، قیصر نے کہا۔

ابھی ٹھہرو، نجمہ نے کہا۔

(۵) ''نہایت ہم درد اور ملنسار انسان ہیں۔ آزمایا جاسکتا ہے،

ہمیں اس کی ضرورت نہیں، سب لڑکیوں نے کہا، پہلے پہلے سب ہم درد اور ملنسار بنتے ہیں، اور پھر خبیث نکلتے ہیں یہ کچھ نہیں، اچھا ہمین اشتہار دے دو نا۔ ہم سب دیکھنے کے لئے بے قرار ہیں۔

نجمہ نے اشتہار زمین پر رکھ دیا اور سب اس پر جھک گئیں، بڑی بڑی آنکھیں، اونچی ناک، لمبا چہرہ، رنگ کا تصویر سے اندازہ نہیں ہوسکتا، مگر گورا ہی ہوگا

کالا ہوتا تو تصویر دوسری طرح آتی، گورا یا زیادہ سے زیادہ سانولا ہوگا۔ آدمی شاندار ہے، سوٹ بھی عمدہ سلا ہوا لگ رہا ہے۔ ٹائی بھی عمدہ قسم کی معلوم ہورہی ہے۔ سب درست ہی ہے۔

مگر اصل کو دیکھا جائے۔ ایسا ہے بھی کہ نہیں؟۔ قیصر نے کہا،، پتہ کیا دیا ہے۔؟

دیکھتی نہیں یہ کیا لکھا ہے پوسٹ بکس نمبر ۲۸۶۸

نجمہ نے کہا ایسا آدمی جدھر سے بجاؤ ٹھن سے بولتا ہے۔ ہر معاملہ میں کامل، پھر اسے چھپانے کی کیا ضرورت تھی، صاف صاف اپنا پتہ لکھ دیتا۔

اگر سچ مچ ایسا ہوتا تو ہر لڑکی کا باپ دوڑتا، اور شادی ہوچکی ہوتی۔ اشتہار دینے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ کوئی بڑی خرابی ضرور ہوگی جس کو ٹال گیا ہے۔ کوئی بڑا فراڈ

ہے، قیصر نے کہا۔

انجم بولی ہٹاؤ بھی اشتہاروں کو۔ میں ایسے فراڈ میں نہیں پڑتی۔ کیا معلوم بینک بیلنس بھی جھوٹ ہو، اور تنخواہ بھی،

نجمہ نے کہا یہ کوئی بات نہیں، ہم دریافت کر سکتے ہیں۔ کہ کون شخص ہے۔ اور پھر اس اشتہار کی صحت کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

تو کیا ہم سب۔ یا ہم میں سے کوئی اس پوسٹ بکس نمبر ۲۸۶۸ پر خطوط لکھیں، اور جواب کے منتظر رہیں۔ نہیں، نہیں۔ یہ نہیں ہوگا، شاہدہ نے کہا کسی مرد کو بیچ میں ڈالنا چاہیئے۔

سب ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ وہ کالج کے اس لان پر بیٹھی تھیں، جسے لیڈیز لان کہتے ہیں۔ اور رک وکالج کے عقب پر ایسی جگہ تھا۔ جہاں آتے جاتے لڑکوں کی نظر نہ پڑے۔ اگر کسی لڑکے کو کسی لڑکے سے ملنے کی خاص ضرورت ہوتی تو وہ ایک طرف لان کے درمیان کے راستے پر آجاتا، اور لڑکی وہاں اس سے جا کر مل لیتی، ورنہ کوئی نہ کوئی، کسی نہ کسی بہانے وہاں ہر وقت نظر آجایا کرتا تھا۔

آج ادھر کوئی لڑکا بھی نہیں آرہا ہے شاہدہ نے کہا۔

تو کیا ہم ہر لڑکے کو اشتہار دکھائیں گے اور اس سے دریافت کرنے کو کہیں گے۔

ہر لڑکے کو نہیں، اگر کوئی ادھر ہوتا تو اس سے جاوید کو بلوا لیتے۔ نجمہ نے کہا۔

ہاں جاوید ٹھیک رہے گا۔ سب نے اتفاق کیا۔

وہ آئے گا ضرور'' قیصر نے کہا۔ آج درجے تو ہو نہیں رہے ہیں۔ وہ ادھر ادھر کہیں ہوگا، تعجب ہے کہ اسے آج ہمارا خیال نہیں آیا۔

ہاں قیصر پر تو وہ جان چھڑکتا ہے۔ نجمہ نے کہا۔

وہ سب ہی کے پیچھے لگ جاتا ہے، انجم بولی، لسوہے۔

نہیں قیصر سے زیادہ اسمارٹ رہتا ہے۔

ہم لوگ یہاں زنانے لان پر آ کر بیٹھ گئے، خواہ مخواہ، آج درجے تو ہو ہی نہیں رہے۔ سب اپنے اپنے گھر جا رہے ہیں۔ یہاں بھی ہمارے سوا اور لڑکیاں نہیں ہیں۔ لڑکے بھی سب چل دیئے ہوں گے۔

مگر جاوید ادھر ہو کر ہی جائے گا قیصر نے کہا۔

تم سے کہہ دیا ہو گا اس نے، زرینہ بولی۔

ان کا دل کہہ رہا ہو گا۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ وہ آئے گا ضرور۔ انجم نے کہا۔

وہ سن یونہی باتیں بنا رہی تھیں کہ جاوید آ گیا۔

سب ایک آواز میں کہنے لگیں، یہاں آ جاؤ، اس لان پر۔

کیسے یہ لیڈیز لان ہے پکڑا گیا تو کالج سے ریسٹکشن ہو جائے گا۔

کوئی اور یہاں نہیں ہے، ہم سب تمہاری ساتھی ہیں۔ پرنسپل سے شکایت کرنے کون جائے گا۔؟

آخر ضرورت بھی کیا ہے۔ میں رسک نہیں لیا کرتا۔ تم سب جانتی ہو۔ جاوید بولا،

آج رسک بالکل نہیں ہے، شاہدہ نے کہا۔

پھر بھی کون سی ایسی ضرورت ہے کہ میں اس لان میں تم سب کے درمیان آ کر بیٹھ جاؤں۔ کون بے ہوش ہو رہی ہے، جو میں فسٹ ایڈ کے لئے آؤں۔

ہم سب ہی کو فسٹ ایڈ کی ضرورت ہے۔ قیصر نے کہا۔

فرسٹ ایڈ، جاوید نے تعجب سے کہا۔

ہاں فرسٹ ایڈ ہی سمجھو، پورا علاج بعد میں ہوتا رہے گا۔ آتے ہو کہ نہیں۔؟ یا یوں ہی ہچکچاتے رہو گے۔ انجم تڑاخ سے بولی۔

اگر پرسش ہوئی تو کہہ دیں گے قیصر کی طبیعت خراب ہوگئی تھی ،فرسٹ ایڈ کے لیے تمہیں بلا لیا۔

بہر حال جاوید ان کے درمیان آکر بیٹھ گیا، اور اشتہار پڑھنے لگا۔ پھر اشتہار نجمہ کو دیتے ہوئے بولا، اچھا میں سمجھا کہ فرسٹ ایڈ کیا ہے۔ تم سب ہی کو اس شخص سے دلچسپی ہوگی ہے۔ فرسٹ ایڈ یہ ہوگی کہ میں اس پوسٹ بکس نمبر پر خط لکھوں اور جواب کا منتظر رہوں۔

خوب خوب، سمجھے۔ آج سے تمہارا نام فرسٹ ایڈ رکھ لیا۔ اب یہی کہا کریں گے ،قیصر بولی۔

ہر معاملے میں پہلا ہی قدم مشکل ہوتا ہے۔ جیسے لکھنے میں پہلا جملہ، اور اگر وہ مل جائے تو اس میں سے سارا مضمون یا افسانہ نکلتا چلا جاتا ہے۔ فہمیدہ نے کہا۔

تم اپنی کتابی مثالیں، چھوڑو، انجم نے کہا۔

جاوید اشتہار میں دی گئی تصویر کو غور سے دیکھنے کے بعد بولا ،صورت تو دیکھی ہوئی یاد آتی ہے، کبھی کہیں ملاقات ضرور ہوئی ہوگی ۔مگر آدمی بے ڈھب قسم کا ہے۔ ہونٹ کیسے جمے ہوئے ہیں ۔قوت ارادہ کا پکا ہے۔ چہرہ پر استقلال بھی ہے۔

یار گویا اک مسالہ پیسنے کی سل بھی ہے۔

جب توے کی طرح پتھر کا اس کا دل بھی ہے

فصل سرما میں حسیں لڈو بنا کر بیچ لیں

لب پہ شیرینی بھی ہے، ماتھے پہ صد ہا تل بھی ہے۔

اب بنو......نہیں تمہاری شاعری ہم جانتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ اب کرو گے کیا۔ فہمیدہ نے کہا۔

جاوید نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ چچا غالب کو بھی ایسا ہی مرحلہ پیش آیا ہوگا۔

جب ہی تو کہہ گئے ہیں

جانا پڑا، رقیب کے گھر پر ہزار بار.....اے کاش جانتا نہ تیری راہ گزر کو میں۔

اچھا میں جاؤں گا ہزار بار۔ مگر پہلے اس پوسٹ بکس کو خط لکھا جائے گا۔ جس میں تم سب بند ہو جانا چاہتی ہو۔

جاوید نے کچھ سوچ کر کہا، قیصر تم مجھے اپنی کاپی دو، اور قلم بھی۔ میں ابھی ڈرافٹ کرتا ہوں،

میں کیوں دوں،، نجمہ کی کاپی اور قلم لو۔ اسی کو سب سے زیادہ دل چسپی ہے۔ اسی نے یہ اشتہار دیکھا، اور ہم سب کو سنایا،،

میری دل چسپی کی ایک ہی کہی۔ میں نے تو تم سب کی دل چسپی ایک جگہ پر یعنی ایک آدمی میں دیکھی، مجھے خود ان باتوں مین سے ایک میں بھی دل چسپی نہیں ہے۔ میں شادی کو بھی پر اسرار چیز سمجھتی ہوں، جب کوئی پر اسرار اثر مجھ پر ہوگا، تو اس کے ماتحت شادی کر جاؤں گی۔

اف،، اف یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب ''تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا''

خوب خوب، جاوید بولا، نجمہ سچ مچ بادہ خوار، بادہ ء تہذیب مغرب کے چڑھاؤ، خم پہ خم''

یہ ہم لوگ کدھر بھٹکے جا رہے ہیں، کام کی بات کرو۔ انجم نے کہا'' لو یہ میری کاپی اور قلم لو، اور خط لکھو۔

یہ بات ہے۔ انجم رئیلسٹ زندہ باد ہے۔ نجمہ مسٹیک آئڈیلسٹ مردہ باد۔ شاہدہ نے نعرہ لگایا۔

جاوید قلم ہاتھ میں لے کر اور کاپی کو زمین پر رکھ کر لکھنے لگا، اور کچھ دیر بعد کاپی کو ہاتھ میں لے کر بولا۔ لو بھئی یہ خط ہو گیا۔

جناب من۔تسلیم

آپ کا اشتہار دیکھ کر میری چھ عدد کلاس فیلو بے تاب ہوگئی ہیں۔ بلکہ جان بلب کہیئے۔آپ جلد سے جلد مجھے بتایئے، کہ آپ سے کہاں ملاقات کروں۔اور ان چھووں زخمیوں کو بھی ساتھ لاؤں تا کہ ان کیدم میں دم آئے۔دیر نہ کیجئے گا چھ جانیں جارہی ہیں

فقط

جاوید احمد

یہ خط ہے یا مذاق،،زرینہ بولی،اس کو وہ مذاق سمجھ کر ویسٹ پیپر باسکٹ میں ڈال دے گا۔

یا اپنے پوسٹ بکس میں رکھ لے گا۔پوسٹ بکس اور ویسٹ پیپر باسکٹ میں زیادہ فرق نہیں ہے۔

اس جاوید سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔سارا معاملہ خراب ہوجائے گا۔شاہدہ نے کہا۔

یہ خط نہیں جائے گا شاہدہ نے کہا،فہمیدہ نے کہا'' سیدھی سی بات لکھو۔لاؤ میں اس خط کو ٹھیک لکھ دوں۔

یہ جھگڑا ہو ہی رہا تھا کہ پراکٹر مونیٹر آ گئی۔اور تیوری پر بل ڈال کر لڑکیوں کی طرف بڑھتی چلی آئی۔اور سخت لہجے مین کہن یلگی تم سب ابھی تک گھر کیوں نہیں گئیں۔کب کی چھٹی ہو چکی ہے۔اور جاوید کو اپنی ناراضگی کا نشانہ بناتے ہوئے بولی۔اور تم جاوید یہاں لیڈیز لان میں کیوں گھس آئے،تم بھی پراکٹر مونیٹر ہو تم کو قاعدہ جاننا چاہیئے۔

ہاں پراکٹر مونیٹر ہوں،اس لئے تو آنا پڑا ان لڑکیوں کی فرسٹ ایڈ کے لئے۔

کیوں ان کو کیا ہوا۔

ان کو اڑک دھچکی ہوگئی ہے۔

اڑک دھچکی کیا ہوتی ہے؟

بڑی عجیب بیماری ہے۔ سب میں، یعنی سب جوان لڑکیوں کو ہو جاتی ہے۔ تم بھی اپنے آپ کو اس سے محفوظ نہ سمجھو۔ کسی دن کسی وقت تم کو بھی ہو سکتی ہے۔ پھر مجھ سے ہی فرسٹ ایڈ کراؤ گی۔

آخر یہ بیماری ہے کیا؟

تم جانتی ہو دھچکا کسے کہتے ہیں۔ اس کا مونث دھچکی ہوا۔ مونچ بھی اور ڈمونیٹو بھی، دھچکا بڑا ہوتا ہے۔ دھچکی چھوٹی ہوتی ہے۔ دھچکا لگا تو بڑا شاک لگا۔ دھچکی لگی تو بہت خفیف سا جھٹکا لگا، اور اڑک کے معنی ہوئے بے ساختہ اڑلر لگا۔ اب بات یوں سمجھو کہ کوئی بات روزنامہ میں یا ریڈیو اور ٹی، وی پر ایسی آئی کہ اڑتا ہوا دھچکا دے گی۔ اور کوئی لڑکی پریشان ہوگئی تو یہ کہیں گے کہ اس کے اڑک دھچکی لگ گئی ہے۔

یہ مرد کے نہیں لگتی؟

کیوں نہیں۔ مرد کے لگتی ہے، مگر اس کا نام شادی کی ضرورت ہوتا ہے۔ مرد آخر مرد ہوتا ہے۔ شرماتا نہیں صاف صاف کہہ دیتا ہے، بلکہ اخبار میں چھپوا دیتا ہے۔ شادی کی ضرورت ہے۔ وہ نہ شرماتا ہے، نہ چھپاتا ہے۔ نہ پریشان ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے عالم کو اڑک دھچکی نہیں کہا جاتا۔ اب سمجھیں تم ابھی جوان ہی ہو۔ تم کو بھی اڑک دھچکی لگ سکتی ہے۔

یہ سب خرافات میں سننے کو تیار نہیں۔ تم سب کے سب رفو چکر ہو جاؤ۔

جی ہاں اب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ آپ کے اشتہار میں کوئی بات ذرا سی بھی غلط نہیں ہے۔ آپ ہر طرح

ٹھیک ہیں۔ مگر آپ ایسے شخص کو جدھر سے بجاؤ ٹھن سے بولتا ہے۔ اشتہار کی ضرورت کیوں پڑی۔

جیسے محض آپ کے اشتہار سے کئی لڑکیاں متاثر ہوگئیں۔ ویسے آپ کو دیکھ کر اور مل کر نہ جانے کتنی لڑکیاں متاثر ہوئی ہوں گی۔ آپ کسی سے بھی شادی کر لیتے۔

جی ہاں میں بھی یہی سوچا کرتا تھا، جاوید صاحب میں یہاں یونیورسٹی میں ایم، اے کر کے یو کے گیا۔ وہاں پی، ایچ، ڈی کرتا رہا۔ کافی تعداد میں عورتوں سے دوستی ہوئی۔ وہ شادی کر کے یہاں آنے کو بھی تیار تھیں۔ مگر میں یہ سوچتا رہا کہ غیر ملکی عورت سے شادی کرنا اپنے ملک کی عورتوں پر ظلم ہے۔ ایک قسم کا قومی خسارہ ہے۔ اور یہاں آ کر پندرہ برس سے شادی کی فکر میں ہوں، مگر بات نہیں جمتی۔

لیکن اکثر بدصورت عورتوں سے بھی تو لگاؤ ہو جاتا ہے۔ اور ایسا کہ کیا کہیئے۔

مگر عاشق کے لئے تو وہ بھی حسینوں کی حسین ہوتی ہے۔ بہر حال کسی جگہ ملاقات کے بعد کوئی صورت دل میں بس گئی۔ اور بسی رہی۔ اب خیال ہوا کہ یہ کسی طرح قریب آئیں، تعلقات بڑھیں اور شادی کی نوبت آئے۔ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ جتنی لڑکیوں سے مجھے عشق ہوا۔ وہ پڑھی لکھی تھیں۔ یعنی کم سے کم گریجویٹ تھیں، مجھے انگچول عورت چاہیئے تھی۔ اور ظاہرہ ایسی ہی ملیں۔

ظاہرہ سے آپ کا کیا مطلب؟

یعنی ترکی، مصر، وفلسطین کے حالات میں غرق، ہر موضوع پر اپنی رائے دیتی ہوئی۔ انگچول سوسائیٹی کو پسند کرتی ہوئی۔ مگر زیادہ قریب سے دیکھا تو ظاہرہ چمک تھی۔ مثلاً ایک بڑی پڑھاکو تھی، مگر کیا پڑھتی تھی یہی سنسنی خیز قصے، ایک دن مین نے ان قصوں کے پڑھنے کو بد ذوقی کہا تو بگڑ کر الگ ہوگئیں نہ جانے کتنی انگچول عورتوں سے ملاقات ہوئی مگر سب ٹائیں ٹائیں پھس،،

خیر میری تنخواہ ہر سال بڑھتی گئی۔ مکان، موٹر وغیرہ تو والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ انھوں نے ہی اپنے خرچہ پر ولایت میں پڑھوایا۔ ملازمت بھی ان کے اثر سے ملی۔ میرے خرچے زیادہ نہ تھے، کھانے، کپڑے، تفریح پر کچھ بھی خرچ نہ کرتا۔ ان

کتابوں پر کافی خرچ ہو جاتا۔ میرا بینک بیلنس بڑھتا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ننانوے فیصد لڑکیوں کے لئے یا ان کے خاندان والوں کے لئے یہی اٹریکشن تھا۔ آپ کی دوستوں میں انجم بھی اسی قسم کی ہیں۔ جی ہاں انجم صاف اپنے لالچ کا اظہار کر دیتی ہے۔ ورنہ دوسری لڑکیاں کہتی تو بہت کچھ ہیں۔ مگر ان کے دل میں بھی بینک بیلنس اور اونچی تنخواہ کی خواہش چھپی ہوتی ہے۔ عورتیں زیادہ تر شادی سے اپنا کیریر بنانا چاہتی ہیں۔

مگر میں نے کچھ ہی دن برت کر دیکھا، کہ ایسی لڑکی دیوالیہ نکال دے گی خرچہ کے سلسلہ میں میں جو احتیاط برتنے کا عادی ہو گیا ہوں وہ بگڑ جائے گا۔

پھر مجھ پر مصنفی سوار ہو گئی۔ ہر قسم کی چیزیں لکھنے اور پڑھنے لگا۔ آج کل لڑکیاں زیادہ لکھ رہی ہیں۔ مگر یہ لکھنے والیاں زیادہ تر بد شکل ہوتی ہیں۔

شکل اور رنگ سک میں کوئی نہ کوئی ایسی خرابی ہوتی ہے کہ پھر دیکھنے کو جی نہ چاہا۔ جو اچھی شکل وصورت کی ہوتی ہیں۔ ان کی شادی جلد ہو جاتی ہے۔ امریکن کہتے ہیں۔ کہ ہو عورت کی قسمت یہ ہے کہ وہ گائے ہو جائے۔ ہمارے یہاں یہ مثال اور بھی صادق آتی ہے۔ وجدانی، ذوقی، ذہنی رجحانات ڈھل کر صفا چٹ میدان ہو جاتا ہے۔ اور بچے دینا، اور گھر کی دیکھ بھال ہی رہ جاتا ہے۔ یہ انکچول

اور مصنفائیں ایسے کاموں سے الجھتی ہیں۔ میرے دوست کہتے ہیں کہ شادی کرنا ہو تو کوئی گھریلو جاہل لے آؤ۔ گھر تو ٹھیک چلائے گی۔

ایسی تو آپ کو بڑی آسانی سے مل جاتیں جتنی آپ چاہتے۔ نہیں میاں اب ایسی رہی ہی نہیں جا رہیں، نیچے والے طبقے میں بھی لوگ لڑکیاں پڑھا رہے ہیں۔ اور ہمارے طبقے والے لوگوں کا عقیدہ ہے، کہ ڈگری سب سے بڑا جہیز ہے۔ تو یہ لائن بھی ختم، میں نے ملازماؤں کی لڑکیوں کو تاکا۔ مگر ان کی فطری پستی فوراً سامنے آ گئی۔ اور محسوس ہوا کہ یہ تو بڑا عذاب بن جائیں گی۔ جی ہاں اک کمینہ پن بڑا

تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں نے دیہات کی ایک بارہ سالہ لڑکی چھانٹی، اس کے باپ اور ماں دونوں کو ملازم رکھا۔ مگر جب اس پر خاص توجہ دی تو وہ سر پر چڑھ گئی۔ ہر وقت جھوٹے گہنے، پیسے اور کپڑے

مانگا کرتی۔ میں نے طے کیا کہ اس سے نکاح کر کے قصہ ختم کروں، بیوی بھی رہے گی اور نوکرانی بھی،

مگر غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اپنی اوقات بھولی جا رہی ہے۔ جی لگا کر گھر کا کام کاج کرنے کی بجائے وہ بیگم بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ اس کے ماں باپ بھی ساس، سسر بن کر نوابی مل جانے کی فکر میں تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے سر پر ایک آفت کھڑی کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی خالہ کو بلایا اور اس نے سب کو ڈانٹ کر گھر سے نکال دیا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ جان بچ گئی۔ جی ہاں جدید دور میں جمہوریت اور خاص طور سے اشتراکیت نے اکثر لوگوں کو نیچے سے اوپر اٹھا رکھا ہے۔ عورتیں کام کرنے کی بجائے دن بھر سوتی ہیں، یا پھر نوکروں سے لڑتی ہیں۔ نہ خود کوئی کام کرتی ہیں۔ نہ انہیں کرنے دیتی ہیں۔ تو آپ ان سب تجربے کر لیئے اور اب شادی کی ضرورت کا اشتہار دیا۔

اشتہار کو میں نے انکلی ڈھیلے کی طرح استعمال کیا ہے۔ یعنی آنکھیں بند کر کے ایک ڈھیلا پھینکا ہے۔ جس کے لگ جائے گا اس سے شادی کروں گا۔

آپ کا مطلب یہ ہے کہ شادی کے سلسلہ میں سوچنا سمجھنا اور واضع مقصد رکھنا فضول ہے۔ اور غلط ہے۔

بالکل غلط

تو آپ کسی پرانے قسم کے خاندان کی کسی پرانی قسم کی لڑکی سے شادی کر لیتے۔ ایسی کی تو صورت بھی نہ دکھائی جاتی۔ اب زمانہ اور خاندان بالکل بدل گئے ہیں۔ اس لئے اس کے مزاج اور کردار کا بھی اندازہ نہ ہوتا۔ مجھے ایسے ہی ہے کہ جس لڑکی

سے میں شادی کروں۔ وہ معقول طور پر پڑھی لکھی ضرور ہو۔ مگر مخصوص مقصد سے شادی کرنے والیوں سے میں دور بھاگتا ہوں۔

خیر یہ فلسفہ چھوڑیے اور بالکل واقفیت اور حقیقت پر آیئے۔ اب آپ ان سب لڑکیوں سے واقف ہو گئے ہیں جنہوں نے آپ کے اشتہار کی طرف توجہ دی،

ان میں سے ہر ایک میری کوئی ایک بات کی طرف متوجہ ہے۔ شاہدہ کو اچھی شکل وصورت چاہیئے، مگر میں اب جوان پٹھا تو ہوں نہیں، آخر اتنا سن آ گیا ہے۔ اس لئے اس کے جذبات مجھے دیکھ کر ٹھنڈے ہی ہو گئے۔ انجم میری آمدنی دیکھ رہی ہے۔ اس کے ساتھ مجھے ایسا ہی ہو جانا پڑے گا۔ پروفیسری چھوڑ کر بڑی ملازمتوں کے چکر میں پڑ جاؤں۔ روپیہ کے لئے دوڑ میں شریک ہو جاؤں۔ اور زندگی عذاب ہو جائے۔ فہمیدہ انگچول ہر وقت بحث کرتی رہے گی، اور گھر ڈبیٹنگ سوسائیٹی ہو جائے گا۔ زرینہ مصنف ہر وقت لکھنے لکھانے میں رہے گی۔ گھر کیا رسالے کا دفتر ہو جائے گا۔

قیصر مجھے بہت پسند ہے۔ اور وہ کچھ چاہتی بھی نہیں۔ وہ ٹھیک رہے گی۔ قیصر؟ جاوید کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

مجھے یہ بھی احساس ہے کہ آپ کی نگاہ اس پر ہے۔ اور میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ آنکھیں بند کر کے اسے چھانٹ لو۔

اب نجمہ ہی رہ جاتی ہے، اشتہار کا اشتہار اس نے کیا۔ وہ پانچویں بات سے مرعوب ہے۔ اور اپنا کوئی واضع مقصد نہیں رکھتی۔ پہلے پہلے وہ مجھے سب سے کم اچھی لگی تھی مگر اب ہر روز زیادہ سے زیادہ اچھی لگ رہی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اسی کو پرپوز کروں، اور اسی سے شادی کر لوں۔

میرا بھی اندازہ یہ ہے کہ اس کا سن بھی سب سے زیادہ ہے۔ آپ کی اور اس کی خوب نبھے گی اور اس میں استقلال بھی زیادہ ہے۔ اور میں آپ کا شکر گزار ہوں

کہ آپ نے مجھے بھی صحیح راہ دکھا دی۔ قیصر مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ اور میری اور اس کی خوب نبھے گی۔ آپ سے مل کر اور آپ کے معاملے
میں پڑ کر مجھے یہ سبق ملا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

ہرچرن چاولہ

داشتہ

ڈیڈی..... آج میں پیڈ پر ''ہیمبرگ۔ ۲۷ اپریل ۱۹۷۲ء لکھا ہی تھا، کہ میرا ہاتھ رک گیا، دل نے کہا، تم تو یہ دوستی نبھا نہیں سکے گا۔ کیوں کہ آپ جانتے ہی ہیں کہ مجھے لکھنا نہیں آتا، یہی غنیمت ہے کہ تھوڑا بہت پڑھ سکتا ہوں۔ پھر مجھے ایک راہ سوجھی۔ کیوں نہ اپنی آواز ٹیپ پر ریکارڈ کر کے آپ کو بھیج دیا کروں، اس طرح آپس میں بات چیت میں آسانی رہے گی۔ اور مجھے لکھنے کی زحمت سے بھی چھٹکارا مل جائے گا۔ اگر میں لکھنے کے قابل ہوتا، تو تین سال لگاتار میٹرک کے امتحان میں فیل کیوں ہوتا۔ بہر حال میٹرک کا سرٹیفکیٹ تو آپ نے مجھے کسی نہ کسی طرح دلوا ہی دیا، اور یہاں جرمنی بھی بھجوا دیا، اب اس خط کے ذریعے میرا مطلب ہے۔ اس ٹیپ کے ذریعہ آپ کو خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دے رہا ہوں،

ڈیڈی مجھے راستے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہوائی جہاز سے فرینکفرٹ اترا، ٹرین میں بیٹھا، اور ستیش کے پاس ہیمبرگ پہنچ گیا۔ ستیش مجھے لینے نہیں آیا تھا۔ لیکن مجھے آپ کا دیا ہوا سبق یاد تھا، جس سے بڑی آسانی سے میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ آپ فکر نہ کریں، وہ مجھے چھوڑے بھی تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ ویسے مجھے ستیش کے ہاں کوئی تکلیف نہیں۔ کھانا اچھا کھاتا ہوں اور ڈٹ کر کھاتا ہوں، اور جیب خرچ بھی وہ کچھ نہ کچھ دے ہی دیتا ہے۔ اور کچھ میں بھی اڑا لیتا ہوں۔ یہاں جرمنی میں بہت اچھی اور خالص ملتی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو فوٹو بھیجوں گا تو آپ مجھے

پہچان بھی نہیں سکیں گے۔ کل ستیش کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے اپنے اسٹور پر کام بھی دلوا دے گا۔

اچھا اب اجازت چاہتا ہوں۔ ٹیپ ختم ہو رہا ہے۔

ہاں دوسری سائیڈ خالی ہے۔ ادھر آپ فلمی گانے وغیرہ بھر لیجیئے، ممی کو نمستے۔ ننھے کو پیار۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔ ڈاک خانے سے یہ ٹیپ آپ کو پوسٹ کرنا ہے۔

ڈیڈی..... مجھے کام بھی ملا، اور چھوٹ بھی گیا۔ مالک مجھے پندرہ دن ہی رکھ سکا۔ اگر وہ مجھے نہ چھوڑتا، تو میں یہ کام خود ہی چھوڑ دیتا۔ آپ تو جانتے ہیں، وہاں بھی آپ نے مجھے کئی کاموں پر لگوایا تھا۔ مگر کہیں بھی ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ٹک سکا۔ بلکہ بعض اوقات تو آپ کی سائیکل اور اپنی تنخواہ بھی وہاں چھوڑ آتا، میں نہیں جانتا، کہ میرے اندر کون سا بادشاہ چھپا ہوا ہے۔ جو ان چھوٹے چھوٹے کاموں سے سمجھوتہ کر ہی نہیں سکتا۔ ڈیڈی جیسے ہی کوئی کام مجھے اپنی مرضی کے مطابق اور شیان شان ملا، میں اسے ضرور جم کر کروں گا۔ ویسے آپ فکر نہ کریں یہاں ہر آدمی کپڑے بھی پہنتا ہے۔ مکان کے اندر بھی سوتا ہے۔ اور روٹی بھی کھاتا ہے۔ چاہے وہ کوئی کام کرے یا نہ کرے۔ میں نے کئی آدمیوں کو مصیبت زدہ اور فکرمند تو دیکھا ہے مگر روٹی، کپڑے اور مکان کے بغیر نہیں دیکھا۔ یہاں تو کام سے جواب ملتے ہی تنخواہ کا لفافہ بھی مجھے ساتھ ہی مل گیا تھا۔

مگر اس سے میں نے ایک جاپانی کیمرہ خرید لیا۔ اس سے مجھے دوسرے ممالک جانے کی سہولت رہے گی۔ ایسی چیزوں سے پولیس کو یقین ہو جاتا ہے، کہ میں واپس انڈیا ضرور جاؤں گا۔ اور وہ لوگ مجھے انٹری ویزہ بل اچوں چرا دے دیتے ہیں۔ دوسرے کبھی پیسوں کی ضرورت پڑ گئی تو میں اسے بیچ بھی سکتا ہوں۔ ہاں یہاں رہنے کا اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔ کہ میں جرمن زبان کا سٹوڈنٹ بن

جاؤں۔ستیش میرے تمام اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہے۔اب دیکھیے کیا ہوتا ہے، اگلے خط (یعنی ٹیپ) میں آپ کو مفصل حالات سے آگاہ کروں گا۔ممی کو نمستے، ننھے کو پیار۔

ڈیڈی.....اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے میرے قیام کے سلسلے میں ستیش کی تمام کوشیش ناکام رہیں۔وہ تو بہت بھاگا دوڑا، میں ہی پیچھے رہ جاتا تھا۔منزل پر تو مجھے پہنچنا تھا۔جب میں ہی سست تھا تو اسکی تیز رفتاری کس کام آتی۔آپ جانتے ہیں، عادتیں جاتے جاتے ہی جاتی ہیں۔خیر آپ فکر نہ کریں، اوپر والا ایک دروازہ بند کرتا ہے، تو کئی دروازے کھول دیتا ہے۔ستیش مجھے اپنے ایک دوست کے پاس کوپن ہیگن بھیجنا چاہتا ہے۔آج اس کے ٹیلی فون پر اس سے بات بھی ہو چکی ہے۔میں کل صبح کو ڈھائی بجے کی گاڑی سے روانہ ہوں گا۔پھر بھگوان کو جو منظور ہوگا وہی ہوگا۔ ڈیڈی آپ فکر نہ کیا کریں۔ممی سے بھی کہیں کہ مگن رہے۔جس نے منہ دیا ہے وہ کھانے کو بھی ضرور دے گا۔نہیں دے گا تو مجھے اور بھی طریقے آتے ہیں۔وہاں بھی تو مندر ہے۔آپ تو میرے سارے ہتھکنڈے جانتے ہی ہیں۔آخر شاگرد کس کا ہوں۔یہ لوگ اگر کچھ میرے لئے کر رہے ہیں، تو میرے لئے کچھ نہیں کر رہے ہیں۔اپنا ہی کسی پچھلے جنم کا ادھار اتار رہے ہیں۔یہی قول تھا نا آپ کا؟ ورنہ آج کل کون کسی کو دانہ ڈالتا ہے۔آپ کو یاد ہے، آپ نے چاچا رام لال کو بھائی بنا کر لوٹا۔ اپنے محکمے کو آپ مائی باپ کہہ کر کھاتے رہے۔تو ڈیڈی آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ کیا آپ مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھتے۔؟ اگر آپ زندگی میں کامیاب رہے تو میں بھی کامیاب رہوں گا۔پھر آپ کی دعائیں بھی میرے ساتھ ہیں۔..... ہیں نا ڈیڈی؟ اچھا اب چلوں ستیش کا کچھ راشن لانا ہے۔اسٹور پانچ بجے بند ہو جاتے ہیں۔

یہ خدمت میں نے خود ہی ستیش سے اپنے سر لے لی، کیونکہ اس طرح اپنی بھی کچھ خدمت ہو جاتی ہے۔اگلا خط (یعنی ٹیپ) آپ کو نخی جل پری کے شہر کوپن ہیگن

سے بھیجوں گا۔ سب ک ونمستے، پیار، اف ٹیپ کا پیک کرنا اور پوسٹ کرنا بھی ایک پرابلم ہے۔ کاش کوئی یہ ڈیوٹی مجھ سے سنبھال لے۔ کچھ انگریزی کے الفاظ ان سطروں میں آ گئے ہیں۔

دراصل میں آج کل انگریزی بولنے کی کوشش کر رہا ہوں، بہت کام آئے گی، کیسے، یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ ذرا آنے والے حالات کا جائزہ لے لوں۔

ڈیڈی..... آپ کے چرنوں کے صدقے میں جل پری کے شہر آ ہی گیا۔ ستیش کا دوست رندھیر بہت اچھا لڑکا ہے۔ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ اتنے بڑے فلیٹ میں وہ اکیلا رہتا ہے۔ مگر اب تو میں اس کا ہمدم بن گیا ہوں۔ وہ صبح سویرے کام پر چلا جاتا ہے۔ پیچھے تین کمروں کے اتنے بڑے فلیٹ میں میں اکیلا رہ جاتا ہوں۔ پھر اپنے پو بارہ ہوتے ہیں یعنی پانچوں گھی میں۔ آپ یوں نہ سمجھیں کہ میں گھی میں ڈوب کر اپنے مقصد سے بھٹک گیا ہوں۔ ڈیڈی میں نے ہمیشہ آپ کو اپنا آئیڈیل سمجھا ہے، اور دل سے آپ کی پوجا کی ہے، مجھے یاد ہے جب آپ گوڑا اسٹیشن پر جاتے تھ یتو ممی میری ڈیوٹی لگاتی تھیں کہ میں دیکھ کر آؤں کہ آپ گاڑی پر ریواڑی کی طرف تو نہیں جا رہے ہیں۔ میں چھپ کر آپ کی چوکیداری کرتا تھا۔ مگر آپ ریواڑی کی دوسری جانب دلی جانے والی ٹرین مین بیٹھ جاتے تھے، مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے۔ تو گاڑی جانے کے بعد بھی میں سٹیشن پر موجود رہتا۔ پھر آپ دہلی سے آنے والی گاڑی سے جو اگلے اسٹیشن پر آپ کی گاڑی کو کراس کرتی تھی، اتر کر ریواڑ چلے جاتے تھے، آپ گاڑی میں چھپ کر نکل جانے کی کوشش تو بہت کرتے، مگر میں تاڑ ہی لیتا۔ پھر جب میں ممی کو آپ کے ریواڑی جانے کی اطلاع دیتا تو وہ ماتھا پیٹ لیتیں اور کہتیں، یہ رانڈ میرا کلیجہ کھا کر ہی چھوڑے گی۔ ڈیڈی اب آپ سے کیا چھپانا، ایک دن اس رانڈ کو میں نے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں آپ کے ساتھ دیکھ لیا۔ سچ ڈیڈی مجھے تو وہ بہت اچھی لگی تھی،

.....ممی سے کئی گنا زیادہ خوبصورت اور جوان، آپ جب بھی اس سے مل کر واپس آتے تو آپ کے جسم پر نیا سوٹ، نیا سوئیٹر یا نئی قمیض ضرور ہوتی تھی، کبھی کبھی آپ ہم لوگوں کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ضرور لاتے تھے، پھر میں سوچتا تھا کہ ممی کو سونے کا انڈا دینے والی مرغی نہ جانے کیوں بری لگتی ہے۔ بس ڈیڈی جب سے میں نے آپ کو اپنا ہیرو بنالیا تھا، اور سوچ لیا تھا کہ میں بھی آپ کی طرح کوئی مرغی ضرور تلاش کروں گا۔ مگر وہاں میرے ساتھ جو تقدیر کھیل کھیلتی رہی۔ آپ سے چھپا ہوا تھوڑا ہی ہے۔

آپ کو تو معلوم ہے۔ وہاں میری شادی ہی آپ کے لئے مسئلہ بن کر رہ گئی تھی، اول تو کوئی مجھے اپنی بیٹی دینے کو تیار ہی نہ تھا۔ اگر دیتا تو آپ کب ماننے والے تھے، پہلے تو صرف میں ہی تھا۔ پھر بیوی آتی، پھر بچے، آپ کس کس کو پالتے۔ میں کسی کام پر ٹکتا تو تھا نہیں۔ خیر ڈیڈی تقدیر نے میرے لئے اور پروگرام مرتب کر رکھے تھے، اس لئے میں یہاں پہنچ گیا۔ آج کل میری تقریباً ہر شام شمشن کلب میں گزرتی ہے۔ یہاں مرغیاں تو بہت ہیں۔ مگر میں ایسی مرغی تلاش کر رہا ہوں جو دانہ تو میرا کھائے، مگر سونے کا انڈا بھی ضرور دے۔

ڈیڈی آج آپ سے کافی باتیں ہوگئی ہیں۔ آج میں سی۔۶۰'' کا لمبا ٹیپ لایا تھا۔ آپ سے بہت سی باتیں جو کرنا تھیں۔ اچھا اب رخصت، رندھیر کے آنے سے پہلے یہ ٹیپ آپ کو پوسٹ کردوں، پھر وہ مجھے تیر اندازی سکھانے باہر لے جائے گا۔ ویسے آپ کی دعا سے میں خود فن تیر اندازی کا اچھا ماہر ہوں۔ بس یہاں ذرا ڈھنگ بدلنا ہے۔ کچھ روز کی پریکٹس کی بات ہے۔ پھر کوئی اچھا سا نشانہ لگانے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ اچھا آداب۔

ڈیڈی..... جرمنی میں اپنی طرف کے لوگ، یعنی ہندوستانی اور پاکستانی، طالب علم بن کر یا ان اجازت طریقے سے رہ کر چوری چھپے کام کر کے روپیہ کماتے ہیں، مگر

ڈنمارک چھوٹا سا ملک ہے۔ اس لئے یہاں ناجائز طریقے سے رہنا اور کام کرنا مشکل ہے۔

ہان ناروے میں آج کل کام کرنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ مگر اس کے لئے تقرری کے خط کے ساتھ اپنے ملک سے ناروجین ایمبیسی کی معرفت درخواست دینا پڑتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہاں کی کسی لڑکی سے شادی کر لی جائے۔ پھر وہ یہاں خود رہنے اور کام کرنے کا پروانہ دلا دیتی ہے۔ ڈیڈی میں دوسرا طریقہ ہی آزمانا چاہتا ہوں، اس مین ایک پنتھ دو کاج والی بات نظر آتی ہے۔ آج کل کچھ لڑکیاں میرے قریب آ رہی ہیں، کچھ کے پاس میں پہنچ رہا ہوں، ۔ یوں سمجھیے وہ میرے اور میں ان کے ٹرائل سے گزر رہا ہوں، مگر ڈیڈی آپ جانتے ہیں مین کچی گولیاں نہیں کھیلا۔ میں تو اس پنچھی کی تلاش میں ہوں جو خود ہی اپنے پر میری قینچی کے نیچے رکھ دے۔ اور انڈا ابھی سونے کا دے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے دکھ کے دن بیت گئے ہیں۔ کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔ جلد، بہت جلدی، اچھا ممی کو نمستے،، ننھے کو پیار۔

ڈیڈی..... کافی دن کے بعد تم سے باتیں کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ دراصل ان دنوں میں بہت مصروف رہا ہوں، تم سن کر خوش ہو گے کہ آخر میں نے ایک چڑیا پھانس ہی لی، معاف کرنا ڈیڈی میں نے آپ کو تم سے مخاطب کر دیا۔ آج کل میں بڑے زور شور سے انگریزی بول رہا ہوں، یہ جو باتیں میں آپ سے کر رہا ہوں، یہ میرے انگریزی میں سوچنے والے ذہن کی دین ہیں۔ اور انگریزی میں آپ یا تم دونوں کے لئے ایک ہی لفظ you ہے۔ خیر مطلب کی بات یہ ہے کہ آج کل ایک بہت ہی اچھا پر کٹا پنچھی ہاتھ لگا ہے۔ مجھے اس سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ یہ ایک انگریز لڑکی ہے۔ لندن سے سیر کرنے یہاں آئی ہے۔ اس سے میری ملاقات کلب میں ہوئی وہ مجھے ہر طرح سے ٹھوک بجا اور پرکھ رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں

یہ میدان ضرور مارلوں گا، اور آپ کو انگلینڈ کی راجدھانی سے اگلا خط لکھوں گا۔ (میرا مطلب ہے ٹیپ بھیجوں گا)

ڈیڈی اس دوران میرے دو ٹیپ تمہیں مل گئے ہوں گے۔ ان میں تمہیں حالات اور خیریت سے آگاہ کرنا مطلوب تھا۔ اس بار پھر تم یعنی آپ سے باتیں کرنے میں دیر ہوگئی۔ میں نے لزا کو ہر طرح سے شیشے میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔ مگر وہ راہ پر آ ہی نہیں رہی ہے۔ ویسے اب ہم ایک ساتھ ہی رہ رہے ہیں، خرچ وہی اٹھا رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اب وہ مجھے کچھ کچھ چاہنے لگی ہے۔ دراصل ڈیڈی ادھر کی لڑکیاں کئی مردوں کے ساتھ رہنے، انہیں پرکھنے، اور ٹھوک بجا کر دیکھنے کے بعد ہی شادی پر رضامند ہوتی ہیں۔ میں لزا کو لائن پر لانے کی پوری کوشش کر رہا ہوں، کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ وہ میرے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتی، مگر شادی کا ذکر سنتے ہی وہ بدک اٹھتی ہے، میں وجہ جاننے کی پوری کوشش کر رہا ہوں، اس کے البم میں میں نے دوسرے دوستوں کے فوٹو دیکھے ہیں، جن کے ساتھ وہ اب تک رہتی تھی ہے۔ مگر ڈیڈی مجھے ماضی سے کیا مطلب، اس کے حال کا میں ہی اکیلا مالک ہوں، بس مجھے تو اتنا ہی معلوم ہے۔ پھر آپ تو جانتے ہی ہیں۔

کہ میں آپ ہی کا دوسرا روپ ہوں، اچھا اب بس لزا کو یہ ٹیپ دے دوں۔ تا کہ وہی اسے پوسٹ کر دے۔ اس طرح ڈاک خرچ مجھے نہیں دینا پڑے گا۔ پہلے بھی میرے کچھ ٹیپ اسی نے آپ کو بھیجے ہیں۔

ڈیڈی..... میں اور لزا ہنی مون منانے سٹاک ہوم جا رہے ہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی یہاں رندھیر اور لزا کے دوستوں کی موجودگی میں ہماری ایک چرچ میں شادی ہو گئی۔ دراصل ڈیڈی لزا کی عمر اکیس سال سے کچھ کم تھی، اس لئے وہ بالغ ہو جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ وہ میرا بھی مکمل جائزہ لے رہی تھی، اس وقت اس کے دل کی بات مجھے معلوم نہ تھی، مگر شادی کے بندھن میں بندھنے کے بعد اس نے

مجھے سب کچھ بتا دیا۔

کچھ دن سٹاک ہوم گزارنے کے بعد ہم اوسلو جائیں گے۔ پھر وہاں سے لندن کے لئے پرواز کر جائیں گے۔

ڈیڈی اب بھگوان کی دیا سے اور آپ کے آشیرواد سے پھر میرے اچھے دن آ گئے ہیں۔ میں عرصہ زندگی کا لطف لے لوں، پھر ضرور گھر آؤں گا۔ ہو سکا تو لزا کو بھی ساتھ لاؤں گا۔ کل کہہ رہی تھی، اتم، ہم اپنی کار کیوں نہ خرید لیں۔ مگر ڈیڈی یہاں اسکینڈی نیویا میں کاریں بہت مہنگی ہیں۔ میں اسے انگلینڈ ہی میں کار خریدنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ اس کے پاس پیسہ بہت ہے۔ مگر اب مجھے اس کا پیسہ ضائع کرنا اچھا نہیں لگتا۔ آخر اس کے اور میرے پیسے میں کوئی فرق تو ہے نہیں۔ میں اس کے پیسے کو اپنا پیسہ ہی سمجھتا ہوں۔ اور اس کی ہر چیز کو اپنی چیز سمجھتا ہوں۔

ڈیڈی..... ہم گھومتے پھرتے لندن آ ہی گئے۔ لزا کا باپ بڑا امیر آدمی ہے۔ وہ ایک بہت بڑے پب (شراب خانے) کا مالک ہے۔ لاکھوں کی آمدنی ہے۔ یہاں آتے ہی انہوں نے میری بہت عزت کی، الگ فلیٹ لے کر دیا۔ ساز و سامان اور لزا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں بخوشی پکڑا دیا۔ ڈیڈی آپ کہتے تھے۔ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ لیکن ڈیڈی آپ لندن دیکھتے تو سمجھتے جیسے آپ ابھی ابھی جنم لے رہے ہیں۔ بہت ہی خوبصورت شہر ہے ہر طرف حسن کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ دل چاہتا ہے اس کی لہروں میں اتر جاؤں۔ اور خوب نہاؤں۔ مگر نہیں ڈیڈی ابھی مجھے لزا سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔

بہت سا پیار، اور پیار کی بہت سی قیمت۔ میرا انشورنس کارڈ ڈیڈی نے..... میرا مطلب ہے لزا کے ڈیڈی نے بنوا دیا ہے۔ اب کام بھی مل جائے گا۔ نہیں تو اپنے ڈیڈی کا پب تو ہے ہی۔ اس میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دوں گا۔ اور اس طرح مجھے بھی ہاتھ مارنے میں آسانی رہے گی۔

ڈیڈی،لزا کو ہندوستان دیکھنے کا بہت شوق ہے۔وہ مرسیڈیز خرید لے تو پھر ہم کار ہی میں ہندوستان آئیں گے۔وہ ہندوستان دیکھ لے گی، اور میں راستے میں دوسری دنیا، اور آپ سونے کے انڈے حاصل کرسکیں گے۔اچھا اب ختم کروں۔ باہر لزا کار کا ہارن بجا رہی ہے۔اسے یہ ٹیپ اپنے ساتھ لے جانا ہے۔وہ میرے لئے کچھ کپڑے خریدنا چاہتی ہے۔اور ساتھ ہی فلیٹ کی سجاوٹ کا کچھ اور ساز وسامان بھی،اچھا اب رخصت۔۔

ڈیڈی..... مجھے آپ کے دو خط مل گئے۔میں ان دنوں بہت ہی مصروف رہا ہوں، مجھے یہاں آکر پتا چلا ہے، کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ادھر میں کچھ دوسرے جہانوں کی سیر کو ہی گیا تھا۔ڈیڈی

میں کوئی فرشتہ تو نہیں،لزا بہت اچھی لڑکی ہے، بہت پیار کرنے والی، ہندوستانی کلچر کی دیوانی،مگر ڈیڈی میں کیا کروں، مجھے میری بھی بہت اچھی لگتی ہے۔لوسی تو بس کبوتری ہے کبوتری، اور روزی تو اپنا سارا پیار مجھ پر الٹ دیتی ہے۔ان دنوں اور بھی کئی لڑکیوں سے ملاقات ہوئی ہے۔زندگی کا اصل مزہ تو اب آیا ہے۔مجھے آپ نے لکھا ہے کہ مغربی حسینائیں بے وفا ہوتی ہیں۔یہ بالکل ٹھیک ہے یہاں کے تین w, s یعنی work ,women,weather (کام،عورت،موسم) پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔مگر ڈیڈی میں بھی یہاں زیادہ سیریس نہیں ہوں،لزا بے وفا نہیں،مگر ہے تو آخر مغربی عورت ہی۔کل کو اس کا کیا بھروسہ۔آپ وہاں میری شادی کا کسی سے ذکر نہ کریں۔اور کوئی اچھی سی لڑکی میرے لئے دیکھ رکھیں۔

آپ لزا کی فکر نہ کریں۔میں اسے ایک داشتہ سے زیادہ کا درجہ نہیں دیتا۔آخر میں اس کے ماضی کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ماضی میرا بھی زیادہ اجلا نہیں،مگر آپ کہتے تھے نا کہ مرد کی اور بات ہوتی ہے۔مجھے اب یہاں کام اور رہنے کا اجازت نامہ بھی مل گیا ہے۔لزا سے تو اب مطلب کا واسطہ ہے۔اگر وہ مجھے چھوڑ دے گی تو ٹھیک

ہے۔ورنہ میں اسے چھوڑ دوں گا۔کیونکہ اب میں مکمل طور پر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہوں۔اچھا اب ٹیپ لزا کے حوالے کر دوں۔وہ جانے ہی والی ہے۔جگہ تو ابھی ٹیپ پر کافی ہے۔مگر لزا کو جانے کی جلدی ہے۔

.....ڈیڈی، یہ میں بول رہی ہوں، مجھے آپ کی زبان ٹھیک طرح نہیں آتی، بس کام چلا لیتی ہوں،میرے پہلے دوستوں میں ایک سریندر موہن بھی تھا۔اس نے مجھے ہندی کچھ کچھ سکھا دی تھی، ڈیڈی مجھے ہندوستانی اور ہندوستانی کلچر سے بہت عشق تھا۔

اس لئے میں کسی ہندوستانی سے شادی کر کے ایک اچھی ہندوستانی بیوی بن کر رہنا چاہتی تھی،مگر اتم کمار کے ٹیپ اور آپ کے خطوط سے مین نے اندازہ لگایا کہ آپ اور وہ مجھے صرف مطلب نکالنے کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔یہاں تک کہ اتم خود اپنے کہنے کے مطابق مجھے ایک داشتہ سے زیادہ کی اہمیت نہیں دیتا۔اس لئے اب میں بھی اسے ایک رکھیل سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی۔اب میں نے پھر پرانے دوستوں سے ملنا ملانا شروع کر دیا ہے۔اتم جب تک میرے پاس رہنا چاہے رہ سکتا ہے۔ میں اسے خرچ دیتی رہوں گی، کیونکہ ایک رکھیل کا خرچ برداشت کرنا بہر حال میرا فرض ہو جاتا ہے۔اچھا،باقی، پھر کبھی۔آپ کی کبھی تھی بہو!

عذرا آپا

افسانہ نگار: عادل رشید

نہ معلوم مجھے عذرا آپا سے جتنی محبت تھی، امی کو ان بے چاری سے اتنی ہی نفرت، بلکہ اسے کچھ زیادہ ہی رہی ہوگی۔ وہ عذرا آپا کا ہنسنا، بولنا، کھانا پینا ایک آنکھ نہ دیکھ سکتیں۔ اور تو اور وہ عذرا آپا بے چاری کے اٹھنے، بیٹھنے، بولنے، بات کرنے تک مین کیڑے نکالتیں۔ نہ معلوم کیا بات تھی کہ امی کو ان بے چاری میں سدا کیڑے ہی دکھائی دیتے۔ جہاں کوئی بات بری لگی، یا کوئی کام مرضی کی خلاف ہوا، عذرا آپا کا نام لیا جانے لگا۔ اس کام کا ان سے تعلق ہو یا نہ ہو، گن گن کر انہیں صلواتیں سنائی جانے لگیں۔ بدتمیز، پھوہڑ، کام چور، نکمی، زبان دراز، مردار جیسے شائستہ، مہذب اور گراں بہا خطابات سے انہیں نوازا جاتا۔ اور وہ بے چاری ہیں کہ چپ۔ اگر غلطی نہیں ہے تب بھی اسے مانے لے رہی ہیں۔ تھوڑی تھوڑی ہوئی جارہی ہیں۔ شرمندگی ظاہر کررہی ہیں۔ اور چپ چاپ جلدی جلدی ہر کام کے لئے ادھر سے ادھر پھر رہی ہیں۔ دوڑ رہی ہیں۔ البتہ جب کبھی اس قسم کے مواقع آتے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ امی کی مہربانی سے دن ورات میں جب کئی کئی مرتبہ اس قسم کی ڈانٹ پھٹکار ان پر پڑتی تو وہ بےحد افسردہ ہو جاتیں، ان کی دلی کیفیات کا عالم ان کے افسردہ سنجیدہ اور معصوم چہرے سے صاف نمایاں ہوتا۔ ان کے سرخ گلاب جیسی نازک پنکھڑیوں جیسے ہونٹ مرتعش ہو جاتے۔ آنکھوں میں پانی بھر آتا جسے وہ ہمیشہ پی جاتیں۔ جتنی جلدی وہ امڈے ہوئے آنسوؤں کے سیلاب کو وہ پی جانے کی عادی ہوتی جارہی تھیں۔ وہ بے چاری کبھی بھول کر بھی ان کی بات کا جواب نہ دیتیں۔ انہوں نے ہمیشہ خاموشی کو گویائی پر ترجیح دی۔ وہ ہمیشہ سے گھر کا

سارا کام خود کرتیں۔ چھوٹے چھوتے بھائی بہنوں کا ہر طریقے سے
خیال رکھتیں۔ اور بھائی میاں کے ہمیشہ آگے پیچھے پھرا کرتیں۔ ہم لوگوں کا سارا حکم گویا ان کے سر آنکھوں پر تھا۔ اور وہ سب تھے، کہ ان پر بالکل اپنی خاص الخاص خادمہ جیسا رعب جمائے، بات بات میں چڑیل، بدتمیز، بے ہودہ، نالائق کہہ دینا ان کے نزدیک کوئی بڑی بات ہی نہ تھی، اور تو اور ان سے چھوٹی عمر کے بچے بھی اوروں کی دیکھا دیکھی انھیں جھڑکتے، انھیں گھڑکیاں دیتے۔ لیک نوہ چپ رہتیں۔ اس لئے کہ اگ رکبھی بھول سے بھی ان کیچوں کو ڈانٹ دیں، کہ یہ ان کی بدتمیزی ہے، تو امی چیل کی طرح جھپٹ کر آتیں۔ اور ایک زبان میں لاکھوں صلواتیں بلا کچھ پوچھے گچھے سن اکر رکھ دیتیں۔ اور اس طرح امی کی شہ پر یہ باشتیے اور بھی گستاخ اور شیر بن جاتے۔

عذرا آپا ہماری حقیقی بہن نہیں تھیں بلکہ وہ ہماری مرحومہ خالہ صاحبہ کی واحد یادگار تھیں۔ جنھیں خالہ مرحومہ نے مرتے وقت اپنی چہیتی بہن یعنی ہماری امی کے یہ کہہ کر سپرد کر دیا تھا۔ کہ دیکھئے باجی یہ میری معصوم بچی آپ کے سپرد ہے۔
اب اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ نہ ماں نہ باپ۔ اگر
اسے ذرا بھر تکلیف ہوئی، تو میری روح ک وسکون نہ ہوگا۔ میں حشر کے دن آپ کی دامن گیر ہوں گی۔

اور امی نے مرتے وقت اپنی بہن سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کے جیتے جی کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اور اس ک بیچ دے بے چارہ کالہ اماں سکون کے ساتھ مرسکی تھیں۔ اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ ان کے مرتے ہی ان کی آٹھ سالہ بچی کو گھر بھر کی خدمت گزاری پر مامور کر دی گئی۔ اس سے خادماؤں، اناؤں، اور چھوکریوں جیسا کام کرانا شروع کر دیں گی۔ بے چاری عذرا آپا نے اس جہنم میں جلتے بھنتے، آٹھ سال گزارے تھے۔ اب ماشا اللہ وہ جوان تھیں۔ ایک سولہ برس کی

دوشیزہ، خوبصورت، حسین، انتہائی حسین۔ اتنی خوبصورت جنھیں دیکھ کر اللہ میاں کے حسن پسندانہ طبیعت کے معیار کی داد دل سے دینی پڑتی ہے۔

ثروت بھیا ہمارے چچا زاد بھائی تھے، بے حد ہنس مکھ

اور زندہ دل، بات بات میں کھلے جاتے، ج بکبھی چھٹیوں مین علی گڑھ سے آتے تو سارا گھر لوٹن کبوتر بنا پھرتا، دن عید اور رات شب برات کی مصداق بن جاتی۔ جس کا دل چاہے ثروت بھیا کے زمانے میں گھر آ کر دیکھ لے۔ ثروت بھیا کی چھٹیاں کچھ اتنی جلدی ختم ہو جاتیں، کہ کچھ پتا ہی نہ چلتا، کہ وہ کب آئے تھے، اور کب گئے۔ بس ایسا معلوم ہوتا کہ انھیں آئے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ ابھی گنتی کے تین چار دن ہی تو ہوئے تھے۔ حالانکہ ان کو آئے ہوئے پندرہ بیس دن ہو چکے ہوتے، اور وہ مجبوراً ہم سے جدا ہو جاتے۔ ہماری دلچسپیاں نیم مردہ ہو کر رہ جاتیں، ختم ہو جاتیں، مر جاتیں، اس وقت تک کے لئے جب تک وہ انہیں دوبارہ آ کر زندہ نہ کریں۔ وہ ہماری دلچسپیوں کے مسیحا تھے، شاعری وائری کی دنیا کے خیالی مسیحا نہیں۔ بلکہ اسی مادی دنیا کے

سینکڑوں دفعہ کے آزمائے ہوئے مسیحا۔

ثروت بھیا کا عذرا آپا سے بے حد دل چسپی تھی۔ وہ ان کا بڑا خیال رکھتے تھے، وہ جب علی گڑھ سے آتے تو ان کے لاکھ چھپانے پر بھی ان کی کسی نہ کسی حرکت پر بے ساختہ ظاہر ہو ہی جاتا کہ وہ محض ہم لوگوں کی خاطر نہیں بلکہ بطور خاص عذرا آپا کے لئے اتنا لمبا سفر طے کر کے موقع ملتے ہی علی گڑھ سے بھاگ آتے ہیں۔ وہ جتنے دن یہاں رہتے، ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی کہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنے وقت کا زیادہ حصہ عذرا آپا کی معیت میں گزار دیں۔ اگر ان کی قربت نہ نصیب ہو تو نہ سہی، تنہائی میسر ہو نہ ہو، وہ چاہتے کہ کسی نہ کسی طرح ان کے آس پاس ہی منڈلاتے پھریں۔ ان کی خواہش ہوتی، دلی خواہش ہوتی کہ ان کی باتوں کا ایک ایک فقرہ

اور ایک ایک لفظ عذرا آپا کے کانوں تک پہنچے۔ اور ضرور پہنچے۔ اس لئے وہ گھر کے سارے بچوں کو اکٹھا کر کے خواہ مخواہ کے لئے اس جگہ یا اس کے آس پاس موقع ڈھونڈ کر بیٹھ جاتے، جہاں عذرا آپا بیٹھی ہوں۔ یا کام کاج کر رہی ہوں۔ اور اب بس شروع ہو گئیں باتیں۔ ہم لوگوں کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کے لئے باتیں تو گویا بچوں سے کی جا رہی ہیں۔ انھیں کے مطلب کی۔ مگر دراصل راجہ رانی، چڑا، چڑی۔ چور ڈاکو۔ یا ظالم لٹیروں کی بے سر و پا کہانیوں کے در پردہ عذرا آپا سے اپنے مطلب کی بات کہہ رہے ہوتے۔ ان کے ہلتے ہوئے لب، اور لفظوں کی الٹ پھیر، اور لطیف تشبیہ اور استعاروں کی آڑ لے کر اپنے مقصد کی بات ان کے کانوں تک پہنچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اور ان کی دزیدہ نظریں بار بار ان کی طرف اٹھ رہی ہیں کہ میرا پیغام پہنچا بھی کہ نہیں پہنچا، اگر لفظوں کے الٹ پھیر اور تشبیہ اور استعاروں کی معرفت یہ پیغام ہنوش گوش گزار نہیں کیا جا سکا، تو موقع ملتے ہی یہ پیغام آنکھوں آنکھوں میں پہنچا دیا جائے۔

ثروت بھیا، عذرا آپا سے براہ راست اپنے مطلب کی بات بہت کم کرتے، وہ ہمیشہ اپنی بات کے لئے بہانہ تلاش کرتے، ہمیشہ دوسروں کو سنا کر کسی اور کو درمیان میں لا کر وہ عذرا آپا سے بات کرنے کے گویا عادی ہو چکے تھے۔ مثلاً اگر انہوں نے عذرا آپا سے یہ کہنا ہے، کہ تم اس وقت میرے ساتھ سینما یا سیر کو چلو، تو وہ اس طرح کہیں گے کہ بھئی کون ہے، ج و میرے ساتھ اس وقت سینما چلے۔ اگ ر میرے ساتھ کوئی سینما نہ گیا تو مجھے بے حد رنج ہوگا۔ یا یہ کہ کون ہے جو مجھے چنے کا گرم گرم حلوہ بن اکر کھلائے، کون ہے جو میرے ساتھ تاش کھیلے۔ مین برا خوش ہوں گا جو مجھے ہری ساٹن کی شلوار پہن کر دکھائے۔ وغیرہ، وغیرہ، اور عذرا آپا ہمیشہ ان کی اس قسم کی باتوں پر وہی کرتیں، جو وہ چاہتے تھے۔ مثلاً انھوں نے یہ حکم دیا کہ تم اس وقت سرخ سوت پہن لو، تو عذرا آپا لاکھ بہانے کر کے امی کی خفگیوں اور جھڑکیوں

کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، ان کی خوش پوری کر رہی ہیں۔ یا ان کی خواہش پر ان کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ گئیں۔ پھر خواہ انہیں ثروت بھیا کی اس خوشنودی کی کتنی ہی قیمت کیوں نہ چکانی پڑے۔ وہ فکر نہ کرتیں، امی کی لاکھ گھڑکیاں اور صلواتیں سن کر بھی وہ اپنے دل میں بے حد خوش ہوتیں کہ انھوں نے ثروت بھیا کا کہنا پورا کر دیا۔ ان کی خواہش پوری کر دی۔ ان کی بات نہیں ٹالی،

ایک دن حسب عادت عذرا آپا نے ج ونماز کے لئے اٹھنے کی کوشش کی تو باوجود انتہائی کوشش کے ان سے نہ اٹھا گیا۔ انھیں بہت تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ سر درد تھا، اور جسم بھی بری طرح دکھ رہا تھا، مگر انھوں نے نماز کی خاطر اپنی بیماری کی بھی کوئی پرواہ نہ کی، جس طرح بھی ہو سکا بدقت تمام اٹھ گئیں، اور ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے نماز ادا کی

خیر نماز تو انھوں نے جوں توں کر کے پڑھ لی مگر اس کے بعد جو انھیں بخار چڑھا، تو بس اللہ ہی یاد آ گیا۔

تمام جسم بھٹی کی طرح سلگ رہا تھا، پہلے تو امی یہی کہتی رہیں کوئی فکر کی بات نہیں۔ یونہی معمولی بخار ہے اتر جائے گا، مگر جب تمام گھر والوں نے انھیں قائل کیا اور ابا نے بگڑ کر انہیں زوردار ڈانٹ بھی پلائی، تو ان کا دماغ ذرا ٹھکانے پر آیا، وہ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے میں گھس گئیں۔ اور پھر اس وقت تک باہر نہ نکلیں، جب تک کہ نوکروں کو خوب اچھی طرح جھاڑ نہ پلائی۔ اور جب تک انھوں نے اپنے کھسیانے پن کا ثبوت چینی کے چند برتن توڑ کر نہ دیا۔

ڈاکٹر نے عذرا آپا کو دیکھتے ہی ڈبل نمونیہ کا سرٹیفکیٹ یہ کہہ کر تھما دیا کہ اگر ان کی اچھی طرح دیکھ بھال نہ کی گئی تو جان کا خطرہ ہے۔ گھر کے تمام ممبر پریشان ہو گئے۔ ثروت بھیا کا تو پریشانی کے مارے برا حال تھا۔ ان کے چہرے کا رنگ یکسر سفید ہو گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کئی مہینوں کے مریض ہوں۔ گھر

بھر میں وہ سب سے زیادہ پریشان تھے۔ اور ان کی اس حالت سے امی انگاروں پر لوٹ رہی تھیں۔ جیسے کہ عذرا آپا کی اچانک بیماری اور سارے گھر کی ان کے ساتھ ہم دردی، ان کی کھلی توہین اور ظلم ہے۔ عذرا آپا کی طرف سے ان کے نام کھلا چیلنج ہے، کہ دیکھا آخر ہیں نا اس گھر میں ہمارا بھی خیال کرنے والے۔ تم لاکھ چاہو گھر بھر کو ہم سے متنفر کر دو، اس سے کیا ہوتا ہے۔ مارے غم اور رنج کے امی کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

رات کے گیارہ بجے تھے۔ ابا، میں اور ثروت بھیا عذرا آپا کے پاس بیٹھے، ان کی تیمارداری کر رہے تھے، عذرا آپا پر ہنوز غنودگی طاری تھی، وہ اب بھی تقریباً نیم بے ہوش تھیں۔ ابا بھی امی کے مسلسل تقاضوں سے مجبور ہو کر گھر چلے گئے۔ یہ کہتے ہوئے یہ انشا اللہ صبح تک اچھی ہو جائیں گی۔ ابا کے جاتے ہی خدا جانے ثروت بھیا کو کیا ہوا۔ وہ سسکیوں سے رونے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زبردست طوفان کو آہنی بند کے ذریعے روکے ہوئے تھے۔ اور اب وہ بند توڑ کر زور شور سے بہہ نکلا۔ اور عذرا آپا کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر ہو گیا۔ عذرا آپا کو جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ ''آپ رو رہے ہیں'' ان کے منہ سے نکلا، اور ان کی اداس آنکھوں میں مسرتوں کی دنیا ناچنے لگی۔ ان کی مایوس نظروں میں محبت، ایثار، تشکر اور فخر کی ملی جلی بے شمار کرنیں تڑپ اٹھیں۔ آپ..... مجھ بدنصیب کی خاطر..... ثروت بھیا عالم بے اختیاری میں میری موجودگی کی پرواہ کیے بغیر ان کے پیروں سے لپٹ گئے۔ عذرا آپا نے گھبرا کر ان کا سر اٹھایا۔ مجھے گنہگار نہ بنائیے میں اب بالکل اچھی ہوں۔ اچھا چلیے آپ سے وعدہ کر رہی ہوں کہ اب کبھی بیمار نہ پڑوں گی۔ اور سب نے دیکھا کہ صبح باوجود کمزوری، حرارت، اعضا شکنی کے وہ اپنے آپ پر پورا قابو رکھے ہوئے، اپنی تمام قوت برداشت کو بروئے کار لا کر محض ثروت بھیا کی خاطر کہ وہ پریشان نہ ہوں، ہنسی خوشی کی کامیاب کوشش کے ساتھ گھر کے کام کاج میں مصروف رہیں۔ اور امی

انہیں اس طرح کام کاج کرتا ہوا دیکھ کر ہر ایک سے کہتی
تھی کہ دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ معمولی سا بخار ہے۔ صبح تک بالکل ٹھیک ہو جائے
گا۔

عذرا آپا کی تعلیم برائے نام ہی تھی۔ اس لئے کہ امی اور ابا نے انہیں پڑھانے
کی ضرورت ہی نہ سمجھی، یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ دقیانوسی خیالات رکھتے تھے، یا
انہیں تعلیم نسواں کی ضرورت کا اندازہ نہیں تھا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھے
کیوں پڑھاتے۔ میری تعلیم کی انہیں اس قدر فکر کیوں پڑتی۔ اور تو اور وہ فرزانہ اور
رخسانہ تک کی تعلیم کا خاص خیال رکھتے۔ ایک چھوڑ دو استانیاں مقرر تھیں، جو انہیں
اردو سکھائیں۔ ایک ماسٹر صاحب شام کو انہیں انگریزی پڑھانے کے لئے آتے
تھے۔ ابا کا خیال تھا کہ چھ ماہ تک انہیں گھر پر ہی انہماک سے تعلیم دی جائے۔ اور
اس کے بعد انہیں بھی میری طرح گرلز سکول مین داخل کرا دیا جائے۔ ابا شروع ہی
سے تھرڈ کلاس میں سکول داخل کرانا گویا دو سال کی بربادی سمجھتے تھے۔ اور یہ بات تھی
بھی سو فیصدی درست، بھلا یہ کہاں کی عقل مندی تھی کہ تیسری کلاس سے بچے کو ریں
ریں کرایا جائے۔

لہذا یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ وہ تعلیم نسواں کے خلاف نہیں تھے۔
ہاں البتہ وہ عذرا آپا کی تعلیمی ضرورت کو یقینی طور پر نہ سمجھتے تھے،

اس کی دو وجہ تھیں، ایک تو یہ کہ کون غیر لڑکی کے لئے اتنی دردسری اور زیر باری
مول لے۔ دوسرے اگر وہ سکول جانے لگتیں تو گھر کا کام کاج کون کرتا۔ بلا تنخواہ،
بلا ناک بھوں چڑھائے، رات دن امی کی گھڑکیاں کون سنتا۔ ان کے آگے پیچھے کون
ناچتا پھرتا۔ واہ رے انسان، تیری خود غرضی۔ کیا تو اپنے اس ناروا سلوک کے بعد بھی
انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ کیا تو اس قابل نہیں کہ تجھے گولی مار دی جائے۔ تجھے
نیست و نابود کر دیا جائے۔ مٹا دیا جائے تجھے صفحہ ہستی سے۔

ثروت بھیا کو عذرا آپا کی تعلیم کی بڑی فکر تھی، اور وہ بھی اپنے میں یہ کمی بری طرح محسوس کرتیں۔ اور دن رات کڑھا کرتیں، کہ کاش انہیں لکھنے پڑھنے کا موقع مل سکے۔ اپنی اس تعلیمی کمی کے باعث ان میں احساس کمتری کا مادہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اور کبھی کبھی وہ جی کڑا کے امی سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے کہتیں۔ اور وہ امی کو اس بات کا یقین بھی دلاتیں کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے ان لازمی مشاغل کو وہ ہاتھ سے نہ جانے دیں گی، مگر امی نے اس عرضی داشت کو کبھی اہمیت نہ دی۔ وہ صرف یہ کہہ کر اس بات کو ٹال جاتیں کہ میں کہاں منع کرتی ہوں، کہ تم پڑھا لکھا نہ کرو، اور پھر گھر کا کام کاج تم کونسا اتنا زیادہ کرتی ہو۔ جس کی مجھے فکر ہو، کیا نوکر چاکر مر گئے ہیں۔ سارے جو مجھے تمہاری ضرورت ہو، مگر ہاں میں یہ ضرور کہوں گی، کہ جوان لڑکیوں کو اپنا قیمتی وقت ان فضول باتوں میں ضائع نہ کرنا چاہیئے۔ آخر تمہیں پرائے گھر جانا ہے۔ کل کے دن سسرال والے میرا ہی نام رکھیں گے، کہ بیٹی کو کچھ نہ سکھایا۔ امور خانہ داری سے بالکل ناواقف ہے۔ اور امی کے اس استدلال پر میں جل اٹھتی، شرم نہیں، آتی ایسی فضول باتیں بناتے ہوئے۔ اگر عذرا آپا کے پڑھانے لکھانے کی حقیقی وجہ یہ ہے تو وہ اپنی لڑکیوں کے ساتھ یہ ظلم کیوں روا رکھ رہی ہیں۔ کہ انہیں امور خانہ داری کو ہاتھ نہیں لگانے دیتیں۔ کہ وہ سسرال جا کر خون کے آنسو بہائیں۔ عذرا آپا بے چاری دن بھر کی بک بک جھک جھک کے بعد رات کو فرصت ملنے پر گیارہ بجے کے بعد بجائے آرام کرنے کے لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتیں۔ اور وہ رات کے دو تین بجے تک لیمپ کی روشنی میں سر کھپایا کرتیں۔ یہ ان کا روز کا مشغلہ تھا۔ خدا نے انہیں ان کی اس محنت کا اچھا پھل دیا، اور اب وہ اچھی طرح لکھ پڑھ سکتی تھیں۔ بھئی ہم اس سے نہیں بولتے، جسے انگریزی نہ آتی ہو۔ اور دوسرے ہی دن عذرا آپا نے کنگ ریڈر مجھ سے منگوا کر پڑھنی شروع کر دی۔ اور اس میں اس قدر دل چسپی لی۔ اتنا انہماک دکھایا کہ چند ہی دنوں میں کتاب ختم کر لی،

اور دوسری کتاب منگانی پڑی۔ میں بھی دل وجان سے انہیں پڑھاتی، اور وہ بھی خوب محنت کرتیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ثروت بھائی کے علی گڑھ سے دوبارہ آمد سے پہلے ہی وہ اچھی خاصی انگریزی لکھ پڑھ سکتی تھیں۔ اب میں انہیں چھوٹی موٹی انگلش کی کتابیں سکول سے لا دیتی۔ جسے وہ پڑھا کرتیں۔ اور بڑے بڑے مشکل انگلش پیرا گراف کو اردو میں منتقل کر دیتیں۔ میں تو عذرا آپا کے ذہن کی قائل ہوگئی، کاش ایسا ذہن مجھے ملا ہوتا، تو میں انٹر کے گورکھ دھندے سے

آگے بڑھ کر نکل جاتی۔ یہ کمبخت انٹر بڑا مشکل ہے۔

ہماری ماموں زاد بہن شہناز باجی بمبئی میں اپنے ابا کے پاس رہتی تھی، وہاں ان کے ابا کسی بہت بڑی فلم کمپنی کے ڈائیریکٹر تھے۔ وہ کچھ دنوں کے لئے ہمارے ہاں بنارس دیکھنے آئیں، انھیں بنارس دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بمبئی سے تنہا بنارس آئی تھیں، وہ کسی سے ڈرتی ورتی نہیں تھیں۔ بڑی اپ ٹو ڈیٹ تھی، بمبئی کے کسی کالج میں بی، اے کر رہی تھیں

شہناز باجی کو میں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ وہ خوبصورت تھیں۔ مگر ان کی خوبصورتی کا بڑا حصہ میک اپ کا رہین منت تھا۔ لپ اسٹک۔ پاؤڈر، غازہ، روج ان کی زندگی کے اہم ترین جزو تھے۔ ان کے بکس میں ساڑھیوں کی افراط تھی۔

بڑی بڑی قیمتی ساڑھیاں تھیں۔ ان کے پاس ہر فیشن کے جوتے، موزے، سینڈل اور قیمتی زیورات تھے۔ Matching کی بڑی دل دادہ تھیں۔ کیا مجال جو ان کی میچنگ میں ذرہ برابر فرق آئے۔ ان کے آنے سے ہمارا سارا گھر بڑا خوش تھا۔ وہ ہم سب کے لئے بہت قیمتی تحفے لائی تھیں۔ وہ ہر چیز کو دکھاتے ہوئے اسکی پوری تاریخ ہم کو بتاتیں۔ فلاں جگہ بنتی ہے۔ ہندوستان میں تو بس عنقا ہی سمجھیے۔ اور یہ گھڑی بطور خاص پھوپھی اماں میں نے آپ کے لیئے لی ہے۔ پورے سات سو میں ملی ہے۔ فیورلیوبا ہے۔ اور یہ سگریٹ کیس میں نے بطور خاص پھوپھا جان کے لئے

خریدا ہے۔اس نے صندل کے اس سگرٹ کیس کو کھولا تو اس میں پیانو بجنے لگا۔اور ہمارا سارا کنبہ سوائے میرے اور عذرا آپا کے کھل کھلا کر ہنس پڑا۔شہناز باجی نے اپنے تحائف کی حد سے زیادہ تعریف کرتے ہوئے، ہم سب کو بے حد مرعوب کرنے کی کوشش کی، ساتھ ساتھ، بمبئی کی تمام سڑکوں، عمارتوں، اور دکانوں کے مشہور نام گنا دیئے۔

شہناز باجی نے ایک دن امی سے پوچھا۔پھوپھو یہ تصویر کس کی ہے؟

ثروت کی، امی بولیں۔تمہارے پھوپھو میاں کے بھائی کا لڑکا۔علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم، اے میں پڑھتا ہے۔رہتے کہاں ہیں۔وہ یہیں رہتا ہے۔امی نے وثوق سے کہا۔عذرا آپا کا رنگ متغیر ہونے لگا۔اس کے غریب ماں باپ دیہات میں رہتے ہیں۔اس کی تعلیم کا خرچہ ہم برداشت کرتے ہیں۔وہ بھی اس گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہے۔اس کی چھٹیاں ہمیشہ یہاں گزرتی ہیں۔

ہوں انہوں نے تصویر میز پر سے اٹھا کر کہا۔خوبصورت آدمی ہیں۔اور ادھر عذرا آپا کے ہاتھ سے شیشے کا نازک قلمدان گر کر ٹوٹ گیا۔اور سرخ سیاہی تمام فرش پر پھیل گئی۔جیسے کسی کی آرزوں کا تازہ خون۔

ایک ہفتہ بعد آنے والا ہے۔امی بولیں۔

اچھا، شہناز باجی نے مسرت سے کہا۔میں تو گویا پندرہ دن تک یہاں ہوں۔ملاقات ہو ہی جائے گی۔

عذرا آپا شیشے کے ٹکڑے جوڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔کہ امی نے قہر آلود نظروں سے عذرا آپا کو دیکھا، اور کہا کہیں ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بھی جڑے ہیں۔جی..... جی..... عذرا آپا نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔دل نما ٹوٹے ہوئے قلم دان کا بیضوی ٹکڑا ان کی ہتھیلی پر لرز رہا تھا۔

ختم بھی کرو اب یہ قصہ عذرا آپا لرز گئیں۔اور وہ ٹکڑا سرک کر زمین پر گر گیا۔اور

اس کے چار پانچ ٹکڑے ہو گئے۔

ایک ہفتے بعد ثروت بھیا آ گئے۔ عذرا آپا کی عجیب حالت تھی، وہ نہ جانے کس ذہنی کش مکش میں مبتلا تھیں۔ ان کا شگفتہ چہرہ کملا گیا تھا۔ اور ذہنی اذیت کے آثار نمایاں تھے۔

دوپہر کے کھانے پر ہم سب میز کے گرد بیٹھ گئے۔ نوکروں نے کھانا لا کر چن دیا۔ عذرا آپا ابھی تک باورچی خانے میں تھیں۔

عذرا آپا، چلیئے کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔۔ میں نے آواز دی۔ ثروت بھیا کے کان بھی اسی طرف لگ گئے۔

گویا وہ بھی عذرا آپا کے جواب کے منتظر تھے۔ شہناز باجی نے ثروت بھیا کی اس حالت کو بنظر غائر دیکھا۔ میں ابھی آئی کہتی ہوئی عذرا آپا بھی آ گئیں۔ وہ میرے پاس ثروت بھیا سے دوسرے نمبر پر کونے میں تھیں۔ شہناز باجی اور وہ آمنے سامنے تھیں۔ گویا یہ تینوں ایک مثلث کی شکل میں بیٹھے تھے۔

یہ میرے بھائی کی بڑی لڑکی ہے۔ امی نے ثروت بھیا کی طرف دیکھ کر شہناز باجی کی طرف اشارہ کیا۔

جی انہوں نے ایک نگاہ غلط گویا رسماً ان پر ڈالی۔

بہت خوب،

بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ شہناز باجی بولیں

اور مجھے بھی ثروت بھیا نے رسماً جواب دیا۔ اور عذرا آپا کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر طشتری میں جا گرا۔

اور اس کی کچھ چھینٹیں ان کے دوپٹے، شہناز باجی اور ثروت بھیا پر بھی پڑیں۔

ارے ان کے منہ سے نکلا۔ معاف کیجیئے گا میں ابھی آتی ہوں۔

ان کے چلے جانے کے بعد گویا ایسا معلوم ہوا کہ میز سے شمع دان اٹھا دی گئی

ہو۔ثروت بھیا کا یہ ہاتھ خود بخود رکنے لگے۔اور شہناز باجی کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے۔

عذرا آپا اور ثروت بھیا کی زندگی میں شہناز باجی ایک کانٹا بن گئیں۔وہ دونوں کی زندگی میں ایک حد فاضل کھینچ دینا چاہتی تھیں۔وہ عذرا آپا سے ان کی تمام خوشیاں چھین لینا چاہتی تھیں۔انہیں ثروت بھیا پسند آ گئے تھے۔اور وہ جس طرح بھی ہو عذرا آپا کی زندگی ان سے چھین لینا چاہتی تھی۔

مجھے شہناز باجی کی صورت سے ابکائی آنے لگی۔

بڑی آئیں وہاں سے عذرا آپا کی سوکن بن کر منحوس صورت۔

شہناز باجی کو ہمارے ہاں آئے ہوئے دس دن ہو چکے تھے۔ایک دن وہ امی سے کہنے لگیں کہ ثروت بھیا سے کہیں وہ انہیں بنارس گھمالائیں۔امی نے ذکر کیا تو وہ صاف مکر گئے۔کہ وہ عورتوں کو اپنے ساتھ لیے پھرنا اپنی سبکی اور ذلت سمجھتے ہیں۔

مگر شہناز باجی بھلا کب باز آنے والی تھیں۔انہوں نے ایک دن انگریزی میں کہا، مجھے بنارس نہ گھمائیں گے آپ؟۔مگر وہ چپ رہے۔

کیا آپ بہرے ہیں۔

جی ہاں میں آپ کی طرف سے بہرہ، گونگا سبھی کچھ بن جانا چاہتا ہوں آخر کیوں؟

ثروت بھیا کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ امی نے انہیں روک دیا اور ذرا ترش روئی سے بولیں۔مہمانوں کے ساتھ کیا ایسا سلوک کیا جاتا ہے جاؤ ثروت انہیں گھمالاؤ۔ ان کا آخری جملہ تحکمانہ تھا، اور انہیں بادل نخواستہ امی کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی

انھوں نے نہایت اطمینان سے شہناز باجی سے کہا کہ تشریف رکھیں۔میں بھی چلوں گی ثروت بھائی میں نے عذرا آپا کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ضرور وہ خوش ہو کر بولے۔جیسے میں نے ان کے دل کی بات کہہ دی ہو۔اور آپ بھی چلیں نا

عذرا آپا۔ مین نے ذرا خوشامد سے کہا، وہ کہاں جائیں گی، امی بیچ مین بول پڑیں۔
کیوں؟ ثروت بھائی نے ترش روئی سے کہا، آج تو نئی ماما بھی آ گئی ہیں۔ امی جل کر کباب ہو گئیں۔ اور میرا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ جی چاہا ثروت بھائی کو ان کی اس بہادری کی وجہ سے شاباش دوں۔ سچ ہے کبھی دبی چیونٹی بھی کاٹ لیا کرتی ہے۔
یقیناً عذرا کو بھی جانا چاہیئے۔ ابا نے پر زور تائید کی۔ اور امی اسے اپنی مکمل شکست سمجھتے ہوئے روسی دی۔ میں کب روکتی ہوں۔ ان کے لہجہ
میں بے زاری تھی۔
کار کی پچھلی نشست پر میں، عذرا آپا، فرزانہ اور رخسانہ، عشرت بیٹھ گئیں۔ شہناز باجی اگلی نشست پر پہلے ہی جم گئی تھیں۔ آپ پیچھے جائیں
انھوں نے باہر کھڑ کھڑے حکم دیا۔
مگر وہاں جگہ نہیں ہے۔ شہناز نے دھٹائی سے کہا۔
میں ابھی انتظام کیے دیتا ہوں، انھوں نے مجھے اور فرزانہ کو آگے بیٹھنے کے لئے کہا۔ اور پھر شہناز باجی کو پیچھے بیٹھنا پڑا۔ میں ثروت بھیا کی اس جھاڑ پر بہت خوش ہوئی اور عذرا آپا نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ ثروت بھیا نے گاڑی میں بیٹھتے ہی آئینہ کا رخ اس طرح پر گھمایا کہ اس میں عذرا آپا کا عکس صاف نظر آنے لگا۔ عذرا آپا جھینپ کر اپنی چوڑیوں کو کلائی میں پھرانے لگی۔ اور شہناز باجی جل کر کوئلہ ہو گئیں۔ انھوں نے اپنے ہونٹ چبا ڈالے۔ تازی تازی لپ اسٹک نے ان کا منھ کڑوا کر دیا تھا۔
ہم دو تین گھنٹے ادھر ادھر گھومتے رہے۔ بنیا باغ، گنگا گھاٹ، اورنگ زیب کی بنائی ہوئی گیان ہافی کی مسجد جس سے ملا ہوا خوبصورت مندر۔
راجہ کا محل، ہندو یونیورسٹی چوک۔ اور پھر رج بہماری کار تیزی سے واپس جا رہی تھی، ت وشہناز منھ بگاڑ رہی تھی۔ اس واقعہ کے دو تین دن کے بعد ہی وہ واپس

چلی گئیں۔

ابا اور امی کے ثروت بھیا پر بڑے احسانات تھے۔انھوں نے ہی انہیں اتنی اعلیٰ تعلیم دلائی۔ورنہ بے چارے غریب چچا جان انہیں کیسے اتنی مہنگی تعلیم دلا سکتے تھے۔ وہ امی اور ابا کی بات کبھی نہ ٹالتے تھے۔

امی نے ثروت بھیا کی شادی چپکے ہی چپکے اپنے بھائی کی بیٹی شہناز سے طے کر رکھی تھی۔ وہ انہیں زبان دے چکی تھیں۔ کہ ثروت تمہارا اور شہناز ہماری۔ہم سب اس خوفناک سازش سے بے خبر تھے۔

ثروت بھیا کے امتحان کا نتیجہ آیا۔ انھوں نے فرسٹ ڈویژن سے ایم، اے، پاس کیا تھا۔ ہمارے گھر عید ہوگئی۔ثروت بھیا کے والدین کو بھی دیہات سے بلا لیا گیا۔عذرا آپا نے اس کامیابی پر روزے مان رکھے تھے۔

لہذا انہوں نے نتیجہ سنتے ہی خوشی خوشی روزے رکھنے شروع کر دیئے۔

اب تمہیں شادی کر لینی چاہیئے بیٹے۔ میں نے تمہاری بات پکی کر لی ہے۔امی بولیں۔ اس پر ثروت بھیا چونکے۔ کیا شہناز تمہیں پسند نہیں۔ اس نے بھی تو تمہارے ساتھ بی، اے پاس کیا ہے۔ثروت بھیا پر گویا بجلی گر پڑی۔تمام جسم سن سا ہو کر رہ گیا۔ان کے کان بہرے ہو کر رہ گئے۔امی جہاں دیدہ تھیں فوراً بولیں۔ میں کئی برس سے زبان دے چکی ہوں۔

ثروت بھیا کھانا چھوڑ کر اٹھ گئے۔ ان کی دنیا ہی اجڑ گئی۔وہ عجب گومگو کی حالت میں تھے۔انھیں عذرا آپا سے بے حد محبت تھی، وہ دونوں یک جان دو قالب تھے۔ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدائی ان کے لئے موت کا پیغام تھی۔تباہی و بربادی کا پیش خیمہ تھی۔

ثروت بھیا انکار کر دینا چاہتے تھے۔مگر یہ کیسے ممکن تھا، وہ احسان فراموش نہ تھے۔وہ جانتے تھے کہ امی اور ابا کے ان پر کتنے احسانات تھے۔اور یہ بھی جانتے تھے

کہ انہیں اس کا بدلہ چکانا ہے۔ مگر اتنی بڑی قربانی کا تصور بھی انہوں نے نہ کیا تھا۔ پھر بے چاری عذرا آپا کیا کہیں گی؟۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ صرف اس کی خاطر جی رہی تھیں۔

اور وہ صرف اسی ایک امید پر جی رہی تھیں کہ وہ ایک دن اس کا ہوگا۔ اور ادھر امی اور ابا کا اصرار تھا، کہ جتنی جلدی ہو سکے، شہناز کی اور ثروت کی شادی ہو جانی چاہیئے۔ وہ جان بوجھ کر انجان بنی ہوئی تھیں۔ اور انہیں جدا کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

آپ امی کی بات کو ٹال نہیں سکتے۔ وہ بہت سخت ہیں۔ ان کے دل میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کر گزرتی ہیں۔ وہ اپنی ضد کے آگے کسی کی بھی پرواہ نہیں کرتیں۔ آپ مفت میں ان سے الجھ رہے ہیں۔ ان کے سینے میں دل کی جگہ پتھر رکھا ہوا ہے۔

آپ مجھ بدنصیب کی خاطر اتنی بہت سی الجھنیں

اپنے سر مول نہ لیں۔ اور بخوشی مان جایئے۔ اگر آپ نے شہناز بہن سے شادی نہ کی تو وہ ہمیں چین سے نہ رہنے دیں گی۔ اور آپ جانتے ہیں میرا دنیا میں ہے ہی کون، نہ ماں، نہ باپ، نہ بہن نہ بھائی۔ آخر کون ہے جو میرے دل کی آواز سن سکے۔ میں اپنی مرضی کی مختار تو ہوں نہیں۔ ان ہی لوگوں کی محتاج ہوں۔ اور ہمیشہ محتاج رہوں گی۔ وہ ماشاءاللہ، گریجویٹ ہیں، خوب صورت ہیں، اور ہر طرح سے آپ کے لئے موزوں ہیں۔ آپ میرا غم نہ کیجیئے میں تو شمع سحر ہوں۔ اب بہت جلد بجھ جاؤں گی۔ کیونکہ بلا روغن شمع ایک منٹ بھی جل نہیں سکتی۔ جل کر راکھ ہو جاتی۔

بہر حال میں آپ سے یہی التجا کرتی ہوں، کہ آپ اپنی نئی زندگی شروع کیجیئے، نہایت ہی ہنسی خوشی کے ساتھ، اب یہی میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔ زندگی بھر آپ کے لئے دعا کرتی رہوں گی۔ مجھے امید ہے۔ آپ میری اس آرزو کو نہیں ٹھکرائیں گے۔ اور شادی کر کے چاند سی دلہن گھر لے آیئے۔ میں آپ سے بھیک مانگ رہی ہوں۔

آپ کی نئی زندگی کی بھیک، دیکھئے خدارا انکار نہ کیجئے گا۔ اور مجھ بدنصیب کو اور زیادہ اذیت میں مبتلا نہ کریں۔

حرماں نصیب، عذرا

عذرا آپا نے یہ خط میرے ہی ہاتھوں ثروت بھیا کو پہنچا دیا۔

ثروت بھیا کی شادی کے انتظامات ہونے لگے۔ عذرا آپا نے شادی کر تمام انتظامات میں حصہ لیا۔ وہ ہر کام میں پیش پیش دکھائی دیتیں۔ انھوں نے رات دن ایک کر دیئے۔ رات رات بھر وہ بیٹھ کر دلہن کے جوڑون کو سنوارتیں، گوٹا، لچکا ٹانکتیں۔ امی اور ابا اس کے اس انہماک سے بہت خوش تھے، مگر میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ دل چاہتا تھا، ان کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روؤں، مجھے یقین تھا کہ عذرا آپا

کا دل بجھ چکا ہے۔ وہ دق کے مریض کا آخری سنبھالا ہے۔ وہ ایک گھڑی کی اور مہمان ہے بے چاری،

ثروت بھیا دولھا بن کر بیٹھے تو امی نے دوسری بہنوں کی طرح عذرا آپا کو بھی ان کے سر پر آنچل ڈالنے کے لئے مجبور کیا۔ وہ بے چاری دھڑکتے دل لرزتی ٹانگوں، اور کپکپاتے ہونٹوں اور امڈتے آنسوؤں کو زبردستی روکے آگے بڑھیں اور ثروت بھیا کے سر پر آنچل ڈال دیا۔ میں نے دیکھا ثروت بھیا کے سر پر پڑا عذرا آپا کا آنچل کانپ رہا تھا۔ دوسرے دن آلہ آباد سے شہناز دلہن بن کر ہمارے گھر آ گئیں، جس وقت کار ہماری کوٹھی کے آگے رکی، تو خان دان کی سب عورتوں کے ساتھ عذرا آپا بھی انہیں اتارنے گئیں۔ امی نے عذرا آپا کو دلہن اتارنے کا حکم دیا۔ وہ پورے استقلال سے بڑھیں اور شہناز کو جو اس وقت سرخ کپڑوں میں ایک گٹھڑی سی معلوم ہو رہی تھیں، گود میں اٹھا کر سجے ہوئے ہال تک لے گئیں۔

اور انھیں نرم و نازک ایرانی قالین پر گاؤ تکیہ کے سہارے بٹھا دیا، تمام عورتیں

دلہن کا منہ دیکھنے کے لئے پل پڑیں۔ سب سے آخر میں عذرا آپا نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا، عطریات کی تیز خوشبوؤں۔ اور لپ اسٹک کی بو ناک یناک میں گئی، ان کی حسرت اور ارمان کا خون دلہن کے ہونٹوں پر جما ہو اتھا۔ وہ بہ تکلف کہن اچاہتی تھی اس کے گلے میں پھندہ پڑ گیا۔ مبارک ہو بہن۔ کپکپاتے ہونٹوں سے مس ہوتی ہوئی آواز بدقت تمام یہ آواز ان کے منہ سے نکلی، اور باوجود انتہائی ضبط کے گرم گرم آنسوؤں کے کئی قطرے ان کی اداس آنکھوں سے نکل کر دلہن کے سرخ دامن میں جذب ہو گئے۔

سب سے بڑا دکھ

افسانہ نگار: ش۔ صغیر ادیب

جب طیارہ اپنی مقررہ بلندی پر پہنچ گیا اور سیدھا پرواز کرنے لگا، تو میں نے آنکھیں بند کر لیں، اور خیالات کے دھندلکوں میں کھو گیا، یادوں کا ایک کارواں تھا جو چاندی کے فانوس روشن کیے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اپنے وطن کی سڑکیں اور گلیاں، دور و نزدیک کے رشتے دار، پرانے دوست، بیتے ہوئے دنوں کے جھلملاتے ہوئے عکس، جن میں پھول، باغ، میموریل ایلی، اور موتی جھیل کا عکس نمایاں تھا، پھر وہ پیاری سی لڑکی سیدھی دل میں اتر جانے والی، شاید اس لئے اس کا نام روحی تھا۔ پتہ نہیں وہ دنیا کا سب سے خوبصورت میرا شہر نگار اب کیسا ہوگا۔ کیا کلومل اسٹریٹ، دادا میاں کا چوراہا۔ اور پھر میری اپنی گلی سب کچھ اسی طرح ہوگا، پھر میرا وہ نیم کا درخت جو بڑے مکان کی پچھواڑے والی گلی میں تھا۔ اور مکان کے کچھ حصے پر سایہ کیے رہتا تھا۔ کیا وہ بھی ٹھیک اس طرح ہوگا؟ ۔ کہیں ایسا نہ ہو سب کچھ بدل گیا ہو۔ جیسے بے وفا محبوب بدل جاتا ہے یا جیسے تقدیر بدل جاتی ہے۔ یا جیسے اچھے دن بدل جاتے ہیں۔ اگر بیتے دنوں کی یاد میں ذرا سا بھی فرق ہوگا، تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔

پھر میں نے آنکھیں کھولیں، سگرٹ جلائی اور پورٹ ہول سے باہر جھانکا، ہر طرف سبک سرمئی بادلوں کے قافلے رواں تھے، لندن شہر بہت پیچھے رہ گیا تھا

اب باہر جھانکنے پر بھی زمین کا کوئی چپہ، کوئی منظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ عجیب سا احساس تھا، کہ دنیا کی ہر شے نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اور اچانک دھرتی سے میرا ناطہ ٹوٹ گیا تھا۔ اور بوئنگ 707 کا دیو پیکر طیارہ فضا میں کمان سے نکل یہوئے تیر کی طرح تیرتا چلا جا رہا تھا۔

طیارے کے اندر خاموشی تھی، مسافر زیادہ نہیں تھے مشکل سے پچاس ہوں

گے، کچھ لوگ اخبار پڑھ رہے تھے۔ اور کچھ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میری سمجھ مین نہ آیا کہ کیا کروں، اخبار پڑھنے کی کوشش کی لیکن دل نہ لگا، یہ دل، یہ دیوانہ دل کہین بھی نہیں لگتا، پچھلے پانچ سال میں یہ دل کہیں بھی نہیں لگا۔ لندن، پیرس، روم ہر جگہ ایک بے چینی اور مایوسی پھیلی رہتی ہے۔ میرا دکھ یہ ہے کہ میں ماضی سے ناطہ نہیں توڑ سکتا۔ ماضی کا دکھ میرا سب سے بڑا دکھ ہے۔ کیوں کہ ماضی میں میرا ناطہ روحی سے تھا۔ پتہ نہیں اب وہ کیسی ہوگی۔ کہاں ہوگی۔ کیا کبھی بھولے سے، کسی نازک لمحے میں وہ مجھے اب بھی یاد کر لیتی ہوگی۔ شاید ہاں، شاید نہیں۔ لیکن میں تو اسے پچھلے پانچ سال سے اسے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بھول سکا۔ اس کی یاد کا دکھ سینے سے لگائے جی رہا ہوں۔

سر میں درد بھی ہو رہا تھا، اور کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی، میں نے ایر ہوسٹس سے کافی اور اسپرین منگوائی۔ ہوسٹس بہت خوبصورت تھی۔ اس کے بال سنہرے تھے۔ آنکھیں ہیرے کی طرح جگمگاتی ہوئی، اور مسکراہٹ بے حد شاندار۔ وہ جرمنی یا آسٹرین معلوم ہوتی تھی، مجھے یوں ہی خیال آیا کہ اس کو بھی کسی نے چاہا ہوگا، اور کیا اس نے بھی روحی کی طرح اس کا دل توڑ دیا ہوگا۔ نہ جانے یہ حسن والے ستم گر کیوں ہوتے ہیں۔..... کافی پیتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں سوچنے لگا۔ دراصل میں خود کو بہلانا چاہتا تھا، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ذہن گھوم پھر کر ماضی میں چلا جاتا تھا۔ وہی طلاق محل، فراش خانہ اور ہماری گلی۔ رشتے داروں اور دوستوں کے چہرے۔ اور سب کے آخر میں روحی کا تصور، یہ جذباتی ہیجان شاید اس لئے تھا کہ پورے پانچ سال کے بعد واپس جا رہا تھا۔ لیکن یہ پانچ سال یوں لگتے تھے جیسے عمر بیت گئی ہے۔

ہمارا سفر شام کو پانچ بجے شروع ہوا تھا، اس وقت خاصا اجالا تھا، لیکن فضا میں پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد اندھیرا ہو گیا تھا، صرف بہت دور ڈوبتے سورج کی سرخی رہ

گئی تھی، جس کے پیش نظر بادلوں کی ایک لمبی لکیر تانبے کی طرح دمکتی نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر میں یہ سرخی بھی غائب ہوگئی۔ اور ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ اب کہیں کچھ نہیں تھا، کوئی روشنی کوئی منظر، کوئی رنگ نہیں تھا۔ صرف اندھیرا تھا۔ یا بادلوں کے دھندلے دھبے، میں نے سگریٹ جلائی اور ایک بار پھر خواہ مخواہ اخبار پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

طیارے کے اندر بدستور خاموشی تھی۔ مجھ سے اگلی سیٹ پر دو میاں بیوی بیٹھے تھے ان کے ساتھ ایک پانچ چھ سال کی بچی تھی وہ لوگ اردنی یا شامی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے بی گیر لگے ہوئے ٹکٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ دمشق جا رہے ہیں۔ لڑکی

اپنی سیٹ پر کھڑی تھی اور مجھے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، میں اسے دیکھ کر مسکرایا، تو لڑکی بھی مسکرائی، پھر اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور مجھے ایک گڑیا دکھا کر کچھ کہا۔ مجھے چونکہ عربی نہیں آتی تھی، اس لئے سمجھ نہ سکا۔ مسکرا کر انگریزی میں پوچھا کیا یہ تمہاری گڑیا ہے؟

اتنے میں اس کی ماں بھی ہماری طرف متوجہ ہوگئی۔ اس نے پہلے بچی کو ڈانٹا، پھر مجھ سے معذرت بھرے لہجے میں مخاطب ہوئی۔ آپ اس کی بات کا برا نہ مانیئے گا بہت شریر ہوگئی ہے۔

آپ کی بچی بہت پیاری ہے۔ میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔ کیا نام ہے اس کا؟

جمیلہ، اس کی ماں نے کہا۔ یہ ہماری پہلی بچی ہے۔ اس لئے ذرا شریر ہوگئی ہے۔ اسکول جاتی ہے۔

اب اس کا شوہر بھی ہماری طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ وہ بے حد خلیق اور نیک آدمی نظر آتا تھا۔ اس نے ذرا فخر اور مسرت کے انداز میں کہا، جی ہاں اسی سال جانا

شروع کیا ہے۔

میں نے ایک بار پھر جمیلہ کی طرف دیکھا، اودے رنگ کے فراک میں وہ خود ایک جاپانی گڑیا نظر آتی تھی، اس کی گڑیا کا قد کوئی ایک فٹ تھا۔ اور اس نے بھی اودا ہی فراک پہن رکھا تھا۔ دونوں کے بالوں مین ربن بھی ایک ہی رنگ کا تھا۔ میں نے جمیلہ کے سرخ وسفید چہرے سے نظریں ہٹا کر اس کے باپ کی طرف دیکھا۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آپ شاید اردن کے رہنے والے ہیں۔ جی نہیں ہم فلسطینی مہاجر ہیں۔ جمیلہ کے باپ نے جواب دیا۔ میرا نام عثمان ہے۔

اوہ میں ایک لمحہ کے لئے چپ ہوگیا۔ پھر پوچھا اب آپ کا قیام کہاں ہے۔

دمشق میں، جمیلہ کی ماں نے جواب دیا، خود میرا وطن بھی فلسطین ہی ہے۔ لیکن میں دمشق میں پیدا ہوئی تھی۔ بے وطن ہونے کے بعد میرے والدین دمشق میں آباد ہوگئے تھے۔

لیکن میں نے اپنا وطن دیکھا ہے۔ عثمان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اگرچہ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ شاید چار پانچ سال میری عمر ہوگی۔ لیکن بہت سی باتیں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ مثلاً میرا مکان، گاؤں کا بڑا بازار، اور گاؤں سے باہر دریا کا کنارہ، سن اڑتالیس میں جب ہمیں وطن چھوڑنا پڑا، تو میرے والد کو اس وقت یہودیوں نے قتل کر دیا تھا۔ میری ماں مجھے لے کر اردن چلی گئی تھی۔ اور وہاں ہم کئی سال کیمپ میں رہے تھے، پھر ایک عزیز کی وساطت سے دمشق جانے کا بندوبست ہوگیا۔ اور ہم وہاں آباد ہوگئے۔

مجھے بہت افسوس ہوا آپ کی کہانی سن کر۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

جی ہاں وطن کا دکھ ایسا ہی ہے، جسے وقت بھی بھر نہیں سکتا۔

اب آپ لوگ دمشق جا رہے ہیں۔

جی ہاں..... عثمان نے جواب دیا، ہمارا ایک عزیز لندن میں مقیم ہے۔ اس کی

دعوت پر دو ہفتے کے لئے لندن آئے تھے۔ اب واپسی ہے۔

یہ تو بڑا ہی عجیب اتفاق ہے۔ میں مسکرایا، تین چار دن کے لئے مجھے بھی دمشق رکنا ہے۔

اچھا، کیوں عثمان نے خوش ہو کر کہا۔

ایک دوست سے ملنا ہے۔ وہ بھی فلسطینی ہے۔

یہ تو بہت خوشی کی بات ہے، جمیلہ کی والدہ خوش ہو کر بولیں، آپ ہمارے ساتھ ہی چلیئے گا، اور .....

ارے صاحب ..... میں نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا،

اس کی کیا ضرورت ہے، اور پھر میرا دوست بھی تو ہے۔ میں اسی کے پاس .....

نہیں جناب یہ نہیں ہو سکتا۔ جمیلہ کے والد نے زور دے کر کہا۔ آپ کو ہمارے ساتھ ہی ٹھہرنا ہو گا، بعد میں آپ چاہیں تو اپنے دوست کے پاس بھی ایک دن ٹھہر سکتے ہیں۔ لیکن باقی دنوں میں آپ صرف ہمارے مہمان ہیں۔ دیکھئے انکار نہ کیجئے گا۔

عربوں کی مہمان نوازی کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ اب تجربہ بھی ہوا۔ عرب اس طرح پذیرائی کرتے ہیں، جیسے دل میں بسا رہے ہوں۔ اس وقت بھی یہی ہوا، کہ وہ لوگ اصرار کرتے رہے۔ اور میں معذرت کرتے کرتے آخر سٹ پٹا کر چپ ہو گیا۔

اب فرینکفرٹ آنے والا تھا۔ ہماری دوسری منزل ایتھنز تھی، اس کے بعد دمشق اور دمشق میں مجھے نہ صرف چند دن رکنا تھا، بلکہ عمر جمال کو بھی تلاش کرنا تھا۔ پچھلے چند ماہ سے اس کا کوئی خط نہ آیا تھا۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ دمشق میں ہی تھا۔ عمر جمال کے ساتھ مجھے ستھیا کا خیال آیا، اور اس خط کا بھی جو ستھیا نے عمر جمال کو دینے کے لئے ایر پورٹ پر میرے حوالے کیا تھا۔ اگر چہ یہ خط میں نے نہیں پڑھا تھا۔ لیکن

مجھے اندازہ ضرور تھا، کہ اس میں کیا لکھا ہو گا۔ ستھیا نے خط مجھے دیتے وقت کہا تھا کہ میں نے کئی دن کی ذہنی کش مکش کے بعد اس پل صراط کو پار کیا ہے۔ جس کے دوسرے کنارے پر کہیں عمر جمال کھڑا تھا۔ اس سے کہہ دینا کہ میں اسکی منتظر ہوں۔ اور یہ انتظار آئرلینڈ کی ستھیا مورگن کا نہیں، ایک عورت کا انتظار ہے۔ اور اس عورت کی دنیا میں کوئی نفرت نہیں ہے، کوئی تعصب نہیں ہے، صرف محبت ہے.....

میں نے ستھیا سے کہا۔ میں ایسا ہی کروں گا۔

مجھے اندازہ تھا کہ ستھیا اس فیصلے پر پہنچنے سے پہلے کس کرب سے گزری ہو گی۔ مجھے وہ دن یاد آئے جب عمر جمال اور ستھیا کے درمیان ایک تکلیف دہ فاصلہ حائل ہو گیا تھا۔ اور اس کے باوجود وہ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور دل ہی دل میں انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ جینے اور مرنے کے فیصلے کر رکھے تھے۔ ان کی محبت کا حسین ترین دور بہت مختصر ثابت ہوا۔ جلد ہی وہ ایک دوسرے سے دور ہو گئے..... دریا کے دو ایسے کناروں کی طرح جو آپس میں کبھی نہیں ملتے۔

ستھیا واپس

آئرلینڈ واپس چلی گئی۔ عمر جمال کا کورس بھی ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی واپس دمشق چلا گیا۔

رخصت ہوتے وقت اس نے مجھ سے کہا تھا، ، اچھا دوست زندگی رہی تو پھر ملیں گے انشا اللہ۔

اور ستھیا۔ میں نے پوچھا تھا۔

عمر جمال کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا تم جانتے ہو، میرے دل میں بے شمار زخم ہیں۔ ستھیا بھی ایک زخم بن کر میرے دل میں ہمیشہ رہے گی۔

جمال اور ستھیا کے خط میرے پاس آتے رہتے تھے، جل دہی مجھے پتا چل گیا

کہ ستھیا آئرلینڈ کیوں گئی تھی، دراصل وہ کسی خفیہ تنظیم سے متعلق ہوگئی تھی۔ چنانچہ بلفاسٹ پہنچ کر اس نے زمین دوز سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ غالباً کچھ بموں کے دھماکے وغیرہ کیے تھے، پھر وہ گرفتار ہوئی اور جیل چلی گئی۔ کوئی آٹھ ماہ بعد رہا ہوئی۔ پھر میں نے اسے سفر کے بارے میں اطلاع دی۔ اس نے فوراً لکھا، کہ ابھی نہ جانا۔ تم سے ملنا بہت ضروری ہے۔

چنانچہ مجھے کچھ دن رکنا پڑا۔ پھر ستھیا مانچسٹر آئی۔..... پہلے ہی کی طرح حسین، امنگوں اور ولوں سے بھری ہوئی۔ جیل میں آٹھ برس گزار کر شاید وہ کچھ زیادہ ہی باہمت اور باوقار ہوگئی تھی۔

میں نے ہنس کر پوچھا یہ جیل جانے والی حرکت کیوں کی تھی،

ستھیا بھی ہنسنے لگی، تمہیں تو ایسی بات نہیں کہنا چاہیئے۔

کیوں میں نے پوچھا۔

کیا آزادی کے لئے تم نے جدوجہد نہیں کی تھی۔

ستھیا نے جواب دیا، اور کیا تم ان مصیبتوں سے نہیں گزر رہے تھے، کیا تمہارے یہاں لاکھوں لوگ جیل نہیں گئے تھے۔

میں چپ ہوگیا..... ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔

ستھیا چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی، تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں؟ میں نے بموں کے تین دھماکے کیے تھے۔ لیکن پولیس ہمیں گرفتار نہیں کر سکی۔ البتہ چوتھے دھماکے کے بعد مجھے ضرور گرفتار کر لیا گیا، جب کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آٹھ مہینے بعد میں رہا ہوگئی۔ اور یہاں آنے کی اجازت بھی مل گئی۔ ورنہ ابھی کئی برس حکومت برطانیہ کی مہمان رہتی، پھر اس نے کچھ رک کر کہا۔ تم کب روانہ ہو رہے ہو۔

صرف تمہارا انتظار تھا، اب تم آ گئی ہو تو اگلے ہفتے

روانہ ہو جاؤں گا۔

عمر جمال کے پاس جاؤ گے؟

ارادہ تو ہے پھر ٹھیک ہے۔ ستھیا نہ بے حد اشتیاق سے بولی، میں ایک خط دوں گی، وہ جمال کو دے دینا۔

مگر میں تو سمجھتا تھا، کہ یہ معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ میں نے اسے چھیڑا۔

ستھیا چپ سی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کی جگمگاتی جوت ماند پڑ گئی۔ جیسے قیامت ایک لمحہ میں اس کے دل کے قریب سے گزر گئی ہو۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔ اور آہستہ سے کہا

شہزادو دل کے معاملے کبھی ختم نہیں ہوتے۔

اور اب ستھیا کا خط میری جیب میں تھا، اور میں دمشق جا رہا تھا۔ میں دعا کر رہا تھا، خدا کرے عمر جمال وہاں مل جائے۔ ستھیا نے غلط نہیں کہا تھا دلوں کے معاملے کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ایک بار دل میں جب آگ لگ جائے، ت وعمر بھر سلگتی رہتی ہے۔ میں روحی کی باتیں بھولنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ سوچا تھا، ملکوں ملکوں مارا مارا پھروں گا۔ نئے نئے لوگوں سے ملوں گا۔ ممکن ہے کوئی غمگسار مل جائے، کہیں دل لگ جائے تو شاید روحی کو بھول سکوں، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ آگ آج بھی میرے دل میں سلگ رہی ہے۔

طیارہ فرینکفرٹ پہنچ گیا۔ اور رات کا آنچل دھرتی پر پھیل گیا تھا۔ ایر پورٹ کی عمارت روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ یہاں ہمیں ایک گھنٹہ ٹھہرنا تھا۔

بیش تر مسافر ایر پورٹ کی عمارت میں گھومنے چلے گئے۔ لیکن میں نہیں گیا۔ جمیلہ اور اس کے والدین بھی نہیں گئے۔ میں لوگوں سے باتیں کرتا رہا، عثمان کو اپنے وطن فلسطین کے چھوٹنے کا بہت دکھ تھا،

اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ یہ دکھ ہر فلسطینی کو ہے۔ کیوں کہ ہر

فلسطینی بچہ اپنی ماں کی کوکھ سے یہ دکھ ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔

پھر ہوائی جہاز فرینکفرٹ سے روانہ ہوا۔ وہاں کچھ مسافر اتر گئے۔ کچھ نئے آ گئے۔ کچھ دیر بعد میں نے سیٹ بیلٹ کھول دی۔ اور بیگ سے ایک کتاب نکال لی۔ دمشق میں کوئی رات کے ایک بج پہنچا تھا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتن اڈھیر سارا وقت کس طرح گزرے گا۔ دل میں اتنا ہیجان ہو تو سفر بے حد طویل ہو جاتا ہے۔

اسی وقت میں نے اسے دیکھا اور یک دم حیران رہ گیا۔ اس دلچسپ اتفاق کی مجھے ہرگز امید نہ تھی۔

میں تو اس سے ملنے کے لئے دمشق جا رہا تھا۔ اور وہ اسی طیارے میں موجود تھا۔ ہاں عمر جمال۔ میرا دوست۔ فرسٹ کلاس کا دروازہ کھول کر وہ باہر آیا۔ میری اس پر نگاہ پڑی، مجھے دیکھ کر وہ بھی حیرت زدہ ہو گیا۔ یہ ملاقات ایسی تھی کہ کچھ دیر گم سم ہو کر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

جمال کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے، جیسے اسے کوئی شدید ذہنی جھٹکا لگا ہو۔ وہ دھیرے دھیرے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ پھر وہ مسکرایا اور مدھم لہجے میں بولا کیسے ہو شہزاد۔

اچھا ہوں میں نے اسکے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ تم فرینکفرٹ سے سوار ہوئے ہو۔

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ تم گھر جا رہے ہو.....

ہاں میں نے جواب دیا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے تم سے ملنے کے لئے دمشق جانا تھا، مگر مجھے گمان بھی نہ تھا کہ اسطرح دوران سفر ملاقات ہو جائے گی۔ صرف مجھ سے ملنے کے لئے دمشق جا رہے تھے۔ اس نے مسکرا کر پوچھا، ہاں ایک بے حد ضروری کام تھا۔

وہ کیا؟

میں نے مسکرا کر کہا، شاید تمہیں ستھیا یاد نہیں رہی۔

ستھیا، اچانک میں نے محسوس کیا کہ جمال کا چہرہ کربناک ہو گیا ہے۔ اس نے بھاری سانس لے کر کہا

میں ستھیا کو کیسے بھول سکتا ہوں؟۔ کیسی ہے وہ

بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں اس کے جیل میں جانے کے متعلق لکھا تھا۔ اب وہ چھوٹ کر آ گئی ہے۔ اور یقین جانو اس کی شخصیت پہلے سے زیادہ نکھر گئی ہے۔

جمال پھر مسکرایا، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ایک نوجوان اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا۔ گھنی سیاہ خوشنما مونچھیں تھیں۔ آنکھوں پر چشمہ چڑھا تھا۔ اس نے جمال سے عربی میں کچھ کہا۔ پھر جمال نے ریسٹ واچ پر نظر ڈالی، اور مجھ سے بولا، معاف کرنا شہزاد، میرے دوست منتظر ہیں۔ کچھ ضروری کام ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ مگر..... سنو تو.....

میں تم سے پھر ملوں گا۔ اس نے جاتے جاتے کہا۔ اس وقت ذرا جلدی ہے تم آرام کرو۔

یہ کہہ کر دونوں ٹوائلٹ کی طرف چلے گئے۔ میں نے گھوم کر دیکھا، عمر جمال تو ٹوائلٹ میں غائب ہو گیا، اور اس کا ساتھی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک اور نوجوان سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے سگرٹ نکال کر جلائی اور پھر جمال کے بارے میں سوچا، نہ جانے کیوں مجھے ایسا احساس ہو رہا تھا کہ جمال الجھا الجھا سا تھا۔ پھر مجھے ستھیا کے خط کا خیال آیا، کم از کم جمال کو خط ہی دے دیتا تو اچھا تھا۔

لیکن مجھے اسکا موقع ہی کہاں ملا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اس بار آئے گا تو فوراً خط دے دوں گا۔ میں نے اطمینان سے سوچا،

یکا یک جمیلہ کے والد نے اگلی سیٹ سے سر ابھار کر پوچھا۔ کیا یہی آپ کا وہ

فلسطینی دوست ہے، جس کے پاس آپ کو جانا تھا۔

جی ہاں میں نے بتایا

عمر جمال سے میری ملاقات پانچ سال پہلے دمشق ایرپورٹ کے ٹرانزٹ لاؤنج میں ہوئی تھی۔ جب جہاز کی تبدیلی کے باعث مجھے وہاں کوئی چار گھنٹے رکنا پڑا۔ میں ایک صوفے پر دراز دمشق کے اخبار البعث کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک نوجوان میرے پاس آیا اور اس نے مسکرا کر نہایت شائستہ لہجے میں کچھ کہا۔ جو میری سمجھ میں نہ آیا، کیونکہ مجھے عربی نہیں آتی تھی۔ لیکن جب یہ بات میں نے اسے بتائی تو وہ حیرت زدہ ہو گیا۔

مگر تم تو عربی کا اخبار پڑھ رہے ہو۔ اس نے انگریزی میں کہا،

صرف تصویریں دیکھ رہا تھا۔ میں نے بتایا۔ ویسے اکثر الفاظ پڑھ بھی لیتا ہوں۔ کیوں کہ میری زبان کا رسم الخط بھی تقریباً ایسا ہی ہے۔

کون سی زبان

اردو..... میں نے کہا جو دنیا کی مظلوم ترین زبان ہے۔

اوہ، وہ کچھ لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا، بہر حال یہ بات دلچسپ ہے۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی مجھے عمر جمال کہتے ہیں۔

میں نے اپنا نام بتایا کچھ دیر ٹھہر کر اس نے پوچھا ''کیا روم جا رہے ہو،

پیرس میں نے کہا وہاں میرا ایک دوست ہے۔ اگر وہاں دل لگ گیا تو ٹھیک، ورنہ کہیں اور چل دوں گا،

بعد کا سارا وقت اس نے میرے ساتھ ہی گزارا۔ اور اپنے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں، وہ فلسطین کے ایک ایسے گاؤں کا رہنے والا تھا، جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا، کیوں کہ وہ ایک کیمپ میں پیدا ہوا تھا، یہ کیمپ گولان کی پہاڑیوں کے قریب ایک گاؤں کے باہر واقع ہے، اس کے خاندان کے کچھ افراد فلسطین سے بے دخل ہو

کر سیریا چلے گئے تھے، برسوں انہیں کیمپ میں رہنا پڑا تھا۔ جمال نے بتایا کہ اس کے کچھ اور رشتہ دار اردن چلے گئے تھے۔ اور آج بھی کیمپوں میں ہی مقیم ہیں، آج تک انہیں سر چھپانے کے لئے اپنا گھر نصیب نہیں ہوا، زندگی آج بھی ان کے لئے اتنی ہی دکھ بھری ہے، جتنی جلاوطنی کے وقت تھی۔

جمال جوان ہوا تو اسے ایک نئی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ آگے تعلیم جاری رکھنا اس کے لئے ممکن نہ تھا، کنبہ بڑا تھا، آمدنی محدود۔ اور والد ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں شہید ہو چکے تھے۔ مجبور ہو کر جمال نے ایر پورٹ پر ٹرانزٹ لاؤنج کے کیفے میں نوکری کر لی۔ اب وہ رات میں کام کرتا، دن کو کالج جاتا تھا۔

کالج میں میرے دو سال ابھی باقی ہیں، جمال نے بتایا، اگر حالات نے ساتھ دیا تو میں اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے انگلینڈ جاؤں گا۔ کمپیوٹر کا کورس کرنے کا ارادہ ہے۔

ہو سکتا ہے، انگلینڈ میں ہماری ملاقات ہو جائے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ کیوں کہ ممکن ہے پیرس میں میرا دل نہ لگے۔ اور میں بھی انگلینڈ چلا جاؤں۔

ہاں ہو سکتا ہے۔ وہ بھی مسکرایا، زندگی میں ایسے حسین واقعات ہوتے ہیں۔

اور ایسا ہی ہوا، یہ کوئی تین سال بعد کی بات ہے، میں ایک سنیچر کو شاپنگ کر رہا تھا۔ کہ ایک اسٹور میں اچانک عمر جمال سامنے آ گیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک سنہرے بالوں والی خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ اس کا نام ستھیا تھا، اور وہ آئر لینڈ کی رہنے والی تھی۔ زرد رنگ کے لباس میں وہ ڈیفوڈل کے پھول کی طرح نظر آ رہی تھی، پہلی ہی ملاقات میں مجھے اندازہ ہو گیا، کہ وہ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہیں۔ عمر جمال نے بتایا کہ وہ ایک سال سے سال فورڈ میں ہے، اور کمپیوٹر کا کورس کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک اسٹور میں جز وقتی ملازم بھی ہے۔ وہیں ستھیا بھی کام کرتی تھی۔ رسمی گفتگو کے بعد جمال نے بتایا کہ اسے رہائش کے سلسلے

میں کچھ پریشانی ہے۔جس جگہ وہ رہتا ہے۔وہاں کرایہ زیادہ ہے۔اوراس کی جیب اتنے کرائے کی سکت نہیں رکھتی۔

تو پھرتم میرے پاس کیوں نہیں آجاتے۔

تمہارے پاس رہائش کا بندوبست ہوسکتا ہے؟

ضرور.....میں نے کہا،ایک کمرہ خالی ہے۔اس میں تم رہ سکتے ہو۔

چنانچہ پھروہ میرے ساتھ ہی رہنے لگا،ان دنوں میں اپنے ایک دوست رشید کے مکان میں کرایہ دار کے طور پر رہتا تھا۔اس مکان میں تین کمرے تھے۔ایک خالی پڑا تھا۔جمال اس میں رہنے لگا۔دمشق ایرپورٹ

کی اتفاقی ملاقات اب گہری دوستی میں بدل گئی تھی۔دھیرے دھیرے مجھے احساس ہونے لگا،کہ جمال بظاہر جتنا خوبصورت اور ذہین ہے۔اس سے کہیں زیادہ وہ حساس بھی ہے۔وہ ایک ایسے سمندر کی طرح تھا۔جس کی گہرائی کا کبھی اندازہ نہیں ہوتا۔بظاہر ٹھہرا ہوا،پرسکون،لیکن لاکھوں مدوجزر اپنی گہرائیوں میں چھپائے ہوئے۔

وہ خاصا کم گوتھا۔عام حالات میں ہلکی پھلکی تفریحی بات کرتا۔لیکن جب کبھی اداس ہوتا تو فلسطین کی بات چھیڑ دیتا۔اپنی بدنصیب قوم کا ذکر کرتا،اکثر مجھ سے کہتا تم بہت خوش نصیب ہو،کم ازکم تمہارا وطن تو ہے۔ایک میں ہوں اتنی بڑی کائنات میں میرا کوئی وطن نہیں۔اوراس سے بڑا دکھ کیا ہوسکتا ہے۔

لیکن دکھ کا فلسفہ بڑا عجیب ہے۔جمال کو فلسطین کا غم تھا،مجھے روحی کا غم تھا،اور میرا دوست رشید جو کم ہی ہماری محفلوں میں شریک ہوتا تھا،پیسے کے دکھ میں مبتلا تھا۔رشید پچھلے آٹھ سال سے انگلینڈ میں تھا۔وہ ہفتے میں ساتوں دن،بارہ گھنٹے روزانہ کام کرتا تھا۔اورایک ایک پینی بڑی احتیاط سے بینک میں جمع کرتا تھا۔میں نے کبھی اس طرزعمل کے لئے اسے الزام نہیں دیا۔کیونکہ ماضی میں رشید نے بہت برا وقت

گزارا تھا۔ برسوں پہلے وطن میں تھا، تو نوکری کے لئے کتے کی طرح مارا، مارا پھرتا تھا۔ سینکڑوں فاقے کیے تھے۔

یہاں تک ہوا تھا کہ اس کے گھر والوں کو پڑوسیوں سے مانگے ہوئے ماش کے چھلکے ابال کر کھانے پڑے تھے۔ اس کی ماں ٹی، بی میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ چھوٹا بھائی چوری کرتا ہوا پکڑا گیا۔ اور جیل چلا گیا۔ بڑی بہن کی شادی نہ ہو سکی۔ اس نے اپنی بدبختی کے ہاتھوں مجبور ہو کر خودکشی کر لی، جب لاچاری اس انتہا تک جا پہنچی تو وہ گھر سے بھاگ نکلا۔ اور ایک جہاز میں اسے خلاصی کی نوکری مل گئی، اور یوں وہ انگلینڈ پہنچ گیا۔ اب وہ دن رات کام کر کے پیسہ حاصل کرتا تھا۔ خود خرچ نہیں کرتا تھا۔ لیکن چھوٹے بہن بھائیوں کو عمدہ تعلیم دلوا رہا تھا۔

پیسے نے مجھے بہت ذلیل کیا ہے۔ وہ اکثر کہتا تھا۔ اس لئے اب میں صرف پیسہ کماتا ہوں۔ کیونکہ پیسہ ہی دنیا میں ہر دکھ کا علاج ہے۔ تمہاری جیب میں پیسہ ہے تو تم انسان ہو ورنہ خارش زدہ کتے سے بھی بدتر ہو،

ستھیا تقریباً روزانہ آتی تھی، شام کو ہم تینوں اکٹھے ہو جاتے۔ کبھی رمی کھیلی جاتی کبھی مونا پلی، کبھی ڈامینو سے دل بہلاتے۔ ایسے موقعوں پر جمال عموماً خوش گوار موڈ میں ہوتا تھا۔ وہ بے حد دل چسپ باتیں کرتا۔ فلیش کھیلتے تو وہ پیسوں کی بجائے روس، امریکہ اور برطانیہ کو داؤ پر لگاتا۔ ایک بار میں نے اس سے ساری دنیا جیت لی، صرف فلسطین باقی رہ گیا تھا۔ میں نے ہنس کر پوچھا، اب کیا کہتے ہو۔ ہم خود مٹ جائیں گے، لیکن فلسطین کو کبھی نہیں ہاریں گے۔

شام بھیگتی تو ہم باہر چلے جاتے۔ ستھیا پیتی نہیں تھی، اگر کبھی زیادہ جی چاہا تو بے بی شیم لے لی، جمال نے اسے کبھی ٹوکا نہیں تھا، لیکن ایک بار میں نے اسے بتایا کہ ہم لوگ عورتوں کی شراب نوشی پسند نہیں کرتے، تو اس نے بے بی شیم بھی ترک کر دی، ستھیا بے حد حسین تھی، اتنی کہ ایسی عورت کو صرف دور سے دیکھنا چاہیئے، چھونا نہیں

چاہیئے۔ ورنہ وہ مرجھا جائے گی، اس میں شک نہیں کہ وہ جمال کو بے حد چاہتی تھی، اتنا کہ اس نے ایک ایک کر کے وہ تمام باتیں اختیار کر لی تھیں، جنہیں جمال پسند کرتا تھا، جمال کی چاہت بھی کم نہ تھی، وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اتنے لازم وملزوم تھے، کہ جب ایک ساتھ کھڑے ہوتے، تو ایسا لگتا، کہ اچانک مکمل ہو گئے ہیں۔

لیکن ان کی محبت میں پہلی دراڑ اس وقت پڑی، جب ایک بار اسرائیل کے چند بمبار طیاروں نے

لبنان کی ان سرحدی بستوں پر اچانک حملہ کر دیا، جہاں زیادہ تر فلسطینی مہاجر آباد تھے، جمال اس خبر سے بہت دل گرفتہ ہوا، اس نے اسرائیل کے خلاف بے حد غم و غصے کا اظہار کیا۔ ستھیا جمال کے جذبات واحساسات سے آگاہ تھی، لیکن اس وقت پہلی بار اس نے جمال کو ٹوکا۔ یوں دونوں میں جھڑپ ہو گئی، ستھیا اسرائیل کو قصوروار ماننے پر تیار نہ تھی۔ وہ اسے حق بجانب قرار دے رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا اسرائیل کی ساری کاروائی اس کے اپنے دفاع کے لئے ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو فلسطینی عرب اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کریں گے، جمال حیران رہ گیا، غصے اور غم سے اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اس نے چیخ کر کہا، گویا ہم فلسطینیوں سے تمہیں کوئی ہمدردی نہیں؟ اور تمہارے خیال میں ہمیں اپنے گھروں میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اور یہ بات تم کہہ رہی ہو، ..... تم!

یہودیوں کو بھی اسرائیل میں رہنے کا اتنا ہی حق ہے

جتنا کہ تمہیں ..... ستھیا بھی بحث پر آمادہ تھی۔

اور ان یہودیوں کے بارے میں کیا کہو گی، جو دوسرے ملکوں سے آ کر آباد ہو رہے ہیں۔

انھیں بھی قانوناً وہاں کی شہریت حاصل ہو گئی ہے۔

جمال یکا یک چپ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں تاریک ہو گئیں۔ پھر آہستہ سے بولا

ستھیا مجھے نہیں معلوم تھا، کہ تمہارا دل درد کے ہر احساس سے خالی ہے۔

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ستھیا کو اسرائیل سے ہم دردی تھی۔ لیکن اس کی کوئی نظریاتی وجہ نہ تھی، صرف یہ تھا کہ اس کی دادی مزہبا تھی، اور اس کے چچا نے بھی ایک یہودی لڑکی سے شادی کی تھی، یوں اس کے خاندان میں یہودی افراد جمع ہو گئے تھے۔ چانچہ صرف اسی بنا پر اور غیر محسوس طور پر اس کی ہم دردیاں اسرائیل کے ساتھ تھیں۔ اس روز کے جھگڑے کے بعد ان کے درمیان ایک اونچی دیوار حائل ہوگئی، ستھیا نے میرے گھر آنا کم کر دیا۔ کبھی آتی بھی تو اس کے اور جمال کے درمیان بالکل رسمی گفتگو ہو تی..... یوں جیسے دو اجنبی ایک دوسرے سے ٹرین کا وقت پوچھ رہے ہوں۔ یا موسم پر اظہار خیال کر رہے ہوں، میں نے ان کے درمیان صلح کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی، کیونکہ میرے خیال میں غلطی ستھیا کی تھی، اگر اسے اسرائیل سے اتنی ہمدردی تھی، تو پھر اسے ایک فلسطینی مہاجر سے دل لگانے کی کیا ضرورت تھی۔

وقت یوں ہی گزرتا چلا گیا۔ ستھیا آئرلینڈ چلی گئی،

وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف آئرش عوام کی زمین دوز جدوجہد میں حصہ لیا۔ وہ وقت بہت خراب تھا، آئرلینڈ کے حالات بے حد خراب ہو رہے تھے، آئے دن بموں کے دھماکے ہوتے رہتے، بڑی بڑی بلڈنگیں ملبے کا ڈھیر بن جاتیں، اکثر جانی نقصان بھی ہوتا ایک بار ستھیا نے مجھے اپنے خط میں لکھا، دراصل ہم لوگوں کو برطانیہ سے کوئی خاص پرخاش نہیں، بات صرف اتنی ہے کہ ہم اپنے گھریلو معاملات میں برطانیہ کی حاکمانہ دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔ جمال کو ملازمت ملی یا نہیں، مجھے نہیں معلوم کیونکہ اچانک اسکے خط بھی آنے بند ہو گئے۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد جب میں نے وطن کی روانگی کا پروگرام بنایا، تو ستھیا آن پہنچی، وہ اب پہلے سے بہت بدل گئی تھی۔ آٹھ ماہ جیل میں رہ کر ایسا لگتا تھا، کہ اس نے بہت کچھ جان لیا تھا۔ کیونکہ

جب اس نے کہا دل کے معاملے کبھی ختم نہیں ہوتے..... تو اس کے لہجے میں ایسا یقین تھا، جو صرف محبت کی معراج پانے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔

میں نے تعریفی لہجے مین کہا تو آخر کار تم نے جان لیا کہ دل کے معاملے کیسے ہوتے ہیں۔

ہاں..... اس نے کہا، جیل میں رہ کر دھیرے دھیرے سمجھ آ گئی، کہ میں ہی غلطی پر تھی۔ میرے اور جمال کے درمیان ایک قدر ضرور مشترک ہے، جو ہر فاصلے کو ختم کر دیتی ہے۔ اور وہ قدر ہے دکھ کی..... وطن کے دکھ کی..... ہم دونوں کے درمیان درد کا رشتہ ہے جو اٹوٹ ہے۔..... مجھے اسرائیل سے ہمدردی کیوں ہو؟۔ اب میں جان گئی ہوں، کہ فلسطینیوں کو اسرائیل میں رہنے کا اتنا ہی حق ہے، جتنا مجھے آئرلینڈ میں رہنے کا۔ اور ایک یہودی اگر آئرش ہے تو اسے تل ابیب جانے کا کوئی حق نہیں ہے۔

طیارہ اب ایتھنز کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ بیشتر افراد خاموشی سے پڑھنے یا اونگھنے میں مصروف تھے۔ جمیلہ سو چکی تھی، اور میں بے چینی سے فرسٹ کلاس کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس امید پر کہ شاید جمال آ جائے اور اس سے مزید گفتگو ہو سکے۔ اور ساتھ ہی ستھیا کا خط بھی دے دوں۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی، میں کچھ الجھن محسوس کر رہا تھا۔ ممکن ہے اسکی وجہ یہ ہو کہ جمال مجھ سے زیادہ گرم جوشی سے نہیں ملا تھا۔ بلکہ اس کے رویہ میں تھوڑی سی سرد مہری یا تذبذب کی کیفیت تھی۔ وہ کچھ الجھا ہوا سا تھا۔ اور یہ الجھن اسکے چہرے سے صاف ظاہر تھی۔

میری سیٹ فرسٹ کلاس کے قریب ہی تھی۔ اچانک میں نے دروازہ کھلتے دیکھا۔ ایک ہوسٹس نمودار ہوئی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ اس کے ایک منٹ بعد میں نے جمال اور اس کے ساتھی کو آتے دیکھا، مگر جمال میری طرف متوجہ ہوئے بغیر فرسٹ کلاس کی طرف چلا گیا۔ اس کا ساتھی بھی اس کے پیچھے تھا۔ پھر کوئی دس منٹ گزر گئے۔ ایک بار پھر دروازہ کھلا، اور ایک

نوجوان باہر نکل کر وہیں کھڑا

ہو گیا۔ اس نے سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ ایک ہاتھ اس نے جیب میں ڈال رکھا تھا۔ اپنی شباہت کی بنا پر وہ مجھے فلسطینی ہی معلوم ہوتا تھا۔

پھر اسپیکر سے آواز بلند ہوئی..... خواتین وحضرات

،کیپٹن آپ سے مخاطب ہے۔ ہم آپ کو ایک ناخوشگوار اطلاع دینے پر مجبور ہیں۔ اس وقت ہمارے طیارے میں چار فلسطینی نوجوان موجود ہیں۔ اور طیارہ پر مکمل طور پر ان کا قبضہ ہے۔ ہم ان کے احکام کی تعمیل کرنے پر مجبور ہیں، کیونکہ وہ چاروں مسلح ہیں اور.....

طیارے میں اچانک سنسنی پھیل گئی، جو لوگ اونگھ رہے تھے، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ جو لوگ پڑھ رہے تھے، ان کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گئے۔ ہر چہرہ فق ہو گیا۔ ہر شخص سٹپٹا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگا۔ یہ جان لینے کے بعد کہ طیارہ اغوا کیا جا چکا ہے۔ اور اغوا کرنے والے فلسطینی جوان ہیں۔ ہر شخص

خوف زدہ ہو گیا تھا۔ طیارے میں دبی، دبی، سہمی ہوئی آوازیں، مکھیوں کی بھن بھناہٹ کی طرح گونج رہی تھیں۔ اور ان کے درمیان کیپٹن کی آواز بار بار گونج رہی تھی۔

''خواتین وحضرات، کیپٹن کی درخواست ہے کہ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ اور پرسکون رہیں۔ فلسطینی نوجوانوں نے وعدہ کیا ہے، کہ وہ مسافروں کو نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ ہاں، وہ ہمیں یرغمال کے طور پر استعمال کریں گے.....

ایک بار پھر بھنبھناہٹ تیز ہو گئی۔ خوف و ہراس ہر مسافر کے چہرے پر موجود تھا۔ میں نے گردن اچکا کر دروازے کی جانب دیکھا، سیاہ سوٹ والا نوجوان وہاں موجود تھا۔ وہ کسی شکرے کی طرح چوکنا اور چوکس نظر آ رہا تھا۔ اتنے میں جمیلہ کے

والد نے گردن اچکا کر مجھے دیکھا، اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا، اب کیا ہوگا؟۔

ڈر کی کوئی بات نہیں۔ میں نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی، آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔

ہاں ہاں میرا بھی یہی خیال ہے، کہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔انہوں نے پریشان لہجے میں کہا۔

ایک بار پھر کیپٹن کی آواز ابھری، خواتین وحضرات آپ پریشان نہ ہوں۔ سکون قائم رکھیں۔خطرے کی کوئی بات نہیں، اگر چہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ فلسطینی نوجوانوں کا ارادہ کیا ہے۔اور یہ کہ وہ ہمیں کہاں لے جائیں گے، لیکن اگر ہم ان کے ساتھ تعاون کریں گے تو وہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ براہ کرم پریشان نہ ہوں، شکریہ!،،

پھر کیپٹن کی آواز چپ ہوگئی۔اب ایک بوجھ اور دہشت خیز سکوت طاری تھا۔ اور طیارہ ایتھنز کی طرف پرواز کر رہا تھا۔مسافر پریشان اور سہمے ہوئے تھے، کیپٹن کی اطلاع کے مطابق اگر چہ فلسطینی نوجوانوں نے مسافروں سے بہتر سلوک کا وعدہ کیا تھا۔لیکن ان کا خوف زدہ ہونا بہر حال فطری تھا۔خود میرے دل کی دھڑکن معمول سے زیادہ بڑھ گئی۔ مجھے دھیرے دھیرے طیارہ اغوا کرنے کے پچھلے وہ تمام واقعات یاد آنے لگے۔ جو پچھلے چند سال میں ہوئے تھے۔اور جن میں سے بعض میں نہ صرف جہاز کو تباہ ہی کر دیا گیا تھا، بلکہ جانی نقصان بھی ہوا تھا۔اگر چہ یہ بات بھی واضح تھی، کہ کسی بھی موقع پر حریت پسندوں نے جان بوجھ کر مسافروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ انہیں ایسے اقدامات کے لئے مجبور کر دیا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد کیپٹن نے مزید اطلاعات دیں۔ان سے پتا چلا کہ ہماری منزل بدستور ایتھنز ہی ہے۔طیارہ ایر پورٹ پر اترے گا، اور فلسطینی نوجوان اپنے پانچ حریت پسند ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کریں گے۔ان پانچ حریت پسندوں کو

کچھ عرصہ پہلے حکومت یونان نے گرفتار کیا تھا۔ اور بغیر مقدمہ چلائے جیل میں ڈال دیا تھا۔ اگر ان پانچ حریت پسندوں کو رہا کر دیا گیا، تو سارے مسافر ایتھنز مین ہی اتار دیئے جائیں گے، اور طیارہ حریت پسندوں کو لے کر مشرق وسطی کے کسی ملک کو چلا جائے گا۔ ملک کا نام انہوں نے بتایا تھا۔ کیپٹن نے یہ بھی اطلاع دی تھی کہ جب تک یہ مطالبہ منظور نہیں کیا جاتا، اس وقت تک طیارہ ایرپورٹ پر ہی اترے گا۔

اور مسافروں کو بطور یرغمال طیارے کے اندر ٹھہرنا ہوگا۔

میرے دائیں طرف والی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر امریکن نے اچانک میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، کیوں صاحب اگر یہ مطالبہ پورا نہ ہوا تو کیا ہوگا؟

تو کیا ہوگا، میں نے بھی سوچا، اور مجھے جواب دینے میں دیر نہ لگی.....

اس کے بعد یہ طیارہ بم سے اڑا دیا جائے گا۔

آپ .....آپ عجیب بات کرتے ہیں، جناب،، اس نے گھبرا کر کہا۔

جی ہاں یہ بات عجیب ہی ہے۔ میں نے اطمینان سے جواب دیا، لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں، آدمی روٹی اسی وقت چھین کر حاصل کرتا ہے۔ جب وہ کئی دن کا بھوکا ہو، مگر یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اور یہ بات واقعی ہی اس امریکن کی سمجھ میں نہیں آئی تھی، چنانچہ وہ سٹپٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگا،

کچھ دیر بعد دروازہ پھر کھلا۔ اس میں جمال نمودار ہوا۔ اس نے سیاہ سوٹ والے سے کچھ کہا، سیاہ سوٹ والا فوراً اندر چلا گیا۔ اور اسکی جگہ جمال نے لے لی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی رائفل تھی، اور وہ دروازے کے قریب بت کی طرح کھڑا تھا۔ اور ایک مستعد فوجی کے انداز میں مسافروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی تھی، جس سے اس کے اندرونی ہیجان اور کش مکش کا اندازہ ہوتا تھا۔ اچانک ہماری نگاہ ملی تو اس کے ہونٹوں پر ایک گھمبیر مسکراہٹ پھیل گئی۔

جمال میں نے آہستہ سے کہا،تم ٹھیک ہونا۔میرا مطلب ہے ہر بات بالکل ٹھیک تو ہے نا۔

ہاں.....اس کے لہجے میں سمندر کی گہرائی تھی،،،،

ابھی تک ہر بات ہمارے منصوبے کے مطابق ہے۔آگے کیا ہو گا خدا بہتر جانے۔

یار یہ کیسی عجیب بات ہے۔میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہماری ملاقات.....

مجھے افسوس ہے شہزاد.....

اس نے جواب دیا،لیکن شاید قسمت اسی کو کہتے ہیں۔خود مجھے کبھی گمان نہیں ہو اتھا۔کہ ہم ان حالات میں بھی ملیں گے۔لیکن تمہیں فکر مند نہیں ہونا چاہیئے۔ہم تمہیں یا کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔یہ ہمارا وعدہ ہے۔

شکریہ.....

میں نے کچھ رک کر کہا،میں تم سے کچھ ستھیا کے بارے میں.....

پلیز شہزاد.....اس نے جلدی سے بات کاٹی،یہ موقع ایسی بات کا نہیں،زندگی رہی تو میں تم سے ستھیا کے بارے میں ڈھیر ساری باتیں کروں گا۔اور پھر.....

اسی لمحہ دروازہ کھلا اور سیاہ سوٹ والا واپس آ گیا۔جمال نے مجھے دیکھ کر اور مسکرا کر سر کو خفیف سی جنبش دی،اور دروازے میں غائب ہو گیا۔

سفر کا باقی حصہ اس طرح پورا ہوا جیسے ہم اندھے کنویں میں اتر رہے ہیں۔جہاں ہوا اور روشنی کا قطعی گزر نہ ہو،چند سو میل کا فاصلہ پھیل کر لا انتہا ہو گیا تھا،اور وقت سسک،سسک کر رینگ رہا تھا،ایتھنز پہنچتے پہنچتے کئی مسافر بیمار ہو گئے۔کئی دہشت کے باعث برسوں کے بیمار نظر آنے لگے،ایتھنز ایر پورٹ کی عمارت روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔جب طیارے نے زمین کو بوسہ دیا۔ہوائی اڈے کے اعلیٰ حکام سے وائرلیس پر رابطہ کر کے نہ صرف انہیں صورت حال کی اطلاع دی گئی

تھی، بلکہ جمال کے ساتھیوں نے انہیں اپنے مطالبے کی اہمیت اور ارادے کی قطعیت سے بھی آگاہ کر دیا تھا، جب طیارہ ہوائی اڈے کی عمارت سے کوئی دوسو گز کے فاصلے پر ٹھہر گیا، تو میں نے پورٹ ہول سے باہر دیکھا۔ ادھر ادھر کئی طیارے کھڑے تھے، لیکن دور تک گہرا سناٹا طاری تھا، کوئی شخص چلتا پھرتا نظر نہیں آتا تھا۔ پھر میں نے عمارت کی جانب دیکھا، دوسری منزل کے لاؤنجکی گیلری میں انسانی سروں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ نیچے کے حصے میں اندر اور باہر دور تک بے شمار مستعد فوجی اور پولیس کے جوان دکھائی دے رہے تھے۔ ہوائی اڈے کے حکام نے صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے غیر

معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا، لیکن کیا وہ پانچ حریت پسندوں کو رہا کر دیں گے۔؟ میں نے سوچا، سوال یہ ہے کہ پھر اتنے زیادہ فوجیوں اور پولیس والوں کی موجودگی کا کیا مطلب؟۔

سارے مسافر ٹورنگ کلاس میں جمع کر دیئے گئے۔ جن میں کیپٹن، پائلٹ اور ہوسٹس وغیرہ بھی تھیں۔ جمال کے دونوں ساتھی دونوں جانب کے دروازوں پر مستعد کھڑے تھے۔ طیارے کا ایک دروازہ کھول دیا گیا اور سیڑھی لگا دی گئی۔ مجھے جمال کہیں نظر نہ آیا۔ شاید وہ دروازے پر ہوگا۔ کھلے دروازے سے غالباً کچھ دیر پہلے ہونے والی بارش میں بھیگی ہوا اندر آ رہی تھی، جس کے باعث خنکی بڑھ گئی تھی، میں نے پورے طیارے کا جائزہ لیا

بظاہر صورت حال بالکل پرسکون تھی، لیکن مسافروں کی حالت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ البتہ اب جمیلہ کے والدین کچھ مطمئن دکھائی دیتے تھے۔ شاید انھیں یہ احساس ہو رہا ہوگا کہ وہ خود بھی فلسطینی مہاجر ہیں۔ اس لئے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

آدھ گھنٹہ اسی تناؤ اور ہیجان میں گزر گیا۔ اس دوران جمال ایک بار اندر آیا،

اپنے ساتھی سے کچھ باتیں کیں اور پھر واپس چلا گیا۔ آخر کار میں نے پورٹ ہول سے دیکھا، کہ چند افراد طیارے کی طرف آ رہے ہیں۔ ان میں چار پانچ فوجی وردی میں ملبوس تھے، اور مسلح تھے اور دو سوٹ پہنے تھے۔ وہ طیارے سے کچھ فاصلے پر رک گئے۔ پھر ایک شخص نے جو کس قدر جسیم تھا ماؤتھ اسپیکر کے ذریعے جمال اور اس کے ساتھیوں کو مخاطب کیا، چونکہ دروازہ کھلا تھا، اس لئے آواز اس حد تک اندر آ رہی تھی کہ میں بھی سنوں، وہ شخص ٹھہری ہوئی مگر دھمکی بھری آواز میں کہہ رہا تھا،

کیا تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ تم کیا کر رہے ہو؟

ابھی وقت ہے، اس پر غور کر لو، اور خود کو قانون کے حوالے کر دو۔

جمال کے پاس ماؤتھ اسپیکر نہیں تھا، مگر اس نے بلند آواز میں کہنا شروع کیا، ہمیں اچھی طرح علم ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم ہمیں مشورہ دینے میں وقت ضائع نہ کرو، اور ہمارے ساتھیوں کو ہمارے حوالے کر دو۔

اور اگر یہ مطالبہ پورا نہ کیا جائے تو

مجھے جمال کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دی ہمارے پاس رائفلیں بھی ہیں، اور بم بھی، ہم تمہیں تین گھنٹے کا وقت دیتے ہیں۔ اگر اس عرصے میں ہمارا مطالبہ پورا نہ ہوا تو ہم طیارے کو تباہ کر دیں گے۔

وہ بیس لاکھ فلسطینی بھی بے گناہ ہیں، جنہیں مغرب کی مکار سیاست اور اسرائیل کی درندگی نے جلاوطن کر دیا ہے۔ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی، وہ لوگ واپس چلے گئے۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ جمال اور اس کے ساتھیوں نے جان کی بازی لگائی تھی۔ لیکن کیا وہ لوگ کامیاب ہو جائیں گے۔

کیا واقعی ہی ان کے ساتھی رہا ہو جائیں گے۔ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ ایتھنز کے حکام اتنی آسانی سے تو یہ مطالبہ نہیں مان لیں گے۔

پھر وہ کیا کریں گے؟ میں سوچتا رہا، پھر تھک کر باہر جھانکا۔ فوجی اور پولیس کے

جوان اسی طرح موجود تھے، لیکن اوپر کی گیلری میں اب کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ غالباً اب عام لوگوں کو ایرپورٹ سے ہٹا دیا گیا تھا۔

عثمان، جمیلہ اور اس کی ماں خاموشی سے ان صبر آزما لمحوں کو جھیل رہے تھے، جمیلہ پورٹ ہول کی طرف کھڑی تھی اور اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی، لیکن اس کا ننھا سا معصوم ذہن اس ساری صورت حال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

وقت رینگتا رہا۔ یہاں تک کہ کوئی آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ پھر ایرپورٹ پر کچھ ہلچل ہوئی، میں نے دیکھا کہ چند آدمی آگے بڑھے اور طیارے کی جانب بڑھنے لگے، جب وہ کچھ قریب آئے تو میں نے انہیں شمار کیا۔ تقریباً بیس افراد تھے۔ ان میں آدھے سے زیادہ یقیناً فوجی تھے۔ اس بار وہ نسبتاً زیادہ قریب آ گئے۔ اب مین انہیں زیادہ قریب دیکھ سکتا تھا،.....اور پھر میرا دل یکا یک اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کیونکہ ان میں پانچ افراد قدرے مختلف تھے۔ ان کے لباس اچھے نہیں تھے۔ ان کے جسموں پر موٹے موٹے کمبل تھے۔ جس کے باعث ان کے چہرے کسی حد تک چھپ گئے تھے۔

کیا یہ لوگ جمال کے ساتھی تھے؟۔ میں نے مضطرب ہو کر سوچا۔

پھر میں نے ماؤتھ اسپیکر کی اونچی آواز سنی، غالباً وہی جسیم آدمی تھا، ہم تمہارے ساتھیوں کو لے آئے ہیں۔ کیا تم مسافروں کے ساتھ ان کے تبادلے پر تیار ہو؟۔

ہم تیار ہیں.....

تمہارے ساتھی..... ماؤتھ اسپیکر پر آواز آئی، طیارے پانچ گز کے فاصلے پر ٹھہر جائیں گے۔ لیکن وہ ہمارے جوانوں کی زد میں رہیں گے۔ دوسرے دروازے سے مسافر باہر آئیں گے۔ اور جب سارے مسافر باہر آ جائیں گے، تو تمہارے ساتھ تم سے آملیں گے۔ منظور ہے؟۔

جمال نے تھوڑا پس وپیش کیا۔ ان کے درمیان کچھ اور گفتگو ہوئی آخر میں

طریقہ کار میں معمولی سی تبدیلی کے بعد جمال راضی ہو گیا۔ لیکن عمل کرنے سے پہلے اس نے اپنے ایک ساتھی خالد نام کے آدمی کو آواز دی۔ جو ان پانچوں میں سے ایک تھا۔ دونوں میں چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ لیکن زبان عربی ہونے کی بنا پر میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ مگر ایسا لگتا تھا، جمال کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ پھر وہ پانچوں آگے بڑھ کر طیارے کی سیڑھیوں کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ فوراً طیارے کا پچھلا دروازہ کھول دیا گیا، اور مسافر ایک ایک کر کے اترنے لگے، جمال کے ساتھی اترنے والوں کی کڑی نگرانی کر رہے تھے۔ کیپٹن، پائلٹ اور طیارے کا دوسرے عملے کو روک لیا گیا تھا۔ سارے مسافر اتر گئے۔ میں انہیں پورٹ ہول سے تقریباً دوڑتے ہوئے ایرپورٹ کی عمارت کی جانب جاتے دیکھ رہا تھا۔ جمیلہ اور اس کے والدین اور میں سب سے آخر میں اٹھے۔

اس وقت وہ حادثہ ہوا۔

مجھے ٹھیک طرح علم نہیں کہ کیا ہوا تھا۔ صرف اندازہ ہے کہ جب ہم چاروں اترنے کے لئے دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے، تو جمال نے ان پانچوں حریت پسندوں کو اوپر آنے کے لئے کہا، لیکن وہ حریت پسند نہیں تھے، وہ فلسطینی یہودی تھے اور ان کی اداکاری بہر حال اتنی اچھی تھی کہ وہ خالد کی آواز میں جواب دے کر جمال کو بہر حال دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان کے کمبلوں کے اندر چھوٹی رائفلیں چھپی ہوئی تھیں۔ غالباً دروازے پر پہنچتے ہی انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ ساتھ ہی دور کھڑے فوجی بھی فائرنگ کرنے لگے۔ کئی چیخیں بلند ہوئیں

فضا گولیوں کی چیختی ہوئی آواز سے گونج گئی، یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا، کہ ہم سمجھ ہی نہ سکے۔

جب میں انتہائی عجلت کے عالم میں دروازے کی جانب بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا، تو ایک پائلٹ نے جمال کے ساتھی پر حملہ کر دیا۔ وہ اس سے پستول چھیننے کی

کوشش کر رہا تھا۔ جد وجہد میں گولی چل گئی۔ دو چیخیں بلند ہوئیں۔ میں نے گھوم کر دیکھا، اور پھر میرا دھڑکتا ہوا دل اچانک رک گیا۔

گولی جمیلہ کے سر پر لگی تھی، وہ دو سیٹوں کے درمیان الجھی ہوئی پڑی تھی۔ اور اس کے سر سے سرخ گاڑھا معصوم خون نکل کر اس کے کپڑوں کو سرخ کر رہا تھا۔ اس کی ماں دیوانوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اور اپنی بچی کو پکار رہی تھی۔

میں نے ایک ہاتھ اپنے دل پر رکھ لیا، اور لرزتی ٹانگوں کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔۔ مت پکارو اسے..... مت پکارو جمیلہ کو..... اب وہ کبھی واپس نہ آئے گی، یہ سب سے بڑے دکھ کی قربان گاہ پر ایک اور نذرانہ ہے۔

پھر میں سیٹوں کے درمیان دبک گیا۔ جمیلہ کی ماں اور اس کے شوہر کو بھی میں نے گھسیٹ لیا، وہ مظلوم عورت اب بھی چیخ چیخ کر رو رہی تھی، اور جمیلہ کو جھنجھوڑ رہی تھی، اور اس کا شوہر اسے تسلی دے رہا تھا۔ لیکن یہ اور بات ہے کہ خود اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ میں نے انہیں چپ کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی، کیونکہ اتنے دکھی لوگوں کو ایسے موقع پر تسلی دینا بجائے

خود بے حد سنگ دلی ہے۔

گولیاں اب بھی چل رہی تھیں۔ لیکن اب ان میں کافی کمی آ گئی تھی، فرسٹ کلاس میں جو کچھ ہو چکا تھا۔ اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔ لیکن جمال کے دو ساتھی جو ہمارے ساتھ تھے۔ ان میں سے ایک مر چکا تھا۔ اور دوسرے کو بے بس کر دیا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد گولیوں کی آواز بالکل بند ہو گئی۔ گہرا جان لیوا سکوت ہر سو چھا گیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ تصور ہی میرے لئے سوہان روح تھا کہ جمال بازی ہار چکا تھا۔

پھر ماؤتھ اسپیکر کی آواز سنائی دی۔ شاید کچھ کہا جا رہا تھا۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ چند لمحے بعد کیپٹن ہمارے پاس آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ صورت حال

پر قابو پا لیا گیا ہے۔ چار شر پسند مار دیئے گئے، اور یہ کہ تین یہودی اور دو فوجی بھی ہلاک ہوئے ہیں۔ پھر اس نے کہا، اب آپ لوگ چل سکتے ہیں۔ کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔

میں نے اس کی جانب جلتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا، پھر جسم کا بے انتہا بوجھ لرزتی ٹانگوں پر اٹھا کر دروازے کی جانب بڑھا۔ کیپٹن اور ہوسٹس جمیلہ کے والدین کو سہارا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں سیڑھیوں پر آیا۔

باہر ہوا پاگلوں کی طرح بھاگتی پھر رہی تھی۔ روشنیوں کا الاؤ چاروں طرف جل رہا تھا۔ اور آسمان کی بے حسی کائنات کے لا انتہا کناروں تک چپ چاپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے نیچے پہنچ کر فرسٹ کلاس کی سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ ایک لاش دروازہ پر پڑی تھی، ایک سیڑھیوں پر لٹک رہی تھی۔ اور تین مردہ جسم فرش پر پڑے تھے۔ ان میں سے ایک جمال تھا۔ میں یکا یک رک گیا۔ اور دل پر ہاتھ رکھ کر اسے دیکھنے لگا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں اس کا چہرہ بے حد روشن نظر آ رہا تھا۔ وہاں کوئی خوف نہ تھا، کوئی پچھتاوا نہ تھا۔ صرف یقین تھا اور دلی آسودگی تھی۔

میں نے زور سے ہونٹ بھینچ لیے اور آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرنے لگا۔ جمال کے جسم سے نکلنے والا خون فرش پر پھیل رہا تھا۔ یہ ایک بے وطن انسان کا خون تھا۔ یہ انسانیت اور محبت کا خون تھا۔ یہ ایسا خون تھا۔ جو سب سے بڑے دکھ کی خاطر بہایا جاتا ہے۔ لیکن یہ خون بہر حال رائیگاں نہیں جائے گا۔

میں نے تعظیمی نظروں سے جمال کو دیکھا، اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ستھیا کے خط کو محسوس کیا۔

جانے سے پہلے کم از کم یہ تو بتا جاتے یار کہ اب میں ستھیا کو کیا جواب دوں گا۔

غنڈا

افسانہ نگار: تمرا جنالوی

یقین کیجئے مجھے فضلو سے کوئی بیر نہیں، کوئی دشمنی نہیں۔ حتیٰ کہ اس حرامزادے سے مجھے کبھی نفرت بھی نہیں ہوئی۔ اور نہ میں نے اسے کبھی گالی دی۔ ویسے بھی مجھے گالیاں دینے کا ڈھنگ نہیں آتا، کون سالا اپنی زبان گندی کرے۔ پھر فضلو کو تو گالی دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ بڑا شریف اور سیدھا سادا آدمی نظر آتا تھا، جس کو گالی دینا بالکل اپنی ماں بہن کو گالی دینا ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود نہ جانے مجھے کیوں ایک نامعلوم سا کھٹکا کیوں لگا رہتا ہے۔

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ فضلو کو دیکھ کر میرے دل میں یہ اکڑو کڑ سی کیوں ہونے لگتی ہے۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر میری نبضوں میں خون کا دورہ رک سا کیوں جاتا ہے۔ اور جب سے پاکستان سے آیا ہوں اس گڑبڑ میں اضافہ ہو گیا ہے۔

کیا خبر تھی کہ فضلو ایسا شریف آدمی میرے سر پر ایک بھوت کی طرح سوار ہو جائے گا۔ اور ایسی گڑبڑ کرے گا۔..... لیکن سارا رونا تو اسی بات کا ہے۔ کہ یہ گڑبڑ آخر ہوئی کیوں، میں نے بہت سوچا، بہت غور کیا۔ لیکن حرام ہے اس گڑبڑ کی کوئی تک ذہن میں آئی ہو، اور سوچتے سوچتے میرا دماغ تھک جاتا، تو میں یونہی جھنجھلا اٹھتا، اور میرا جی چاہتا کہ فضلو کو گریبان سے پکڑ لوں، اور اس کے منہ پر زور سے ایک طمانچہ مار کر پوچھوں۔

فضلے، سور کے بچے۔ یہ تو نے میرے دل میں کیا گڑبڑ مچا رکھی ہے۔ آخر تو کیا چاہتا ہے، کیا مانگتا ہے۔ بول بے حیا، کمینے، حرام زادے۔ تیری ماں.....

معاف کیجیے، شریف آدمی ہوں، گالی گلوچ سے پرہیز کرتا ہوں۔ ورنہ ابھی اس سالے فضلو کا سارا خاندان اوپر نیچے کر دیتا۔

شاید آپ کہیں کہ میں بزدل ہوں، فضلو سے ڈرتا ہوں

لیکن نہیں وہ غریب میرا بگاڑ ہی کیا سکتا تھا۔ اگر میں چاہتا تو یوں چٹکی بجاتے اسے بڑے گھر کی سیر کرا سکتا تھا۔ کیونکہ آپ کی دعا سے اثر ورسوخ والا آدمی ہوں۔ وزیروں مشیروں تک پہنچ رکھتا ہوں۔

لیکن یہی تو سمجھ میں نہیں آتا، کہ اتنے اثر ورسوخ

کے باوجود میں نے فضلو کا کوئی بندوبست نہیں کیا، ہنسے! آپ دراصل میری اس کیفیت کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے، جو اس گڑبڑ کی وجہ سے ہوتی تھی، میں جب کبھی فضلو کے قدموں کی آہٹ کا اندازہ کرتا تو ایک عجیب دھک دھک سی شروع ہو جاتی۔ جیسے کوئی مجھے چابک مار رہا ہو۔ میرا دماغ چٹخنے لگتا، دل میں ایک طوفان سا اٹھتا۔ ایک بھنور سا پڑتا۔ اور اس بھنور میں لٹو کی مانند گھومتی لہروں پر ایک سیدھا سادا فضلو۔ بھولا، بھالا فضلو۔ ایماندار، شریف اور کاریگر فضلو اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ نمودار ہوتا۔

خاں صاحب جی وی جمناوئی.....ہی ہی ہی

اور فضلو کی یہ ہی ہی، سانپ کی ایک لکیر بن کر میرے ذہن کے گوشے گوشے میں رینگنے لگ جاتی۔ اور وہ سانپ کا بچہ خود ہی کرتا غائب ہو جاتا، پھر انہی لہروں کے دھندلکوں میں جمناوئی کا چہرہ نظر آتا، جو کے مارتے ہوئے پوچھتی۔

کھاں جی یہ پھجا تو بڑا کاریگر معلوم ہوتا ہے، کیوں جی۔؟ اور میں دل پکڑ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح۔

آپ پوچھیں گے فضلو کون تھا۔؟ اس کا اصل نام فضل داد تھا۔ لیکن سب اسے فضلو کہتے تھے۔ اور وہ کیوں جی کی سالی جناوئی اسے پھجا کہتی تھی۔ یہ ناموں گڑبڑ

بھی عجیب ہوتی ہے۔ اب میرے نام ہی کو لیجیئے، کہاں منا..... فضلو اس وقت میرے ہاں ڈرائیور تھا، جب میرے کنڈم لوہے کے سٹاک چاندی کے بھاؤ بک گئے۔ اور میں نے کار خرید لی۔

یہ جنگ کا ذکر آیا ہے، تو بے اختیار جی چاہنے لگا ہے کہ پھر کوئی جنگ چھڑ جائے، اور اپنا بھی دھندا شروع ہو۔ مدت سے بینک میں کوئی موٹی رقم جمع نہیں کرائی، کوئی بیوپار نہیں کیا، اور بلیک مارکیٹنگ کا تو سارا دھندا ہی جاتا رہا۔ لیکن پھر بھی مولا کا شکر ہے۔ جنگ کی آس پر جی رہے ہیں۔ سالی کبھی تو شروع ہوگی۔ یہ انگریز اور امریکہ والے بیٹھے کیا مکھیاں مار رہے ہیں۔ اٹھ کر آدمی مارو، کچھ ہمارے بھی پلے پڑے۔ ایک مدت سے سن رہا ہوں کہ امریکہ جنگ کی تیاری کر رہا ہے۔ لیکن معلوم نہیں ابھی تک چپ کیوں ہے۔ بھئی تمہارے پاس فوجیں ہیں سامان جنگ ہے، ایٹم بم ہے۔ اور سنا ہے کہ ایک ہائیڈروجن بم بھی تیار کر چکے ہو۔ پھر تم کب تک روس کا منہ دیکھو گے۔ اور فرض کرو یہ روس سالا جنگ ہی نہ کرنا چاہے، تو کیا تم بھی بزدلوں کی طرح بیٹھے رہو گے، حد ہوگئی۔

دو چار دن ہوئے اخبار میں پڑھا تھا، کہ امریکی فوجوں کو تیار رہنے کا حکم مل گیا ہے۔ مزا آیا نا اخبار پڑھنے کا۔ میں بھی حیران تھا کہ امریکہ سمجھدار اور دولت مند ہو کر بھی ابھی تک خاموش کیوں ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ کوئی ہلچل ہونے والی ہے۔ بعض لوگ اس ہلچل کے خلاف ہیں۔ کہتے ہیں کہ جنگ بری ہوتی ہے۔ جنگ میں آدمی مرتے ہیں۔ بندہ پوچھے کہ آدمی نہیں تو کیا بھوت پریت مریں گے۔ یہ کام تو آدمیوں ہی کا ہے۔ آدمی جن لگرتا ہے۔ آدمی جنگ میں مر جاتا ہے۔ کیا آج کل انسانوں نے مرنا بند کر رکھا ہے۔

روز مرتے ہیں، سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں مرتے ہیں۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ جنگ میں مرنا پسند نہیں کرتے۔ گھروں میں مرتے ہیں کھاٹ پر

ہڈیاں رگڑتے ہیں۔خون تھوکتے، روتے بسورتے، بھئی جب مرنا ہی ہے تو آدمیوں کی طرح مرو۔بعض سر پھرے تو جنگ کے خلاف جلسے کرتے ہیں۔جلوس نکالتے ہیں۔امن کا واویلا کرتے ہیں۔اور بلیک مارکیٹ کرنے والوں کو چور، بے ایمان، غدار اور نہ جانے کیا اناپ شناپ بکتے ہیں۔لیکن ذرا آپ ہی انصاف کیجئے۔پچھلی جنگ شروع نہ ہوئی ہوتی۔اور بلیک مارکیٹ کا دھندا شروع نہ ہوا ہوتا تو میرا ردی لوہا جسے کوئی مفت اٹھانے پر بھی تیار نہیں تھا۔اس قدر مہنگے داموں کس طرح فروخت ہوتا۔میں کوٹھیوں کا مالک کیسے بنتا۔اور کار کیسے خریدتا۔فضلو کو چالیس روپے ماہوار پر ڈرائیور کیسے رکھتا۔اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ

مین منے ٹین ساز سے خان بہادر چوہدری عبدالرحمان گورنمنٹ کنٹریکٹر کس طرح بن جاتا۔

آج اگر منے ٹین ساز کے الفاظ پر غور کرتا ہوں، تو یقین ہی نہیں آتا کہ کبھی یہی میرا نام تھا۔لیکن قربان جاؤں اس نیلی چھتری والے کے، جنگ کیا شروع ہوئی۔میری قسمت کا بند دروازہ ٹک سے کھل گیا۔

چھت پھٹ گئی، بوسیدہ دیواریں دھڑام سے گر گئیں

اور اس کے نیچے منا ٹین ساز ہمیشہ کے لئے دفن ہو گیا۔دوسری طرف ایک نیا محل بن رہا تھا۔ایک نئی تعمیر ہو رہی تھی، اور اس کے ساتھ ساتھ ایک نیا انسان ابھر رہا تھا۔

چودھری عبدالرحمان خان

چودھری عبدالرحمان خان گورنمنٹ کنٹریکٹر

خان بہادر چوہدری عبدالرحمان گونمنٹ کنٹریکٹر

اور یہ سب کچھ جنگ کی طفیل تھا، بلیک مارکیت کی برکتیں تھیں، روپیہ آ رہا تھا، روپیہ جمع ہو رہا تھا۔

مگر ایک بات بتادوں کہ جنگ میں ہر شخص روپیہ جمع نہیں کر سکتا۔ اس کام کے لئے بھی سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دور نہ جایئے میری مثال آپ کے سامنے ہے۔ پہلے مجھے بھی روپیہ جمع کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ میں بڑا ایماندار بنتا تھا، ضمیر کی آواز سے ڈرتا تھا۔ اور جتنا میں ضمیر کی آواز سے ڈرا، کھانا پینا حرام ہو گیا۔ ادھر بیوپاری جنگ کی وجہ سے ہاتھ رنگ رہے تھے، لاکھ سے سوا لاکھ ہو گیا تھا۔ ادھر میرے سر پر ضمیر کا بھوت سوار تھا۔ ایک دن میں نے سوچا، ہٹاؤ جی اس جھگڑے کو، گولی مارو ضمیر کو، جیب میں پیسہ ہوگا، تو ایک چھوڑ بیسیوں ضمیر خریدے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے منے ٹین ساز کے ضمیر کا گلا بھی گھونٹ دیا، اور روز کی بک بک اور جھک جھک سے نجات پائی۔ میں نے سرکاری افسروں کی جی حضوریاں شروع کیں، انہیں پارٹیاں دیں، ان کی مٹھیاں گرم کیں، اس طرح میرا کنڈم لوہا چاندی کے سکوں میں ڈھلنے لگا۔ مجھے گورنمنٹ کے ٹھیکے ملے، اور دولت کی بارش ہونے لگی، چھنن، چھنن، پھر خان بہادری آئی، کار آئی، فضلو ڈرائیور آیا، اور بھی بہت کچھ آیا۔

ہاں تو بات فضلو ڈرائیور کی ہو رہی تھی، فضلو موضع ٹھیکری والا، جسے ماجھے کا علاقہ کہتے ہیں، کا رہنے والا تھا۔ ۴۲ء میں جب جنگ زوروں پر تھی۔ فضلو لام پر جانے کے ارادے سے گھر سے نکلا۔ لیکن دھاری وال پہنچ کر فضلو نے سوچا، لعنت بھیجو۔ آخر فوجی نوکری میں دھرا ہی کیا ہے۔ گزر اوقات کے لئے وہ چند روپے تو ہر جگہ سے کما سکتا ہے۔ ہر وقت جان کا خطرہ کون مول لے۔ اور پھر دشمن کی گولی یہ تھوڑی دیکھتی ہے کہ اس کے سامنے ایک ایسا شوہر کھڑا ہے، جس کی دلہن کے ہاتھوں سے ابھی سہاگ کی مہندی نہیں اتری، جو جنگ کے میدان سے ہزاروں میل دور موضع ٹھیکری والا میں ایک نیم کے درخت کی چھاؤں تلے بیٹھی اپنے شوہر کی واپسی کے خواب دیکھ رہی ہے۔ جو تاروں بھری رات میں چارپائی پر اکیلی لیٹی اپنے محبوب کی یاد میں درد بھرے گیت الاپ رہی ہے۔ اور فضلو اپنی نئی نویلی

دلہن کی خاطر دھاریوال کی مل ہی میں قلی بھرتی ہوگیا۔ابھی اسے ملازم ہوئے چھ ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ اسکی بیوی کو تپ دق ہوگئی۔علاج معالجے کے لئے فضلو کو چھ ماہ گاؤں میں رہنا پڑا، جس کی وجہ سے اسے مل کی نوکری سے جواب مل گیا۔ اور خدا آپ کا بھلا کرے۔ادھر بیوی نے بھی جواب دے دیا،

یہ بیوی کی ذات بھی عجیب ہوتی ہے۔ میں تو اسے نری تپ دق ہی سمجھتا ہوں۔ پھر کون آٹھوں پہر اس بیماری کو گلے سے لگائے پھرے۔اس لئے تو اپنی بیوی کی وفات پر میں نے آج تک شادی نہیں کی، اور نہ ہی آپ کی دعا سے اس قسم کا کوئی ارادہ ہے۔کیونکہ سنا ہے بڑے آدمی عموماً شادی سے پرہیز کرتے ہیں۔

پھر ہر روز جب ایک نئی..... خیر اس ذکر کو چھوڑیے

، کچھ سکی سا آدمی واقع ہوا ہوں۔فضلو کی بیوی کا ذکر چلا تو مجھے اپنی بیوی یاد آ گئی، اللہ بخشے سالی نے دو بچے کیا جنے، سمجھو گوالیار کا قلعہ فتح کرلیا۔جب تیسرے کی باری آئی تو میں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

بختو خدا کے لئے یہ چاند ماری کا سلسلہ بند کر، میں زیادہ چوٹ نہیں سہہ سکتا۔ بختو میری بیوی کا نام تھا۔نام تو خیر اس کا بختاور تھا۔لیکن میں اسے بختو ہی کہا کرتا تھا۔

میری بات سن کر اس کی گردن شرم سے جھک گئی۔آنکھوں میں ایک شرمیلی سی مسکراہٹ تیر گئی، جیسے بادل کے حاشیے سے نکل کر اچانک چاند کی ایلکرن جگمگا اٹھے۔پھر وہ اپنے گول مٹول پیٹ کو دوپٹے سے چھپاتی ہوئی بولی، منے شرم کر کیسی باتیں کرتا ہے۔

شرم تو تجھے کرنی چاہیئے جو ہر سال.....

اور بختو کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔اس کی پیشانی پر لکیریں سی نمودار ہوئیں۔اس نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا،

بس..... اب اور کچھ نہ کہنا، اولاد تو خدا کی نعمت ہوتی ہے۔ تم اسکی ناشکری کیوں کرتے ہو۔

مین ہنس دیا۔ بتایئے اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ پھر اس نے اپنی بائیں بڑے پیار سے میرے گلے میں ڈال دیں اور کہنے لگی،

اب کے مجھے سونے کا ہار بنوا دینا۔ پہن کر میکے جاؤں گی۔ نہ جانے ان عورتوں کو زیور کے ساتھ میکہ کیوں یاد آنے لگتا ہے۔ مجھے بختو کی بات پر غصہ آ گیا۔ غصہ تو مجھے اسپر اب بھی کبھی کبھی آ جاتا ہے، لیکن اب جب کہ وہ مر چکی ہے۔ گالیاں دینے سے کیا فائدہ۔ بہر حال وہ مر گئی۔ اور سونے کے ہار کی حسرت لیے ہوئے مر گئی۔ آج اگر وہ زندہ ہوتی تو میں اسے سونے سے پیلی کر دیتا، مگر قدرت کے کھیل نیارے ہیں۔ ہوسکتا ہے، اگر وہ زندہ رہتی تو اس کی بختاوری کے طفیل میری قسمت میں بھی سدا تالے ہی پڑے رہتے۔ جب تک جیتی رہی پیٹ بھر کر روٹی بھی نہ نصیب ہوئی۔ اسے دفن کرنے کی دیر تھی۔ کہ میرے ردی لوہے کے اسٹاک چاندی کے بھاؤ بکنے لگے۔ مٹی روپیہ اگلنے لگی، چھنن..... چھنن اسی لئے تو میں کہتا ہوں بیویوں کو مر ہی جانا چاہیئے۔

ہاں تو بات اصل میں فضلو کی بیوی کی تھی جو موضع ٹھیکرے والا سے چل کر بٹالہ شریف کے محلّہ انارکلی تک جا پہنچی، اب تو وہاں سالے سکھ ہی سکھ رہتے ہوں گے۔ ان کی..... معاف کیجیئے بٹالہ کی بات آپ کو پھر سناؤں گا، پہلے آپ فضلو کی بات سنیں جو جھگڑے کی اصل بنیاد ہے۔ فضلو کے ماں باپ تو پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ بیوی پیاری ہو جانے کے بعد اب اس کے لئے گاؤں میں کوئی کشش نہ رہی، اور اس نے پھر لام پر جانے کا فیصلہ کیا۔ اور اب کہ سیدھا بٹالہ پہنچا جہاں بھرتی کا بہت زور تھا۔

بھرتی کے دفتر تک پہنچنے سے قبل فضلو ایک کانگرسی ورکر کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس

نے اس کی پاسنگ شو کے سگرٹوں سے اس کی تواضع کی، اور متواتر دو گھنٹے فوجی بھرتی کے خلاف لیکچر پلایا۔

اور آخر یہ کہہ کر چلا گیا۔ یہ جنگ ہندستانیوں کی نہیں۔ انگریزوں کی ہے، سامراجیوں کی ہے، تم کیوں خواہ مخواہ قربانی کا بکرا بنو۔

کانگرسی ورک رک چلے جانے کے بعد بکرے کو اپنی بیوی یاد آ گئی۔ حالانکہ وہ سالی مرکھپ چکی تھی۔ اور اس نے سوچنا شروع کیا، ہندوستانیوں کو لام پر نہیں جانا چاہیئے۔ سامراج کی خاطر قربانی کا بکرا نہیں بننا چاہیئے۔ حالانکہ سامراج کیا ہے۔ اس کا فضلو کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا۔ یہ معمہ اسے ایک کامریڈ نے سمجھایا، جو لاریوں کے اڈے کے پاس ایک غلیظ سے ہوٹل میں بیٹھا کسی مسافر سے سامراجی نظام پر بحث کر رہا تھا۔ کامریڈ نے بیڑی پیتے ہوئے پہلے تو فضلو کو یہ بتایا کہ پاسنگ شو کے مقابلے پر بیڑی بہت اچھی ہے، اس سے گلا جلدی کڑوا ہو جاتا ہے۔ پھر اس نے سامراجیوں کو بے تحاشا گالیاں دینا شروع کر دیں۔ وہ کہنے لگا، سامراج لوٹ کھسوٹ کا دوسرا نام ہے۔ ہندوستان پر بھی سامراجیوں کی حکومت ہے، جو غریب ہندوستانیوں کا خون نچوڑ رہے ہیں۔ جرمنی، اٹلی اور جاپان فاشسٹ ملک ہیں۔ اور ہندوستان کی فاشی ملکوں کے خلاف فوج میں ضرور بھرتی ہونا چاہیئے۔

لیکن فضلو فوج میں بھرتی نہ ہو سکا۔ اس نے بٹالہ ہی میں پیرس موٹر میکینیکل ورکشاپ میں تیس روپے کی نوکری کر لی۔ ہاں اسے جرمنی، جاپان، اٹلی سے نفرت ہو گئی۔ سرمایا داروں اور انگریزوں سے نفرت ہو گئی۔ اور انگریزوں سے تو آپ کے اس غلام چوہدری عبدالرحمان کو بھی نفرت ہے۔ لیکن یہ سرمایہ داروں سے نفرت والی بات مجھے بری طرح کھٹکتی ہے۔ گولی کی طرح سینے میں لگتی ہے۔ سرمایا داروں نے کیا گناہ کیا ہے۔ وہ مزدور سے محنت کرواتے ہیں۔ اس کی مزدوری اسے دیتے ہیں اور منافع خود کھاتے ہیں۔ اس میں بھلا کیا برائی ہے۔ کہتے ہیں جو محنت کرے وہی

کھائے دوسرا نہ کھائے۔ بندہ پوچھے، کیوں نہ کھائے، کیا تمارے باوا کی حکومت ہے۔

ہاں تو فضلو، پیرس موٹر مکینکل ورکشاپ میں ملازم ہو گیا۔ میں کبھی کبھار ضرورت سے وہاں جایا کرتا تھا۔ اور وہیں میری ملاقات فضلو سے ہوئی۔

میرے پہلے ڈرائیور کا نام جوگندر سنگھ تھا۔ اور میں سمجھتا تھا کہ وہ ایک سیدھا سادا سکھ ہے۔ لیکن وہ تو پورا غنڈہ نکلا۔ ہوا یوں کہ میں نے اسے دو ماہ کی تنخواہ نہ دی۔ کیونکہ میرا خیال تھا، اس طرح نوکر قابو میں رہتے ہیں۔ ایک دن اپنے ساتھ دو تین اور سکھ لے آیا اور آتے ہی کہنے لگا۔ خان جی میری دو ماہ کی تنخواہ نکالو۔ ورنہ میں دوسری طرح سے وصول کروں گا۔

یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، جی میں آیا، سالے کو شوٹ کر دوں۔ پھر سوچا قتل کا کیس ہے..... پولیس سے لے کر ہائی کورٹ کے ججوں کی مٹھی گرم کرنا پڑے گی۔ اور بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ ستر اسی ہزار روپیہ اٹھ جائے گا، دل نے کہا:۔

''میاں! جانے دو کون اس جھنجھٹ میں پڑے''

چنانچہ جانے دیا اور جوگندر کی دو ماہ کی تنخواہ اس کے منہ پر دے ماری۔ تنخواہ جیب میں رکھ کر وہ کہنے لگا: '' اور وارا لاؤنس دینا پڑے گا''

خیر صاحب! وارا لاؤنس کے بھی بیس روپے دے کر ان غنڈوں سے جان چھڑائی جن کا مجھے آج تک بہت افسوس ہے، اور ہر شریف آدمی کو افسوس ہوگا۔ ان بیس روپوؤں سے وسکی کی بوتل آ سکتی تھی، وہی بیس روپے اگر میں جمنا دئی کو دیتا تو وہ سالی گھنٹہ بھر میری مٹھی چاپی کرتی لیکن جوگندر کا بچہ وہ بیس روپے بالکل مفت ہی میں لے گیا جیسے اس کے باپ کی کمائی تھی۔

جوگندر کا حساب نیٹر کر میں نے اسے چلتا کیا اور اس کی جگہ فضلو کو چالیس روپے ماہوار پر ڈائیور رکھ لیا۔

شاید میں نے آپ کو نہیں بتایا کہ جمنا دئی گراموفون سنگر سے میرے کچھ خاص تعلقات تھے۔ ظالم کی آواز کیا تھی؟ کچھ نہ پوچھئے جب گاتی تو یوں لگتا جیسے سارا بٹالہ شریف نیندوں کے سمندر میں ہچکولے کھا رہا ہو شکل وصورت کی تو کچھ واجبی ہی سی تھی مگر ہر وقت سارنگی کی مانند کسی کسائی رہتی تھی اس کا بدن باٹا کے دوھرے تلے والے بروکشو کی قسم کا کاتھا بھرا بھرا، نرم وگداز اور چمک دار۔ معاف کیجئے مجھے دوھرے بدن کی عورت خاص طور پر پسند ہے اور یہی وجہ کہ جمناوئی کے ساتھ میرے تعلقات بھی خاص قسم کے تھے۔

جمناوئی کہنے کو تو گراموفوں سنگر تھی لیکن دراصل وہ اپنی ماں ہی کا دھندا کرتی تھی۔ اس کا کوٹھا بڑے بازار میں تھا اور جس طرح بٹالہ کے چارہ کترنے والے مشینی ٹوکے مشہور تھے اسی طرح جمناوئی مشہور تھی۔ یوں تو بیسیوں آدمی آتے جاتے تھے مگر جمنا دئی مجھے سے زیادہ ہی گھل مل گئی تھی۔ اور جب میں نے فضلو کو ملازم رکھا تو پوچھنے لگی۔

کیوں جی اس نئے ڈلیور کا کیا نام ہے۔

میں نے کہا فضلو،

مسکرا کر بولی نام تو اچھا ہے..... کیوں جی

میں سمجھ گیا کہ سالی فضلو پر تجھ گئی ہے۔ اسے دراصل فضلو کا نام نہیں، چام اچھا لگا تھا، لیکن مجھے فضلو کا کام پسند تھا۔ اور ہر شریف آدمی اپنے نوکر کا نام اور چام نہیں بلکہ کام پسند کرے گا۔

کام کے اعتبار سے فضلو ایک ان تھک آدمی تھا۔ پھر شریف اور ایمان دار۔ پہلے وہ غلام عباس ایک موٹر میکنک کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے اسے اپنی کوٹھی ہی میں کوارٹر دے دیا۔ اس طرح وہ میرے دوسرے کام بھی کر سکتا تھا۔

فضلو نہ صرف شکل وصورت کا اچھا تھا۔ بلکہ جسمانی لحاظ سے بھی کافی گٹھیلا اور

کڑیل تھا۔ اور ہر عورت اسے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر سکتی تھی۔ شاید اس لئے جمنا دئی اس پر ریجھ گئی تھی۔ حرامزادی جب میرے پاس بیٹھتی تو کسی نہ کسی بہانے اس کا ذکر ضرور کرتی۔ اور اس کی تان عموماً اس فقرے پر ٹوٹتی یہ پھجا تو بڑے کام کا ملوم ہوتا ہے۔..... حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ فضلو نے جمنا دئی کو ابھی تک اپنی کوئی کاریگری نہیں دکھائی تھی۔ اور وہ غریب اسے اپنی کاریگری کیسے دکھا سکتا تھا، کیونکہ جمنا دئی کو کاریگری

دکھانے کے لئے کوٹھی اور کار چاہیئے۔ اور فضلو صرف چالیس روپے کا معمولی ڈرائیور تھا۔ اب ظاہر ہے، چالیس روپے میں کوئی کاریگری نہیں ہو سکتی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ جب بھی فضلو کا ذکر کرتی تو ایک رقابت کا احساس جاگ اٹھتا۔

اور ایک رات جب میں سینما سے واپس آیا تو مجھے فضلو کے کوارٹر کے پاس سگریٹ کا شعلہ چمکتا ہوا نظر آیا، اور ہلکی ہلکی آواز بھی سنائی دی۔

پھجا جی تم ہمارے پس کیوں نہیں آتے، آیا کرو نا۔

فضلو خاموش رہا، وہ پھر بولی

کیا کھاں جی سے ڈر لگتا ہے..... سیں.....

نہیں۔

پھر کیا میں اچھی نہیں لگتی۔

فضلو چپ رہا اور جمنا دئی کے سگرٹ کا شعلہ پھر چمکنے لگا۔ اس نے زور سے مکہ مار کر پھر کش لگایا

اور سگرٹ فضلو کی طرف بڑھایا۔

پھجا جی لو سگرٹ پیو۔

نہیں میں سگرٹ نہیں پیتا۔

کیوں جی

جواب میں فضلو نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی۔ چند منٹ خاموشی کے بعد جمنا دئی پھر بولی۔

اچھا یہ تو بتاؤ کھاں جی تمہیں کیا تنکھا دیتے ہیں

چالیس روپے۔

بس کیا میرے پاس نوکری کرو گے؟ پچاس روپے دوں گی۔

نہیں

کیوں جی..... اس کے نتھنوں میں سے سیں کی آواز نکلی، اور اس نے کہا

کیا پچاس روپیہ تھوڑا ہے میں جاستی کردوں گی۔

نہیں جمنا دئی تنخواہ کی بات نہیں

پھر کیا بات ہے جی

بات..... بات تو کچھ بھی نہیں

اور پھر فضلو مسکرایا جمنا دئی میں کاریگر ہوں، کام کرتا ہوں تنخواہ پاتا ہوں۔ لیکن تمہارے پاس..... میرا مطلب ہے تمہارے پاس میں کیا کروں گا۔

یہ جمنا دئی بھی جانتی تھی اور فضلو بھی، کہ اسے کیا کام کرنا ہوگا۔ لیکن جمنا دئی نے فضلو کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں فضلو پر بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اس کی طرف سے میرے دل میں جو ایک کانٹا سا پھنسا تھا خود بخود نکل گیا تھا۔

اور ساتھ ہی ساتھ مجھے جمنا دئی سے نفرت ہوگئی

میں نے اسے اپنے ہاں بلانا چھوڑ دیا۔ جب پندرہ بیس روز گزر گئے تو مجھے اس ظالم کی بری طرح یاد آنے لگی۔ اور خدا آپ کا بھلا کرے، جمنا دئی چیز ہی بڑی ظالم تھی۔ میں نے سوچا اگر وہ نہ آئی تو چل کر منا لیتے ہیں۔ چنانچہ اسی رات میں نے جمنا دئی کو منا لیا۔ جب ہم لوٹے تو فضلو کہنے لگا۔

خاں صاحب جی یہ جمنا دئی.....

ہاں کیا ہے جمنا دئی کو

کچھ نہیں آپ اس کے پاس کیا لینے جاتے ہیں۔

یہ بات سن کر میری ہنسی نکل گئی

رنڈیوں کے پاس آدمی کیا لینے جاتے ہیں

پر یہ ٹھیک نہیں

کیا ٹھیک نہیں

جمنا دئی آپ اس سے ہوشیار رہیں

میں نے کہا

فضول رنڈیاں سب ایسی ہوتی ہیں۔ اگر ایسی نہ ہوں تو ان کا دھندا کیسے چلے۔

.....اور میرا کیا ہے، روز سینکڑوں روپے کماتا ہوں۔ اگر ان میں سے دس پندرہ جمنا دئی لے جاتی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کی قسمت میں بھی جنگ کی کمائی لکھی ہے سالی کر لے عیش۔

اور جمنا دئی عیش کرتی رہی

انہی دنوں بنگال میں قحط پھوٹ پڑا اور وہاں چاول کی قیمت پہلے دوگنی ہوئی۔ پھر چوگنی۔ پھر قیمت دس گنا بڑھ گئی۔ پھر بیس، تیس گنا، پھر قیمت بڑھتی گئی۔ اور چاول گھٹتے گئے، حتیٰ کہ قیمت ہی

قیمت رہ گئی۔ چاول غائب ہو گئے۔ بھوک سے تلملاتے انسان اور دم توڑتے انسان چاول کے لئے گھر بار بیچ رہے تھے۔ عزت بیچ رہے تھے۔ لڑکیاں بیچ رہے تھے۔ لیکن چاول ناپید تھے۔ میں نے سوچا قدرت کی مہربانی سے بزنس کا اچھا موقع ہے۔ اگر بنگال میں چاول سپلائی کیے جائیں، تو لاکھوں روپے یوں چٹکی بجاتے کما سکتا ہوں۔ کیونکہ ان دنوں بنگال میں چاول کا ایک ایک دانہ سونے کے بھاؤ بک رہا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ بنگالی ساہوکاروں کے گودام چاولوں کی بوریوں سے

بھرے ہوئے ہیں۔اور پنجاب سے چاول سپلائی کرنے کا پرمٹ نہیں مل سکتا۔ مجھے پرمٹ نہ مل سکا،مگر ایک بنگالی لڑکی ضرور مل گئی تھی،جس کا نام جمی تھی۔

جمی کا اصلی نام جمیلہ تھا۔خیر جمیلہ ایک غریب باپ کی بیٹی تھی،جو قحط کے دنوں میں چاول کی تلاش میں دوسری دنیا میں پہنچ گیا۔جیسے وہاں اس کے لئے کسی نے دھان کی فصل بو رکھی تھی۔جمی اور اسکی ماں سڑک پر بے ہوش پڑی تھیں۔کہ ریلیف کیمپ کے رضا کار اسے چھکڑے میں لاد کر کیمپ میں لے آئے،کیمپ تک آتے آتے جمی کی ماں بھی چاول کی تلاش میں نکل پڑی۔اور جمی اکیلی رہ گئی۔مگر لڑکی جوان اور خوش شکل تھی۔اس لئے اسے کیمپ میں چاول چھوڑ چائے ملی،دودھ ملا،پیسٹری ملی، کیک ملے۔ پانچ کا ایک نوٹ ملا۔اور جمی ایک سو روپے میں دلال ک یہاتھ فروخت ہوگئی۔دلال نے اسکی سیوا کی،میوہ کھایا۔اور اسے ایک پنجابی بیوپاری کے ہاتھ تین سو روپے میں بیچ دیا

جو اسے پنجاب کی مشہور منڈی امرتسر لے آیا۔اور یہاں رام دیال نے اسے پانچ سو روپے میں خریدا۔اور پھر ساڑھے چھ سو روپے میں جمنادئی کے ہاتھ بک گئی۔اور خدا آپ کا بھلا کرے جمنادئی کو پورے آٹھ سو کی رقم دے کر جمی کو میں نے خرید لی۔بالکل اسی طرح جس طرح ہر سال ایک نئی مچھر دانی خریدتا ہوں۔

جمی کا رنگ سانولا اور نقش تیکھے تھے۔لیکن اس کا بدن نرا باٹا کا بروک شو تھا۔اور مجھے باٹا کا دہرے تلے والا بروک شو بہت پسند ہے۔

میں نے جمی کو فضلو کے ساتھ ایک کوارٹر دے دیا۔اور

فضلو کو ہدایت دی کہ وہ اسکی نگرانی کرے۔جمی بالکل گم سم اور اداس تھی۔اس نے ٹوٹ پھوٹی اردو میں اپنی رام کہانی سنائی۔

رات کے وقت میں نے جمی کو اپنے پاس بلایا۔میرے سامنے وہ گم سم اور خاموش ہوگئی۔ اس کی صورت دیکھ کر مجھے احساس ہونے لگا کہ میں نے جمی

کو خرید کر غلطی کی ہے۔ آٹھ سو روپے میں بنگال کی لاش خرید لایا ہوں۔ اور جب میں نے اسے ہاتھ لگایا، تو مجھے واقعی ایسا لگا جیسے میں نے ایک لاش کو ہاتھ لگایا ہو۔

اپنی بدحواسی کو چھپاتے ہوئے میں نے پوچھا۔ کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے۔

نہیں اسنے جواب دیا

میرے جی میں آئی کہ پروگرام کینسل کردوں۔ لیکن وہ پورے آٹھ سو کی رقم۔ دل نے کہا۔

میاں، بنا بنایا پروگرام کیوں کینسل کرتے ہو۔

اور میں نے سوچا کہ واقعی یہ کہاں کی شرافت ہے۔ آخر میں نے رقم خرچ کی ہے، کوئی جھک نہیں ماری۔ اگر ایسے پروگرام کینسل ہوتے رہے تو لعنت ہے ایسے بزنس پر۔ میں نے سوچا، پہلے ذرا ریفریشمنٹ ہونی چاہیئے۔ میں نے بسکٹ نکال کر دیئے۔ وہ کھانے لگی۔ پھر میں نے سگریٹ سلگا کر اس کی بڑھائی۔ اس نے سگریٹ لے لیا، اور مزے سے پینے لگی۔ میں سمجھ گیا لڑکی خاصی سلجھی ہوئی ہے۔ ذرا بے باک ہوگئی تو خوب مزہ رہے گا۔

میں نے پوچھا کیا تم میری بولی سمجھتی ہو۔ اس نے ہاں کہا۔ اور اس کے شانے سے پلو ڈھلک گیا۔ میرے اندر جیسے کسی نے آگ بھر دی۔ ابھی میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا ہی تھا۔ کہ باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ میرا سارا بدن پسینے میں شرابور تھا۔ جب دروازہ کھولا تو مجھے فضلو نظر آیا۔

اس وقت مجھے وہ بالکل موت کا فرشتہ معلوم ہو رہا تھا۔

اس نے بوکھلائے ہوئے لہجے مین جواب دیا

پولیس آ رہی ہے۔

پولیس؟

میرے رہے سہے ہوش بھی جاتے رہے۔ آخر افراتفری میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ

جمی کو کہیں چھپا دیا جائے

لیکن کہاں

فضلو کو کہا کہ وہ اسے کہیں لے جائے۔ چنانچہ جمی فضلو کے ساتھ کہیں چلی گئی۔ اور میں پولیس کے آنے تک حواس درست کرنے لگا۔ گھنٹہ گزر گیا۔ دو گھنٹے گزر گئے مگر پولیس نہ آئی۔ ہاں فضلو آ گیا۔ اور اس نے بتایا کہ وہ جمی کو موٹر میکنک غلام عباس کے ہاں چھوڑ آیا ہوں۔ جہاں پولیس کے فرشتے بھی اسکا کھوج نہیں لگا سکتے۔ لیکن میں حیران تھا، کہ یکا یک یہ پولیس کی وبا کیسے پھوٹ پڑی۔

خیر صاحب ساری رات سالی پولیس نہ آئی۔ اور نہ ہی نیند آسکی۔ صبح کو میں نے فضلو سے کہا کہ وہ جمی کو لے آئے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ لیکن صبح غلام عباس کی زبانی معلوم ہوا کہ جمی رات کو ہی اس کے گھر سے چلی گئی تھی۔ میں بڑا پریشان ہوا۔ فضلو نے کہا لیکن وہ جا کہاں سکتی ہے۔

ہوسکتا ہے وہ پولیس کا نام سن کر ڈر گئی ہو۔ مگر جہاں کہاں سکتی ہے۔

جمی کی تلاش شروع ہوئی۔ واقعی وہ غلام عباس کے گھر نہیں تھی۔ وہ جمنا دئی کے ہاں نہیں تھی۔ وہ رام دیال کے ہاں نہیں تھی۔ وہ بٹالہ اور امرتسر نہیں تھی۔

ایک دن فضلو نے بتایا کہ ہوسکتا ہے۔ وہ اپنے کسی یار کے ساتھ بنگال چلی گئی ہو۔

اور میں حیران تھا، کہ جمی ایسی شریف لڑکی جو کلکتہ سے بٹالہ تک برابر فروخت ہوتی رہی۔ ایک رات کے ہیر پھیر میں کیسے غائب ہوگئی۔ اس کا یوں غائب ہو جانا ظاہر کرتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ حالانکہ میرے لئے تو وہ اسی وقت مر گئی تھی، جب اسے کیمپ میں پانچ کا نوٹ ملا تھا۔ کیمپ سے نکل کر وہ ایک جنس بن چکی تھی، روپیہ بن چکی تھی، سو۔ تین سو، پانسو۔ ساڑھے چھ سو۔ حتیٰ کہ پورے آٹھ سو..... اور اب بٹالہ سے جمی نہیں، بلکہ پورے آٹھ سو روپے کی رقم غائب ہوئی تھی۔

خیال فرمائیے، ایک دو نہیں، پورے آٹھ سو، جن کا مجھے آج تک بہت افسوس ہے۔ کیونکہ یہ روپے کسی کھاتے مین نہ پڑے۔ کئی ماہ تک یہ آٹھ سو روپے کی رقم جمی بن کر میرے تصور کے گوشوں میں رینگتی رہی۔ مجھے سگریٹ کے چمکتے ہوئے شعلے میں جمی کا اداس چہرہ نظر آتا رہا۔ دھوئیں کے مرغولوں میں اس کی ساڑھی کا پلو ڈھلکتا نظر آتا۔ اور پھر میرے دل میں دھک دھک شروع ہو جاتی۔ یہ دھک، دھک فضلو کے پاؤں کی آواز تھی، جس نے آٹھ سو روپے کی رقم کے ساتھ میرے دل کا چین بھی لوٹ لیا تھا۔ میں یہ دھک، دھک ختم کرنا چاہتا تھا، ایک دن میں نے سوچا یہ دھک، دھک فضلو ہے۔ جب تک اسے نہ نکالا گیا۔ یہ ختم نہ ہوگی۔ اور جب میں نے جمنا دئی سے اس کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگی، کھاں جی پھجا ایسا نہیں۔ کیا خبر جمی نے کہاں منہ کالا کیا۔ آپ اس کے لئے اتنے پریشان کیوں ہے۔؟

اور میں فضلو کو نہ نکال سکا، اور یہ بھوت پاکستان آکر بھی میرے سر پر سوار ہے۔

میں نے آپ کو بتایا نا، کہ فضلو شکل وصورت کا اچھا تھا۔ سالی جمنا دئی نے بھی اسے رام کرنے کے لئے بڑے چلتر کھیلے تھے۔ وہ ایک عجیب سا آدمی تھا، جب تک میرے پاس رہا، کبھی بیمار نہیں ہوا۔

شام کے وقت عموماً سیر سپاٹے کے لئے نکل جاتا تھا۔ فلمیں دیکھنے کا اسے شوق نہ تھا۔ چائے اور سگریٹ وہ نہیں پیتا تھا۔ اور بیڑیاں پیتا نہیں پھونکتا تھا۔ ادھر بیڑی جلائی ادھر پھینک دی۔ اس کے چھ سات روپے بیڑیوں پر اٹھ جاتے۔ اس کے چہرے پر عموماً ایک پراسرار خاموشی چھائی رہتی۔ عشق ومحبت کا بھی زیادہ قائل نہ تھا، جلسے جلوسوں میں ضرور شامل ہوتا۔ اور کبھی کبھی انگریزوں کو گالیاں دے کر اپنی سیاست کا اظہار کرتا تھا۔ ملک میں کوئی بھی گڑبڑ ہو وہ کہتا

یہ سب انگریز کی شرارت ہے۔

جب بنگال میں قحط رونما ہوا تو کہنے لگا، یہ بھی انگریز کی شرارت ہے۔ اسے کیا

خبر تھی، کہ بنگال کا قحط دراصل چاول کے بزنس کا ایک کرشمہ تھا۔ اور اگر دنیا میں کبھی کبھی اس قسم کے کرشمے نہ ہوں تو دنیا کیسے ترقی کرے۔ بزنس کے معاملے میں فضلو بالکل مادھو حلوائی تھا، جو ہر مہینے اپنی کمائی جمنا دئی کی نذر کر آتا۔ اور اس کی محبت میں فلمی شعر الاپتا رہتا تھا۔

آواج دے کہاں ہے، دنیا میری جواں ہے

تعجب ہے مجھے مادھو حلوائی سے بھی کبھی رقابت کا احساس نہیں ہوا۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا

کہ اس قسم کے کئی مادھو جمنا دئی کے کوٹھے پر

جوتیاں سیدھی کرتے یا چلمیں بھرتے پھرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ محض جوتیاں سیدھی کرنے سے یا چلمیں بھرنے سے عشق کی منزلیں طے نہیں ہوا کرتیں۔ مادھو کا عشق گھاٹے اور خسارے کا سودا تھا۔ جس طرح بنگال کا قحط میرے لئے خسارے کا بزنس ثبت ہوا۔ لیکن اس کے باوجود فضلو نے جمنا دئی سے اپنے عشق کی ڈور باندھ رکھی تھی۔ اور اپنی دکان کے تھڑے پر بیٹھا فلمی شعر پڑھ پڑھ کر اس کو ہلاتا رہتا تھا۔ مادھو کی دنیا پر شاید کبھی جوانی نہیں آئی تھی، مگر جمنا دئی کے عشق نے اسے جوان کر دیا تھا۔ نجانے اس کے کانوں میں یہ بھنک کیسے پڑ گئی کہ جمنا دئی فضلو پر ریجھ گئی ہے۔ اور اسکی محبت کا دم بھرتی ہے۔ مادھو نے اسی دن سے اس کی پوجا شروع کر دی، وہ کہا کرتا تھا۔ ج سپر پیارون کی طبیعت آ جائے اس کی پوجا کرنی چاہیئے۔ اور فضلو جواب دیا کرتا تھا۔ ایسے پیاروں کی ایسی تیسی۔ مادھو جی اپنے دودھ دہی کے دھندوں سے کام رکھو۔ اور جمنا دئی کے بکھیڑوں میں نہ پڑو۔ یہ رنڈیاں کسی کی یار نہیں ہوتیں۔

اور صاحب فضلو کی یہ بات واقعی سولہ آنے درست

تھی۔ عورت کی ذات ہی بڑی بے وفا ہے۔ پھر بازار کی عورت، دور کیون

جائیں ..... یہ اپنی جمنا دئی ہی کو دیکھ لیجیئے ۔ سالی کئی سال تک میری دولت پر عیش اڑاتی رہی ۔ میری کار میں گھومتی رہی ۔ مجھے کہا کرتی تھی ،

کھاں جی مجھے تو تم سے اسک ہے ۔ تمہارے سنگ مروں گی ۔ اور کہو تو اپنا دھندا چھوڑ دوں ۔ اور اب بھی مین تمہارے سوا اور کون سا دھندا کرتی ہوں ۔

کیوں جی ؟

لیکن جب یہ پاکستان کا جھگڑا شروع ہوا تو سالی کی آنکھیں ہی بدل گئیں اور حرام زادی میری ہی جان کی دشمن بن گئی ۔ وہ تو قسمت اچھی تھا کہ میں بچ گیا ورنہ اس نے تو ٹیس پٹاس کرنے مین کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی ۔ اس کی ..... خیر آپ فضلو کی بات سنیئے ۔ سارے جھگڑے آپ کو اسی میں مل جائیں گے ۔ کیونکہ یہ فضلو سالا خود سو جھگڑوں کا ایک جھگڑا ہے ۔

ایک دن میں نے فضلو کو جوگندر سنگھ کے ساتھ دیکھا ، وہ دونوں غلام عباس کے گھر سے نکل رہے تھے ۔ وہی پیرس موٹر مکینکل والا غلام عباس ۔ مجھے جوگندر سنگھ سے نفرت تھی ۔ سالا میرے ہاں سے جا کر مزدور لیڈر بن گیا تھا ۔ بٹالہ کے کئی کا رخانہ دار اس سے نالاں تھے ۔ کیونکہ وہ کاریگروں کی اجرت کے بارے میں عموماً کوئی نہ کوئی جھگڑا کھڑا کیے رکھتا تھا ۔ مجھے خیال آیا کہ یہ سکھ کا بچہ ضرور فضلو کو بھی خراب کر دے گا ۔ شام کو جب فضلو اپنے کوارٹر میں آیا تو میں نے اس سے جوگندر سنگھ کے بارے میں دریافت کیا ۔ وہ کہنے لگا جوگندر سنگھ میرا دوست ہے ۔ پھر اس نے بتایا کہ غلام عباس کو ورکشاپ سے نکال دیا گیا ہے ۔ اور آج وہ اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں امرتسر جا رہا ہے ۔

میں نے کہا ، وہ امرتسر چھوڑ بھاڑ میں جائے تم جوگندر سنگھ سے رابطہ نہ رکھو ۔ وہ سالا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا ۔

یہ سن کر فضلو کے ماتھے پر ایک ہلکی سی شکن نمودار ہوئی ، مگر پھر حسب عادت

مسکرایا اور کہنے لگا۔

خاں صاحب جوگندر سنگھ برا آدمی نہیں وہ بہت اچھا ہے۔

جوگندر جس قسم کا آدمی تھا، وہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔ مجھے فضلو کا اس سے ملنا جلنا قطعی پسند نہ تھا۔ پھر میں نے سوچا، مجھے اس سے کیا۔ وہ جوگندر چھوڑ کالے چور سے ملے۔ میرا کام تو محنت سے کرتا ہے۔ مگر نا معلوم کیوں میرے دل میں ایک کھٹکا سا پیدا ہو گیا۔ اس کی شکل دیکھ کر میرے دل میں اکڑو کڑ سی پیدا ہونے لگتی۔ جیسے وہ کوئی غنڈہ یا چور اچکا ہو۔

لیکن اس کے بعد پھر میں نے کبھی فضلو کو جوگندر سنگھ سے ملتے نہیں دیکھا۔ مجھے کچھ اطمینان سا ہو گیا۔

ایک رات میں کمرے میں بیٹھا جمنا دئی کے ساتھ گرم گرم باتوں میں مصروف تھا..... معاف کیجئے پروگرام سے پہل مجھے گرم گرم باتوں کا بڑا چسکا ہے۔ کہ اچانک کمرے کے برآمدے سے مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اور میرے دل مین دھک دھک شروع ہو گئی۔ بدن ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں نے پلنگ سے اٹھ کر جلدی سے دروازہ کھولا۔ سامنے فضلو کھڑا تھا وہ فوراً بولا

خاں صاحب جی جنگ ختم ہو گئی۔

واقعی جنگ ختم ہو گئی تھی۔ صبح جب مین کمرے سے باہر نکلا تو فضلو نے اخبار میرے سامنے کر دیا۔

خیال تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد میرا کاروبار بھی ختم ہو جائے گا۔ لیکن خدا آپ کا بھلا کرے بلیک مارکیٹنگ ابھی ختم نہین ہوئی تھی۔ چنانچہ اپنا دھندا چلتا رہا۔ اب میں کارخانہ داروں کو کچا مال سپلائی کرنے لگا۔

جنگ کے خاتمے کے بعد گورنمنٹ نے کانگرسی لیڈر رہا کر دیئے۔ اور یہ بھی سننے میں آیا کہ ہندوستان کو آزادی ملنے والی ہے۔ اسی ہنگامے مین پاکستان کے

نعرے بھی سنے گئے ..... لے کے رہیں گے پاکستان ۔بن کے رہے گا پاکستان .....
کا شور مچ گیا۔

اور بٹالہ شریف مین بھی مسلم لیگ کے جلسے شروع ہو گئے ۔

ایک دن جمنا دئی نے مجھ سے پوچھا، کیون جی یہ پاکستان کیا ہے؟،

میں نے جواب دیا

جمنا دئی، مسلمان اپنے لئے الگ ملک چاہتے ہیں ۔وہ کہتے ہیں، ہندو الگ ہیں، مسلمان الگ، ۔۔مسلمانوں کے ملک کا نام پاکستان ہے ۔ دیکھ لینا یہ بٹالہ پاکستان میں جائے گا۔

تو میں کہاں جاؤں گی

تجھے میں اپنے پاس رکھ لوں گا

اچانک بہار اور بنگال مین فسادات کی آگ بھڑک اٹھی ۔خیال تھا کہ یہ ہنگامہ جلد ختم ہو جائے گا۔مگر فسادات کی آگ پنجاب مین بھی سلگنے لگی ۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا پنجاب جوالامکھی بن گیا۔ چاروں طرف غنڈہ گردی شروع ہوگئی ۔کرفیو آڈر لگنے لگے،اور سارا کاروبار ٹھپ ہوگیا ۔

فضلو کہتا تھا یہ انگریز کی شرارت ہے ۔ساری آگ اسی نے بھڑکائی ہے ۔تا کہ ہندو مسلم آپس ہی میں کٹ مریں ۔لیکن انگریز تو ہندوستان کو آزادی دے رہا تھا۔ ہندوں کو ہندوستان اور مسلمانوں کو پاکستان ۔۱۴،اگست ۱۹۴۷ء آزادی کا دن تھا۔ ہندوستان تقسیم ہوگیا۔ بنگال اور پنجاب تقسیم ہو گئے ۔اور ۱۷،اگست کو جب یہ خبر سنی کہ گورداس پور کا ضلع ہندوستان کے حصے میں آیا ہے ۔تو میں بھی تقسیم ہوگیا۔ میرا دماغ پاکستان میں تھا۔اور جائیداد بٹالہ میں ۔

جمنا دئی نے پوچھا کیوں جی بٹالہ ہندوستان میں چلا گیا تم کہاں جاؤ گے ۔

جمنا دئی کیا کروں، کہاں جاؤں میری ساری عمر کی کمائی یہیں ہے ۔

قتل و غارت کا زمانہ تھا، ہر طرف مار دھاڑ ہو رہی تھی۔ فضلو نے کہا، بٹالہ سے نکل کر جانا چاہیئے۔ اگر یہاں گڑ بڑ ہو گئی تو بھاگنا مشکل ہو جائے گا۔

مسلمان پاکستان کی طرف بھاگ رہے تھے بٹالہ خالی ہو رہا تھا۔ اور میں جائیداد کے چکر میں تھا۔

محلّہ انارکلی سے قریب ہی مشن ہائی سکول مسلمان پناہ گزینوں کا کیمپ تھا۔ اور مجھے تسلی تھی کہ ابھی یہاں کوئی گڑ بڑ نہیں ہو سکتی، لیکن دوسرے ہی روز ہماری کوٹھی کے قریب تین کیس ہو گئے۔ اور شام کے وقت تو سارے بٹالے میں جیسے ہلڑ سا مچ گیا تھا۔ اب میں بھی بھاگنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ مگر اسی رات ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

میں سو رہا تھا کہ شور و غل کی آواز سنائی دی، جب اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں چاروں طرف ہڑ بونگ سی مچی ہے۔ کچھ لوگ کوٹھی کا سامان لوٹ رہے تھے۔ دوسرے کمرے سے مادھو حلوائی کی آواز سنائی دے رہی تھی بس اب ختم کر دو۔

میں جلدی سے باہر کی طرف بھاگا۔ دروازے کے پاس مادھو نے مجھ پر برچھی سے وار کیا، اور ہیبت ناک آواز میں بولا خاں جی اب کہاں جاتے ہو۔

برچھی میرے کندھے پر لگی۔ لیکن وار کاری نہ تھا، میں دیوار پھلانگ گیا۔ میرا خیال تھا فضلو ٹھکانے لگ چکا ہوگا۔ کیونکہ اس کے کوارٹر کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ پھاٹک سے چند قدم پرے مجھے جوگندر سنگھ کی شکل نظر آئی جو بلم اٹھائے تین آدمیوں کے ہمراہ کوٹھی کی طرف آ رہا تھا۔

میری جان ہوا ہو گئی، کیونکہ ان غنڈوں سے بچ نکلنا مشکل تھا۔ مجھے دیکھتے ہی جوگندر بھاری آواز میں بولا خاں جی ٹھہرو۔

نہ جانے کیوں میرے قدم رک گئے۔ جوگندر میرے قریب آیا۔ میرا بدن برف کی مانند سرد تھا۔ جوگندر نے آگے بڑھ کر میرے زخمی کندھے کی طرف دیکھا۔ اور بولا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ بچ گئے ہو۔

میں نے غور سے دیکھا تو جوگندر کے ساتھ فضلو بھی تھا۔ میں حیران ششدر رہ گیا کہ یہ کیا معمہ ہے۔ جوگندر اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کوٹھی کی طرف لپکا، مگر مادھو اور اس کے ساتھ رفو چکر ہو گئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ساری سازش جمنا دئی کی ہے۔ اس کے چیلے چانٹے نہ صرف مجھے لوٹنا چاہتے تھے بلکہ جان سے مار دینا چاہتے تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ جمنا دئی نے یہ حرکت کیوں کی، وہ حرام زادی مجھ سے اسک جتاتی اور کیا کیا نخرے کرتی تھی، لیکن صاحب رنڈی کا پیار ایک بزنس ہے۔ دولت کے لئے وہ جس شخص کے گلے میں باہیں ڈالتی ہے۔ اور اپنے پیار کی چھب دکھاتی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے وہ اسی شخص کا گلا گھونٹ سکتی ہے۔ سچ کہتا ہوں اگر فضلو جوگندر کو لے کر نہ آتا، تو بچ نکلنا مشکل تھا۔ دوسرے دن جوگندر ہی کی مہربانی سے ہمیں ایک کنوائے میں جگہ مل گئی۔ اور ہم لاہور آ گئے۔

لاہور آ کر میں نے سب سے پہلے ایک کوٹھی پر قبضہ جمایا اور ایک کارخانہ بھی الاٹ کروالیا۔ کیونکہ آپ کی دعا سے اثر و رسوخ والا آدمی ہوں۔ بس چند ہی روز میں نہ صرف بٹالہ والی جائیداد کی کسر پوری ہو گی، بلکہ معاملہ اس سے بھی بڑھ گیا ہے، اور آگے بڑھ رہا ہے۔

فضلو بدستور میرے ساتھ تھا، گو اس نے کئی مرتبہ کہیں چلے جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن میں اس کا دامن چھوڑنے پر تیار نہ تھا، خیال کیجئے جس شخص نے آپ کی جان بچائی ہو۔ اسے آپ آسانی سے کب جانے دیں گے۔ وہ ایک مخلص، محنتی اور ایمان دار آدمی تھا۔ اور میں نے ارادہ کر لیا کہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گا۔ فضلو نے بھی حامی بھر لی۔

ایک دن میں اور فضلو کسی کام سے چھاؤنی جا رہے تھے۔ کہ نہر کے پل پر مجھے ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ اس نے برقعہ کا نقاب اٹھا رکھا تھا۔

جب میں نے ذرا غور سے دیکھا تو وہ جمی تھی۔ اور اس کے ساتھ پیرس موڑ میکنکل غلام عباس بیٹھا تھا

انھیں دیکھتے ہی میرے دل میں سینکڑوں وسوسے جاگ اٹھے، میں نے سوچا ہو سکتا ہے۔ مجھے شبہ ہوا ہو۔ اطمینان کے لئے میں نے فضلو سے کہا

ذرا دیکھنا کیا وہ جمی ہے۔

فضلو نے ایک نظر تانگے پر ڈالی۔ پھر نہایت اطمینان سے بولا۔ ہاں۔

اور اس کے ساتھ غلام عباس ہے۔

ہاں غلام عباس ہی ہے۔

ایک دم جیسے کسی نے میرے بدن کو جھنجھوڑ دیا۔ میری رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ یقین کیجئے اس وقت مجھے آٹھ سو روپے کا خیال نہ تھا۔ بلکہ جمی کو دیکھ کر میرے اندر نہ جانے کون سا جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔ کہ جمی میری ہے، میری زر خرید ہے۔ میری ملکیت ہے۔

میں نے غلام عباس کو آواز دینا چاہی لیکن فضلو نے منع کر دیا۔

خاں صاحب جمی آپ کو نہیں مل سکتی۔

کیوں نہیں مل سکتی

اس لئے کہ غلام عباس کے ساتھ اسکی شادی ہو چکی ہے۔

شادی ہو چکی ہے۔ یہ کیا بک رہے ہو

اور فضلو میری طرف دیکھ کر کہنے لگا

ہاں جمی اور غلام عباس کی شادی ہو چکی ہے۔ اور یہ شادی بٹالہ میں ہوئی تھی۔ میری اور جوگندر سنگھ کی مرضی سے ہوئی تھی۔

تو کیا جمی کے بھاگنے کا افسانہ جھوٹ تھا۔

ہاں جھوٹ تھا۔

اور یک لخت مجھے محسوس ہوا کہ میرے سامنے فضلو نہیں کوئی غنڈا کھڑا ہے۔ اس وقت وہ مجھے کس قدر عجیب، ہیبت ناک اور پراسرار لگا تھا۔

بے اختیار میرا جی چاہا کہ اس کا ٹینٹوا دبا دوں۔ اس کے منہ پر طمانچہ مار کر پوچھوں

فضلے اسور کے بچے! آخر تو نے میرے ساتھ یہ ڈرامہ کیوں کھیلا۔

لیکن مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ جیسے میں پھانسی کے تختے پر کھڑا تھا۔ فضلو مطمئن تھا۔

اب آپ جمی کا خیال چھوڑ دیں۔ آپ نے اسکی قیمت ضرور ادا کی تھی، مگر اب وہ آپ کی نہیں، غلام عباس کی ہے۔ دونوں میاں بیوی آج کل بڑے مزے میں ہیں۔ انھیں چھاؤنی میں مکان الاٹ ہو چکا ہے۔ اور غلام عباس ریلوے ورکشاپ میں ملازم ہو گیا ہے۔ اگر آپ نے انہیں پریشان کرنے کی کوشش کی تو آپ کے لئے اچھا نہیں ہوگا۔

اس واقعہ کے بعد فضلو اکثر میرے دماغ پر سوار رہنے لگا۔ سالا میرے لئے اچھی خاصی مصیبت بن گیا تھا۔ کئی دفعہ دل چاہا کہ اسے گھر سے نکال دوں۔ کیونکہ اسکی موجودگی میرے لئے سوہان روح تھی۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر میری رگوں میں خون کا دورہ سرد پڑ جاتا۔ لیکن میں اسے گھر سے نہ نکال سکا۔ اس کی صورت دیکھ کر بہت سی باتیں یاد آ جاتیں۔ کبھی کبھار تو وہ بالکل جوگندر سنگھ دکھائی دیتا۔ حالانکہ وہ بٹالہ میں تھا۔ لاہور سے ۷۰ میل دور ۷۰۰ میل دور۔ لیکن اس دوری کے باوجود وہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔

ایک دن فضلو خود بخود کہیں چلا گیا اور واپس نہیں آیا۔

میرے لئے یہ معمہ بھی کم تشویش ناک نہ تھا۔ کہ وہ اس طرح اچانک روپوش کیوں ہو گیا ہے۔ پہلے وہ میرے گھر میں رہ کر پریشانی کا باعث تھا۔ اب گھر سے

دور جا کر میری پریشانی کا باعث بن گیا تھا۔

مگر چند ماہ بعد آہستہ آہستہ اس کا خیال دل سے محو ہونے لگا۔ کہ میں نے اسے مزدوروں کے ایک جلوس میں دیکھا۔ وہ جھنڈا اٹھائے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کی رفتار میں جوگندر سنگھ کی سی استقامت اور شان تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ اس کا پرانا ساتھی غلام عباس تھا۔ اس نے بھی ایک جھنڈا تھام رکھا تھا، دونوں جھنڈوں پر یہ عبارت لکھی تھی۔

ہم کیا چاہتے ہیں..... روٹی اور امن

جلوس گزر گیا۔ لیکن فضلو میرے دماغ ہی میں رہ گیا۔

وہ آج بھی میرے دماغ میں ہے۔ وہ آج بھی میرے سر پر بھوت کی طرح سوار ہے۔ میں اسے کہتا ہوں

فضلے تم میرے گھر سے جا چکے ہو، خدا کے لئے میرے دماغ سے بھی چلے جاؤ۔

لیکن یہ غنڈ ابدستور میرے دماغ پر مسلط ہے جانے کا نام نہیں لیتا۔

نامرد

افسانہ نگار: عبدالرحمان صدیقی

اور اسے یوں محسوس ہوا، جیسے اس کا دل یک دم محبت سے خالی ہو گیا ہے۔ سلیم جو ایک مثالی باپ اور خاوند تھا۔ اور اسے اپنے بچے بالکل پڑوسیوں کی طرح دکھائی دینے لگے۔ جنہیں دیکھ کر اسے ہمیشہ ایک عجیب سی کراہت کا احساس ہوتا تھا۔

اپنی بیوی کو دیکھ کر اسے خوف ہوا کہ اگر کہیں اسے چھوڑنا پڑا تو۔

چھ سات سال کی معقول گھر داری کے بعد یہ ایک دم اسے کیا ہونے لگا تھا۔ بیوی کی تو خیر دوسری بات تھی، کہ اس قسم کا جذباتی مدوجزر عورت مرد کے تعلقات میں ہوتا ہی ہے۔ مگر بچوں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ معصوم، پیارے پیارے، تندرست بچے۔ دنیا جانتی تھی کہ اسے بچوں سے کتنا لگاؤ تھا۔ وہ سچ مچ ان پر جان چھڑکتا تھا۔ پھر بیٹھے بٹھائے وہ کیوں ان سے بیگانہ سا ہونے لگا تھا۔

اس کا دماغ عجیب، مضحکہ خیز اور لایعنی خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔ اس نے کئی بار سوچا، اپنی بیوی سے گڑگڑا کر کہے، کہ اے نیک بخت مجھے میری زندگی واپس کر دے۔ اپنے بچوں کی منت کرے کہ بھائی آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ تم کیوں مجھے اکیلا نہیں چھوڑ دیتے۔

کئی بار اس قسم کے الفاظ اس کے ہونٹوں تک آئے مگر منہ سے نہ نکل سکے۔ کیا اسے اس عورت سے محبت ہو گئی تھی، اس نے کئی بار غور کیا، مگر کسی خاص عورت کی تصویر اس کے سامنے نہ ابھر سکی۔ اسے کئی عورتوں کا بیک وقت خیال آیا۔ مگر کوئی بہت دیر تک اسکی توجہ کا مرکز نہ بن سکی۔ ویسے عورتیں تو سب ہی اچھی ہوتی ہیں۔

بشرطیکہ وہ نئی ہوں اور اپنے آپ کو سپرد کر دینے کو تیار ہوں۔ عورت؟ عورت آخر ہے کیا؟

شادی کے وقت اسکی عمر لگ بھگ اکتیس سال کی تھی۔ شادی سے صرف چند روز پہلے تک اس کا پکا خیال تھا کہ وہ شادی نہیں کرے گا۔ بلکہ شادی کے تو خیال ہی سے اس کا دم گھٹنے لگتا۔ مگر پھر جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ یک دم اسکی شادی ہو گئی، حالانکہ شادی میں اس کی پسند، ناپسند کا کم ہی دخل تھا۔ پھر بھی یہ کہنا غلط ہو گا کہ اس پر کسی قسم کی زیادتی یا زبردستی کی گئی تھی۔ وہ تو بھلا ہو اس امریکن لڑکی کا، جو اپنے جانے کے بعد اس کی زندگی میں تنہائی کا گہرا احساس چھوڑ گئی تھی۔ ایک ایسا خلا، جس کو پر کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ اور بغیر شادی کے کوئی دوسرا طریقہ نظر نہ آتا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اگر لویزا اس کی زندگی میں نہ آتی تو شاید وہ تمام عمر ہی بغیر شادی کے گزار دیتا۔ مگر لویزا نے اسکی زندگی میں داخل ہو کر پہلے ایک خلا کو بھرا اور پھر اس کو پہلے سے بھی زیادہ خالی چھوڑ کر رفو چکر ہو گئی۔

لویزا ایک آزاد منش امریکی لڑکی تھی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے تھی۔ اس کی پہلی شادی تھوڑے ہی عرصے بعد طلاق پر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے شادی نہیں کی۔ بلکہ ایک خبر رساں ایجنسی کی جزوی نمائیندگی حاصل کر کے اپنا بیگ اٹھایا۔ اور مواد کی تلاش میں شہر در شہر اور ملک در ملک پھرنا شروع کر دیا۔ پھر جب وہ لاہور پہنچی تو نیشنل ہارس اینڈ کیٹل شو میں اس کی ملاقات سلیم سے ہو گئی۔ ناچنے والے گھوڑوں کا تماشا دیکھتے ہوئے اس نے سوال کیا: کیا یہ صحیح ہے کہ ان گھوڑوں کو آہنی سلاخوں اور کانٹوں سے کچوک کچوکر نچایا جاتا ہے۔؟ اگر یہ بات ہے تو بے زبان جانور پر اس سے بڑا ظلم اور کیا ہے۔

سلیم جو تعارف کے بعد اسکے برابر بیٹھا تھا، بات کوٹالنے کے لئے مسکرا دیا۔

یہ ہنسی کی بات نہیں۔ میں اس بات میں واقعی بہت سنجیدہ ہوں۔

''میڈم آخر سلیم کو جواب دینا پڑا۔تم مجھے یہ بتاؤ کہ سپین کی بل فائٹ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔یہ آدمی پر ظلم ہے یا جانور پر۔

تمہیں اتنے طنز سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔میں نے کب کہا ہے، کہ سپین والے تم سے زیادہ مہذب اور رحم دل ہیں۔بہر صورت دو بڑی غلطیاں مل کر ایک چھوٹی غلطی کا جواز نہیں بن سکتیں۔

تم تو واقعی ناراض ہو گئیں۔سلیم نے کہا۔حقیقت یہ ہے کہ یہ گھوڑے خاص طور پر اسی کام کے لئے سدھائے گئے ہیں۔اور یہ سلاخیں اور کانٹے ان کے لئے وہی اہمیت رکھتے ہیں۔جیسے ان کا بقایا ساز۔

ٹھیک ہے مگر ایمان داری کی بات ہے۔مجھے تمہارا یہ تماشا بالکل پسند نہیں آیا۔کیوں، تم کیا ابھی ادھر اور بیٹھو گے یا میرے ساتھ چلنا پسند کرو گے۔میں کہیں چل کر ایک پیالی کافی پینا چاہتی ہوں۔

سلیم لویزا کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔باہر اسکی گاڑی کھڑی تھی۔دروازے کھول کر اس نے لویزا کو اندر آنے کی دعوت دی۔اور وہ دونوں چھاؤنی سے شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔لویزا بتیس، تینتیس برس کی کافی ذہین اور پڑھی لکھی عورت تھی۔وہ لگاتار سگریٹ پیتی رہتی اور مختلف موضوعات پر سوال کرتی رہتی۔چند ہی ملاقاتوں میں وہ ایک دوسرے سے بہت گھل مل گئے۔اور ان کے درمیان پرانے دوستوں کی سی بے تکلفی پیدا ہو گئی۔

ایک رات جب وہ کلب سے واپس آ رہے تھے تو لویزا

نے اچانک کہا، سلیم تم انتہائی بدتمیز معلوم ہوتے ہو۔سچ بتاؤ کیا تم سب پاکستانی ایسے ہی ہوتے ہو۔

سلیم لویزا کے اس اچانک حملے سے بھونچکا سا ہو گیا۔صرف چند منٹ پہلے تک تو لویزا اس سے انتہائی معقولیت اور اخلاص سے باتیں کر رہی تھی۔

بلکہ اپنے سگرٹ سے سلگا کر ایک سگرٹ بھی پیش کیا تھا۔ یہ بات کسی امریکی لڑکی کے لئے دوستی اور باہمی اخلاص کی انتہا کہی جاسکتی ہے۔ موٹر کی سیٹ سے وہ اسکے اتنے قریب بیٹھی تھی کہ اس کی کھلی ٹانگوں کی گرمی اسے اپنی ٹانگوں تک پہنچتی معلوم ہوتی تھی۔

آخر تمہارا مطلب کیا ہے، لویزا۔

تم اتنا بھی نہیں سمجھتے، احمق، لویزا بھنائی۔ تم یہ بتاؤ، لویزا نے پھر تیز ہو کر کہا۔ میں لڑکی ہوں یا شہتیر۔

سلیم بھی ذرا گرم ہو کر بولا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر تم بگڑ کیوں رہی ہو، اف تم بالکل ناممکن ہو مکمل طور پر ناممکل، لویزا جھلائی۔

اور پھر وہ خاموش ہو گئی۔ وہ واقعی بگڑ گئی تھی۔ سلیم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیسے منائے۔ اس کے ذہن میں کئی ناممکن قسم کے خیال آئے لیکن پھر اس نے سوچا اتنی جلدی یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا موٹر چلاتا رہا۔ لویزا کھسک کر اسکے بالکل قریب آ گئی۔ اس کے بھورے بال اب اس کے رخساروں کو چھو رہے تھے۔ تم واقعی بہت پیارے ہو۔ کیا سب پاکستانی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ لویزا نے اپنا سر اس کے شانے پر رکھتے ہوئے کہا۔

تمہیں معلوم ہے ہم کئی روز سے ڈنر برابر ساتھ کھا رہے ہیں۔ لیکن تم نے مجھے آج تک پیار نہیں کیا۔ بلکہ پیار کا ایک لفظ تک نہیں کہا۔ آخر تم کس قسم کے مرد ہو۔

سلیم کے پورے جسم میں ایک لہر دوڑ گئی اور وہ جذبات کے ریلے میں کانپنے سا لگا۔ اس نے سوچا کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ایک سفید فام عورت اسے خود محبت کی دعوت دے۔ وہ جس نے عورت سے محبت کا ایک لفظ تک نہیں سنا تھا۔ اور جس نے ہمیشہ اپنی جنسی آسودگی کی قیمت روپوں اور پیسوں میں ادا کی تھی۔ وہ ابھی اسی شش و پنج مبتلا تھا کہ لویزا نے اپنا ہاتھ اسکی گردن میں ڈال دیا۔ اور اپنا منہ اسکے منہ کی طرف

بڑھایا۔سلیم نے گاڑی سڑک کے کنارے روک لی۔

تھوڑی دیر بعد جب اس نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کی،تو لویزا نے اس سے کہا۔ڈارلنگ تم بہت ونڈرفل ہو۔سلیم جھینپ سا گیا۔

اس کے بعد وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آنے لگے۔سلیم کو لویزا پہلے ہی بہت پسند تھی۔اب تو اسے سچ مچ عشق سا ہو چلا تھا۔مگر اس کے باوجود اس کے دل میں شدید خوف تھا،کہ لویزا ایک امریکی لڑکی ہے۔اور محبت میں بے باک ہے۔ان کا رابطہ ابھی تک بوس و کنار تک محدود تھا،سلیم کو یہ ڈر کھائے جاتا تھا،کہ جب یہ حدود ختم ہوں گے اور

پردہ اٹھ جائے گا تو پتا نہیں کیا ہوگا۔وہ جسے صرف یک طرفہ محبت کا تجربہ تھا۔اسے ایک بے باک،سفید فام عورت کے تقاضوں کا علم بھی کیا ہو سکتا تھا۔

اس خیال کے ڈر سے اس نے شدت جذبات میں بھی کبھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔کہ کہیں وہ مان ہی گئی تو پھر؟۔

بوس و کنار کے عروجی لمحات میں بھی یہ خوف اسے اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا۔

ایک دن لویزا نے خود ہی اس سے کہا،تم کتنے احمق ہو سلیم۔تم عورت کو بالکل نہیں سمجھتے۔تمہیں اس کے جذبات کا بھی کچھ خیال نہیں۔تم نے اپنی زندگی کے تیس بتیس سال آخر کیسے گزارے۔

سلیم نے کہا ڈارلنگ میرا سب کچھ تمہارے لئے حاضر ہے۔

تمہارے پاس آخر ہی ہے کیا جو تم پیش کرنے لگے ہو۔لویزا نے جھلاتے ہوئے کہا،اور اس کی آغوش سے علیحدہ ہو گئی۔

.....احمق تم آخر اتنا ڈرتے کیوں ہو۔میں کوئی آدم خور ہوں جو تمہیں کھا جاؤں گی۔یا زندہ نگل جاؤں گی۔تم..... جو بقول خود اتنے تجربہ کار اور جہاں دیدہ ہو۔

سلیم نے زراہمت کر کے لویزا کو دوبارہ اپنی آغوش میں لینے کی کوشش کی۔مگر

وہ اس وقت تک گرم ہو کر ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

نہیں پھر کسی وقت..... یہ کہہ کر اس نے سگرٹ سلگالی، اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ سلیم کا مارے شرمندگی کے برا حال تھا۔

تم مشرقی بھی عجیب مخلوق ہو، لویزا نے سگرٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ یا ایک کنارے پر یا دوسرے کنارے پر۔ بالکل انتہا پسند۔ عورت کے سلسلے میں تو تمہاری انتہا پسندی عروج پر پہنچ چکی ہے۔ یا تو تم انہیں اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہو۔ یا خود غلام بن جاتے ہو۔ جنسی مساوات کا کوئی تصور کبھی تمہارے ہاں پیدا نہیں ہو سکتا۔

تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو گی سلیم نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا، مصیبت یہ ہے کہ ہم عورت کو محض عورت ہی سمجھتے ہیں۔ مرد نہیں۔

تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ لویزا نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا، مصر میں میری ملاقات ایک پاشا سے تھی۔ وہ بالکل گھوڑے کی طرح مضبوط تھا۔ اس کی جنسی توانائی اور طلب غیر معمولی تھی۔ خدا جانے اسکی کتنی ہی بیویاں اور باندیاں تھیں۔ اس کے باوجود اسکی طبیعت کبھی نہ بھرتی تھی۔ وہ پکا عیاش مگر بلا کا ذہین تھا۔ اچھا پڑھا لکھا بھی۔ لارنس ڈرل کا ذاتی دوست تھا۔ ایک تقریب میں میری اس سے ملاقات ہو گئی۔ اور پھر جلد ہی ہم کافی اچھے دوست بن گئے۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا، پاشا، یہ بتاؤ، تمہیں اپنی بیویوں میں سب سے

زیادہ کس سے محبت ہے۔

محبت یعنی چہ؟ اس نے حیرانی سے پوچھا، محبت کرنا عورت کا کام ہے۔ نہ کہ مرد کا۔ البتہ ان دنوں میں لیلیٰ کے ساتھ شب بسری کرنا پسند کروں گا۔

دیکھا تم نے، عورت نہ ہوئی اچھا خاصا نائٹ گاؤن ہو گئی۔ رات ہوئی تو اوڑھ لیا۔ اور صبح ہوئی تو اتار پھینکا۔

تو کیا تم میرا پاشا سے مقابلہ کر رہی ہو۔ سلیم نے کھسیانا ہو کر پوچھا۔

ہرگز نہیں تم تو ابھی بالکل بچے ہو۔ پاشا کی بالکل ضد، کہاں وہ اور کہاں تم۔ تم تو میرے سامنے کانپتے رہتے ہو۔ آخر کیوں باوجود کہ تم اتنی عورتوں سے مل چکے ہو۔

سلیم سوچنے لگا، اس میں شک نہیں کہ وہ لویزا سے بزدلی کی حد تک مرعوب تھا۔ جب وہ انتہائی بے تکلفی سے اپنا سکرٹ اتار کر اکھڑے جانگیے اور بلاؤز میں relex کرتی ہوتی، تو اسکی لمبی لمبی بھری بھری سڈول ٹانگوں سے دل ہی دل میں رعب کھاتا رہتا۔ اسے بار بار ایک بے ہودہ سا خیال آتا، کہ اگر کہیں لویزا اس کی پیٹھ میں اپنی ٹانگیں پھنسا کر اسے اپنی طرف کھینچے تو اس کی کمر ضرور چیخ جائے گی۔ کاش کہ لویزا عام پاکستانی لڑکی کی طرح نرم و نازک ہوتی، کہ زرا سے دباؤ سے اس کا سانس پھول جاتا، یہ بدیشی لڑکیاں آخر اتنی تگڑی تگڑی کیوں ہوتی ہیں۔ عورتیں کیا ہیں شہتیر ہیں، بلیاں ہی بلیاں اور پھر لویزا کو تو جوڈو بھی آتا تھا۔ جب وہ کابل میں تھی تو اس نے ایک روسی کو دے پٹکا تھا۔

لویزا امریکی معیار سے کوئی اتنی لمبی چوڑی لڑکی نہ تھی۔ جب کہ آج کل ایک امریکی لڑکی کا اوسط قد پانچ فٹ سات انچ ہے۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ اس سے قد میں کم از کم دو انچ چھوٹی تھی۔ ورنہ تو اس کے ساتھ چلنا بھی مشکل ہو جاتا۔

ایک موقعہ پر اس نے لویزا کو بتلایا کہ خدا کا شکر ہے تم مجھ سے قد میں دو انچ چھوٹی ہو۔ ورنہ میرا تمہارے ساتھ چلنا مشکل ہو جاتا۔ لویزا پلٹ کر بولی یہ تمہارے بھیجے میں کیسے کیسے مضحکہ خیز خیالات آتے رہتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے میرے والد میری ماں سے قد میں پورے تین انچ چھوٹی ہے۔ مگر انہیں کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا، امریکہ میں تو اکثر بیویاں اپنے شوہروں کے مقابلے میں لانبی ہوتی ہیں۔ ہوتی ہوں گی مگر یہ پاکستان ہے۔ یہاں عورت کا مرد سے لانبا ہونا قیامت کا باعث ہو سکتا ہے۔

پھر وہ دونوں قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔لویزا کا خیال تھا کہ سلیم کبھی عورت کے ساتھ آرام سے نہیں بیٹھ سکتا۔ اور مکمل بے تکلفی کے باوجود بھی عورت کی موجودگی کا احساس اسکے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔وہ عورت کو مرد کی محض ایک خواہش، ایک مخصوص طلب کی آسودگی کے ذریعے کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتا، اور نہ ہی شاید کبھی سمجھنے کے قابل ہو سکے۔لویزا کی صحبت میں وہ کبھی نارمل نہیں رہ سکتا تھا۔اور یہ بات لویزا کو بہت کھلتی تھی،

بستر پر خاموشی سے لیٹے ہوئے سلیم اچانک محبت پر اتر آتا، کچھ ایسے بھونڈے پن سے کہ لویزا کو یہ احساس ہوئے بغیر نہ رہتا کہ بجائے محبت کے وہ کسی ضروری فرض کی انجام دہی کی کوشش کر رہا ہے۔لویزا کو اس کا یہ بھونڈا پن بالکل پسند نہ تھا۔ وہ اس سے اکثر کہتی ڈارلنگ، آخر ہم یوں بھی ایک دوسرے کے پاس لیٹے رہ سکتے ہیں، بغیر کچھ کہے، بغیر ہلے جلے۔کیا تمہیں یہ پسند نہیں، آخر تمہیں جلدی کس بات کی ہے۔ یہ کوئی دفتر کا immediate فائل تو نہیں جسے تمہیں فوری طور پر نمٹانا ہے۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔آخر تمہیں جلدی کس بات کی ہے۔

یہ عورت آخر چاہتی کیا ہے۔وہ اکثر سوچتا، خود ہی کبھی اتنی گرمی دکھاتی ہے۔ اور پھر خود ہی اس قدر سرد ہو جاتی ہے۔کبھی مجھے سر دھر کہہ کر ڈانٹتی ہے۔تو کبھی نازیبا حد تک بے تابی کا طعنہ دیتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ میرے بس کی نہیں۔ورنہ عورت کی کیا مجال ہے کہ مرد کو یوں مخمصے میں پھنسائے رکھے، خطا دراصل میری ہی ہے۔ایک دن اس نے لویزا کو ہمت کر کے کہہ دیا کہ لویزا ڈارلنگ یہ حقیقت ہے کہ میں بالکل ناکارہ آدمی ہوں۔کیوں ہوں کہ نہیں

تم بالکل ٹھیک ہو۔میرے خیال میں تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔میں شاید اتنا احمق نہیں جتنا تم سمجھتی ہو۔ہاں یہ ضرور ہے میں ختم ضرور ہو چکا ہوں۔

تمہارا ذہن ضرور بیمار ہو چکا ہے۔تم محبت کو ایک میکانکی فعل سمجھتے ہو۔تم دو

طرفہ محبتوں کے تقاضوں اور ضرورتوں کو بالکل نہیں سمجھتے۔

کیوں غلط کہہ رہی ہوں،

خیر رہنے بھی دو اس قصے کو اس نے لویزا کا ہلکا سا بوسہ لیا۔ اور اسکے برابر لیٹا رہا۔

کیوں کیا سو گئے۔

نہیں سوچ رہا ہوں، کہ جس بات کو ابھی تک دباتا رہا ہوں کہہ ہی ڈالوں تو بہتر ہے۔

تو کس نے منع کیا ہے آپ کہہ کیوں نہیں ڈالتے۔ میں کوئی مصری پاشا تھوڑا ہوں، جو لاتعداد بیویوں سے جز آمنا وصدقنا کے کچھ اور نہ سن سکوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں لنکن اور جیفرسن کے دیس سے آئی ہوں۔..... مگر ہاں کہیں تم اعلان محبت تو نہیں کرنے لگے۔ مجھے اس بات سے چڑ ہے۔ دیکھو ڈارلنگ ایسی کوئی بات نہیں، مگر مجھے ڈر ہے کہ تمہارا اعلان محبت کہیں اعلان جنگ نہ بن جائے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میری عمر اب کم وبیش

چونتیس سال ہے۔ میں نے تم سے کہیں زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ اور میں کم از کم یہ سمجھتی ہوں کہ جب کوئی مرد اعلان محبت کرتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک غیر معینہ عرصے کے لئے

اس کے بستر پر اپنی جگہ مخصوص کرالے۔ میرے کہنے کا انداز بہت بھونڈا ہے۔ مگر یہ میری ایماندارانہ رائے ہے۔

لویزا ڈارلنگ، سلیم نے کچھ مضطرب ہو کر کہا۔ یہ حقیقت ہ یکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

مویزا نے بغیر جواب دیئے کروٹ بدلی۔ اور جب سلیم نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا تو اس نے انتہائی اکتاہٹ سے کہا، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ مجھے اس وقت سخت نیند آ رہی ہے۔

اور سلیم اپنے خیالات میں کھو گیا، ایک سفید فام عورت ایک چھوٹا سا نہ ہونے کے برابر بلاؤز اور انڈرویر پہنے اس کے ساتھ لیٹی تھی۔ اور کمرے میں ان کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا، کہ یہ سب خواب ہے۔ وہ ساری عمر ایک شیریں کے خواب دیکھتا رہا۔ آج شیریں اس کی بغل میں تھی۔ مگر خواب کی طرح بے حقیقت۔

لویزا کی کنپٹی کے نیچے ایک مسہ تھا۔ مسے پر دو چار لانبے لانبے بال تھے۔ وہ لویزا کا love post تھا۔ وہ انتہائی بے تکلفی سے کہتی تھی، کہ اس کا شوہر اس پر بہت فدا تھا۔ اور رات رات بھر اسے چاٹا کرتا تھا۔

مگر سلیم کو وہ مسہ زہر لگتا تھا۔ اس کا شوہر ضرور کوئی جانگلی ہوگا۔ لویزا خود بھی اسے جنگلی اور بدتمیز کہتی تھی۔ مگر ساتھ ہی جب وہ جذباتی موڈ میں ہوتی تو اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہتی۔ وہ جانتا تھا کہ ایک عورت سے محبت کیسے کی جاتی ہے۔ اس کو کس طرح مکمل تسکین اور تسلی دی جا سکتی ہے۔ بس ایک مرد تھا ٹارزن کی طرح۔ لویزا کہتی ہو سکتا ہے وہ اس کی مردانگی کے آگے اس کی دوسری بدتمیزیوں سے درگزر کر جاتی، مگر ساری آفت یہ تھی کہ اس کی جنسی بھوک بالکل ناقابل تشفی تھی۔ وہ ہر بازاری کتیا کے آگے دم ہلا ہلا کر زبان باہر نکالے بھاگا پھرتا تھا۔ بس اس بات سے ان دونوں کی سختی سے ان بن ہو گئی۔ ایک رات وہ بہت دیر سے گھر آیا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت تھا۔ لویزا نے اس سے وضاحت چاہی۔ اس نے جھٹ سے اس کے منہ پر ایک چانٹا رسید کیا۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ چنانچہ دوسرے ہی دن طلاق کے لئے قانونی کاروائی کا آغاز کر دیا گیا۔ اور چند ہی روز میں آزادی حاصل کر لی۔

اس میں شک نہیں کہ اس مرد کے چھن جانے کا لویزا کو اب بھی بہت صدمہ تھا۔ رقابت کا ایک زہر میں بجھا تیر جیسے سلیم کے کلیجے میں پیوست ہو گیا۔

کتیا، اس نے اپنے دل میں کہا، کتیا، کتیا، اس کا ذہن کتیا کی تکرار سے گونجنے

لگا۔ اور لویزا اس کے پاس کروٹ لیے پڑی تھی۔ اس کے بازو انتہائی اجلے اور شفاف تھے۔ اور اس کی رانیں اس کی ٹانگوں سے چھو رہی تھیں۔ اور ان میں جھلکتی ہوئی سفید کھال دعوت نظارہ دے رہی تھی۔

سلیم نے سوچا یہ امریکی عورتیں کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر طلاق کا دعویٰ دائر کر دیتی ہیں۔ دل کھول کر معاشقہ کرتی ہیں۔ اور پھر کہتی ہیں۔ یہ تو محض دوستی ہے۔ مرد کو نہ جانے کیا سمجھتی ہیں۔ شاید ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب۔ دبایا پیسٹ نکالا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

مگر لویزا سے تو اس کی محبت تھی۔ کیا واقعی محبت تھی۔ یا محض واہمہ۔ کیا وہ کسی سے محبت کر سکتا ہے۔ وہ جس نے محبت کی قیمت ہمیشہ روپے پیسوں میں ادا کی ہے۔ وہ..... جو جنسی آسودگی کو محبت سمجھتا رہا۔

لویزا اس کی پریشانی کو شاید بھانپ چکی تھی، اور اس نے ایک بار اس سے کہا بھی تھا۔ سلیم ڈارلنگ، تم کبھی کسی عورت کو خوش نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے نہیں کہ تم بے کار ہو چکے ہو۔ اس لئے کہ تم نہیں جانتے، عورت سے محبت آخر کس طرح کی جاتی ہے۔ تم تو نرے کھلاڑی ہو، رنڈی باز۔ مشین میں سکہ ڈال کر قسمت کا ٹکٹ نکالنا چاہتے ہو۔ مگر محنت اور قربانی سے اپنی قسمت بنانا نہیں چاہتے۔ تم تو بس اپنی ذات کو مرکز حیات سمجھتے ہو۔ اپنی خوشی کو خوشی سمجھتے ہو۔ دوسروں کو خوش کرنا تمہارا کام نہیں۔ لینا جانتے ہو، دینا نہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ عورت مرد کی خوشی کا راز صرف کھلے لین دین میں ہے۔ اگر تم صرف کے سکتے ہو اور دے نہیں سکتے، تو جاؤ، چاروں طرف رنڈی خانے کھلے ہوئے ہیں۔ جیب میں پیسے ڈالو، اور جتنی چاہے آسودگی خرید لو۔

مگر عورت کی خوشی صرف پیسوں سے نہیں خریدی جا سکتی۔ تمہاری سب سے بڑی کمزوری تمہاری اول درجے کی یک طرفی ہے۔ تم صرف اپنے طرف دار ہو۔ تمہیں معلوم ہی نہیں کہ شریک کو کس طرح خوش کیا جا سکتا ہے۔ میرے لئے

تمہارے جو جذبات ہیں ۔ میں ان کی قدر کرتی ہوں ۔لیکن ان جذبات کی تہہ میں محبت سے زیادہ تمہاری اپنی انا کارفرما ہے۔تم صحیح معنوں میں مجھ سے محبت نہیں کرتے اور شاید نہ کبھی کرسکو۔تم مجھے پسند ضرور ہو۔مگر ایک دوست کی طرح۔تم میرے lover کبھی نہیں بن سکتے ۔ میں ایک سفید فام امریکی عورت ہوں۔تم کو لمبس بن کر اس میں داخل ہونا چاہتے ہو۔تا کہ تم اپنے دوستوں میں سر اٹھا کر یہ کہہ سکو کہ تم نے امریکہ دریافت کرلیا ہے۔

سلیم نے سوچا یہ عورت ت و مجھے پاگل کر کے ہی چھوڑے گی۔آخر یہ اس کی زندگی میں آئی ہی کیوں، باؤلی کہیں کی۔اس کا بس چلے تو سے کتوں کے آگے ڈلوادے۔کتیا کہیں کی۔ بڑی آئی وہاں سے فلسفہ بگھارنے والی۔ مجھے خواہ مخواہ احساس کمتری میں مبتلا کررہی ہے۔ مجھے رنڈی باز کہتی ہے تو کیا رنڈی عورت نہیں ہوتی۔؟ ۔کیا رضیہ عورت نہ تھی ۔وہ تو مجھ سے بہت خوش تھی۔اب اگر کبھی کچھ گڑبڑ ہو جائے ،ذرا سا آگا پیچھا ہو جائے ۔گھنٹہ بجائے ٹھیک وقت پر چلنے کے دو منٹ آگے ہو جائے ،تو ایسا کیا غضب ہوگیا؟ ۔مگر لویزا کی بس ایک ہی منطق تھی کہ وہ محبت کر ہی نہیں سکتا۔

سوال یہ تھا کہ کیا اسے واقعی لویزا سے محبت تھی ،مگر اس سے پہلے کہ اسے اپنے سوال کا قطعی اور تسلی بخش جواب ملتا ،لویزا نے لاہور چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔وہ ادھر پہلے ہی اپنے پروگرام سے ایک مہینہ زیادہ ٹھہر چکی تھی ،اور اب اس کو دلی جانا تھا۔ سلیم نے کہا ،مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔تم مجھے چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہو۔مگر لویزا نے خاصے روکھے پن سے جواب دیا ’’سلیم تم تو بالکل نابالغ لونڈوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ میں تو چلتا پانی ہوں، آج وہاں کل یہاں۔شہر شہر قریہ قریہ اڑنے والی چڑیا۔ مجھے تم سے مل کر دلی خوشی ہوئی ہے۔تم ایشیا میں میرے بہترین دوست ہو،مگر تم لور

lover کبھی نہیں بن سکتے۔ اگر تم برا نہ مانو تو میں تم سے ایک بات کہوں، کہ تمہاری پوری شخصیت دو متضاد مگر ایک سی طاقت والی کشتیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ تم انتہائی مہذب، سنجیدہ، شریف اور مہربان آدمی ہو، مگر دراصل تم انتہائی حساس، مریضانہ حد تک حساس، جورو پسند اور غصیل آدمی ہو۔ جھلاہٹ اور غصہ تمہاری رگ رگ میں بھرا ہوا ہے۔ اتنا کہ اگر تمہارا بس چلے تو تم روم میں آگ لگا کر نیرو کی طرح رباب بجانا شروع کر دو۔ مگر چونکہ تم ایک مہذب اور شریف آدمی ہو، دوسرے لفظوں میں کمزور رہو۔ اس لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ اور بے بس ہو کر رہ جاتے ہو۔ پھر تمہیں اپنی بے بسی پر غصہ آنے لگتا ہے۔ اور تم دانت پیس کر رہ جاتے ہو۔ تمہارا غصہ ایک مہذب اور کمزور آدمی کا غصہ ہے۔ اینگری ینگ مین اور بیٹنکس کا غصہ جو اپنے اور دنیا کے حال زار پر دانت پیس کر رہ جاتے ہیں۔ اور جب کچھ نہیں کر سکتے تو اپنے زیر زمین ٹھکانوں پر بیٹھ کر جرم کرتے ہیں۔ چرس پیتے ہیں۔ اور بغیر کبھی نہائے جنسی اختلاط میں اپنے کو گم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ دراصل ان کا غصہ نہیں اعتراف شکست ہے۔ یہ نامرداور بزدلی کی جھلاہٹ ہے۔ کیوں ہے کہ نہیں my poor darling تم کتنے اچھے ہو، کاش تم اپنے آپ کو اتنا کمزور اور خود پسند نہ بنا لیتے۔

کمزور، کمزور، نامرد، سلیم اپنی مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔

اور پھر لویزا چلی گئی۔ اور جاتے ہوئے اس نے سلیم سے صرف مصافحہ کیا، اسے ایک بوسہ تک نہیں لینے دیا۔ ایرپورٹ پر جہاز کی طرف جاتے ہوئے اس نے کہا

تم مجھے واقعی بہت پسند ہو، مگر میں خود کو جذبات میں الجھانا نہیں چاہتی۔ میں ایک آزاد اور خود مختار فرد ہوں، اور اپنی ذمہ داری خود ہی اٹھانا چاہتی ہوں۔ اچھا ڈارلنگ خدا حافظ میں تمہیں امریکہ جا کر ایک گلابی، ٹی، شرٹ بھیجوں گی۔ یہ تحفہ امریکی لڑکیاں عموماً اپنے بہترین دوستوں کو بھیجا کرتی ہیں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔

کتیا، سلیم بڑبڑایا۔ اس وقت اس کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی، اس کے دل میں بجائے افسوس کے غیض اور غصہ تھا۔ اس نے سوچا، اگر لویزا کا جہاز کریش ہو جائے تو کتنا اچھا ہے۔ دور جہاز کی کھڑکی سے اس نے لویزا کو رومال ہلاتے دیکھا، مگر اس نے کوئی نوٹس نہ لیا۔

کتیا کہیں کی، وہ بڑبڑایا۔ اس وقت اس کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ اگر کہیں میری اس سے شادی ہو جاتی تو کیا ہوتا۔ یہ تو واقعی میری زندگی تباہ کر دیتی۔ دیوانی عورت، خدا نے اس کو پیدا ہی شاید اسی واسطے کیا ہے۔ کہ وہ شہر شہر کی خاک چھانتی رہے۔ بیوی اور ماں کا مقدس فریضہ ادا کرنے کے لئے تو وہ بنی ہی نہیں۔

ایر پورٹ سے سلیم سیدھا کلب پہنچا، اور بیر کا آرڈر دیا۔ let me celebrate good Niddance، اس نے گلاس اٹھاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دل میں لویزا کے خلاف اتنا جذبہ پیدا کر دے، کہ اس کی جدائی کا غم باقی نہ رہے۔ مگر لویزا کی یاد اس کے ذہن پر ایک مہیب سائے کی طرح منڈلاتی رہی۔ بیر کے تلخ گھونٹوں نے اس کی یاد کی شدت کو کم کرنے کی بجائے اسے اور بھی تلخ اور تیز کر دیا۔

لویزا، ، لویزا..... لویزا کون تھی؟ ایک از خود رفتہ، حواس باختہ، پاگل، چونتیس سالہ امریکی عورت وہ شکاگو سے آئی تھی؟ ۔ شکاگو جرائم کا مشہور مرکز ہے۔ شکاگو ..... جہاں دن دہاڑے بھرے بازار میں قتل ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ وہاں کے سنڈیکیٹ کی رکن ہو۔ مافیہ کی کوئی کارکن ہو یا ماتا ہری کی طرح کوئی خوفناک جاسوس ہو۔ مگر اسے لاہور آ کر آخر سلیم سے ملنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

رنڈی، کتیا، آوارہ، بدمعاش عورت!!! ۔ آخر اس میں رکھا ہی کیا تھا۔ سارت اور کامیو کی دو کتابیں پڑھ کر۔ دو، چار، چھ ملک دیکھ کر بکواس کرنا ضرور سیکھ لیا تھا، اس

نے کتیا، اس کو تو ہر وقت مرد چاہیئے تھا۔ جو عورت عربوں اور حبشیوں کے ساتھ سو چکی ہو۔

لویزا چھنال، حرام زادی!!

اور پھر اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگتا۔ وہ واقعتاً کتنا ذلیل اور کینہ پرور تھا۔ لویزا ٹھیک ہی تو کہتی تھی۔ لویزا، لویزا ڈارلنگ۔ لویزا جو پہلی عورت تھی، جس نے اس سے اپنی کوئی قیمت نہ مانگی تھی۔

لویزا جس نے پہلی بار اس کی انانیت کو للکارا تھا۔

لویزا جس کو وہ اپنا بنانا چاہتا تھا۔

لویزا اب دلی کی Y میں بیٹھی کسی ہندوستانی صحافی یا دانشور سے وہاں کی سیاست پر گفتگو کر رہی ہوگی۔ اور مشرقی لوگوں اور ان کی زندگی کے متعلق اپنے مخصوص خیالات کا اظہار کر رہی ہوگی۔ آخر تم لوگ اتنے انتہا پسند کیوں ہو۔

لویزا کی جدائی کے بعد سلیم کی زندگی کا گویا ایک پورا باب ختم ہو گیا۔ وہ جو تنہائی اور آزادی کا دل دادہ تھا۔ اور عورت خرید کر اس کے بدن پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑھتا تھا۔ اب تنہائی۔ آزادی اور زر خرید عورت سے اس طرح خوف کھانے لگا، جس طرح سگ گزیدہ پانی سے خوف کھانے لگا ہو۔ اس کا احساس تنہائی گہرا ہو کر ایک اندھے کنویں کی طرح بن گیا۔ جس میں اسے مشکیں کس کر الٹا لٹکا دیا گیا ہو۔ اس کا دم گھٹنے لگا، اور سورج کی ایک شعاع اور ہوا کے ایک تازہ جھونکے کے لئے اس کا جی ترسنے لگا۔

لویزا ہر وقت اس کے دل و دماغ پر سوار تھی۔ پتا نہیں یہ محبت تھی یا جذبہ انتقام۔ اور پھر لویزا کی یاد اس کے لئے عظیم اور اتھاہ تنہائی کا احساس بن گئی۔ اس کی یاد کے ساتھ ساتھ اس کو اپنی تنہائی کا احساس شروع ہو جاتا۔ اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ ایک حاملہ عورت ہے، اکیلی، تنہا، مکافات عمل سے بھری ہوئی۔ اور اپنے کیے کی

پوری طرح ذمہ دار۔ وہ کیا کرے؟۔ ظاہر ہے اسے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ وہ لویزا کو دکھا دے گا۔ کہ وہ ایک صحت مند مرد کی طرح

محبت کر سکتا ہے۔ وہ عورت کو ہر وہ چیز دے سکتا ہے جس کی وہ تمنا کرے۔ وہ ایک مثالی شوہر اور باپ بن کر دکھا دے گا۔

اور پھر سلیم نے شادی کر لی۔ ایک ایسی لڑکی سے جسے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جس کا انتخاب اس نے مکمل طور پر اپنے بزرگوں پر چھوڑ دیا تھا۔ ازداوجی زندگی کے نئے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اس کو ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔ اور شادی کے دوسرے ہی دن اسے یوں لگا۔ جیسے وہ اس اجنبی لڑکی، جو اب اس کی بیوی بن چکی تھی، اور شاید اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھی، کے ساتھ ایک عمر گزار چکا تھا۔

شمیم کی حیثیت میں اسے کوئی نرالی یا غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ شادی سے پہلے بیوی کے متعلق جو اس کا تصور تھا، وہ حقیقت سے کہیں دور تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ بیوی شاید کوئی تیسری جنس ہوتی ہے۔ اور عورت ہونے کے باوجود عورت کی ایک مخصوص شکل ہوتی ہے۔ جس کا عام عورت سے بہت ہی کم تعلق ہوتا ہے۔ لہٰذا، جہاں عورت کے تصور میں اس کے لئے ایک قسم کی خوشی اور سرمستی تھی۔ وہاں بیوی کا خیال باندھتے ہی اس کا دم گھبرانے لگتا تھا۔

مگر شمیم تو بالکل عام عورتوں کی طرح ایک عورت تھی۔ سیدھی سادی، گھریلو لڑکی، روائیتی شرم وحیا میں ڈوبی ہوئی۔ مگر کافی سنجیدہ اور سمجھ دار۔

جب پہلی بار اس نے شمیم کا چہرہ دیکھا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے؟۔ شمیم کا چہرہ سپاٹ نہ سہی مگر وہ کسی خاص کشش کا حامل نہ تھا۔ اس کے نقوش الگ، الگ، کافی کھڑے کھڑے اور اچھی ساخت کے تھے۔ مگر ان کا مجموعی تصور زیادہ پر کشش نہ تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکی گردن کے مقابلے میں اس کا چہرہ کافی چھوٹا

تھا۔مگر آخر لویزا کون سی کوہ قاف کی پری تھی۔

پھر وہی لویزا، اس نے اندر ہی اندر جھلا کر کہا، لاحول ولا، لویزا گئی جہنم میں۔ اب اس سے تعلق ہی کیا رہ گیا تھا۔پھر اس نے دائیں ہاتھ کی انگلی سے شمیم کے چہرے کو ذرا اونچا کیا۔اور اس سے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔پہچانتی ہو مجھ کو؟

مگر شمیم کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں برابر جھکی رہیں اور وہ کچھ نہ بولی۔

بھئی کچھ تو بولو۔لویزا کا خیال اسے برابر آ رہا تھا وہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ شمیم کے لئے بالکل اجنبی مرد ہے۔اور شمیم لویزا نہیں جو اس سے یک دم کھل جائے۔اور ہر موضوع پر فرفر باتیں کرنے لگ جائے۔

دیکھو میں کون ہوں، میرے سر پر سینگ تو نہیں۔اور پھر وہ خود ہی کھسیانہ سا ہو کر ہنسنے لگا۔شمیم اسی طرح بت بنی بیٹھی رہی، پھر سلیم کو آپ ہی آپ غصہ آنے لگا۔ اچھا بھئی تم جانو اپنے کوت ونیند آنے لگی ہے۔سخت، اچھا شب بخیر۔اس نے ایک لمبی سی جمائی لی اور بستر پر دراز ہو کر سو گیا۔

پتا نہیں وہ کتنی دیر سوتا رہا، مگر جب اسکی آنکھ کھلی تو شمیم ابھی تک گھونگھٹ نکالے اس کے برابر بیٹھی تھی۔

ارے لاحول ولا! تم ابھی تک اس طرح بیٹھی کیا کر رہی ہو، سوئی کیوں نہیں ابھی تک؟

جواب کا انتظار کیے بغیر سلیم نے اس کو کھینچ کر اپنے ساتھ لٹالیا۔اور صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہر لحاظ سے شمیم کا میاں بن چکا تھا۔شمیم پہلے ہی غسل خانے جا چکی تھی۔اور باہر کھڑا کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

سلیم اپنی بیوی سے محبت کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔شادی کے کچھ ہی عرصے بعد وہ اس سے کافی گھل مل گئی۔اور ابھی ان کی سال گرہ میں پورے تین ماہ باقی تھے کہ ان کے ہاں ایک بہت پیارا سا لڑکا پیدا ہوا۔پہلے بچے کے دو سال بعد ان کے ہاں

ایک اور لڑکا پیدا ہوا۔ اور ان کی زندگی مزے میں گزرنے لگی۔

اے کاش اس وقت لویزا ادھر موجود ہوتی اور دیکھ سکتی، کہ شمیم اور سلیم اپنے دو پیارے پیارے بچوں کے ساتھ کیسی مزے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ سلیم واقعی ایک مثالی شوہر بن چکا تھا، کون کہہ سکتا ہے کہ اب وہ صرف لے سکتا ہے۔ دے نہیں سکتا۔ دنیا کی کون سی چیز تھی جو اس نے اپنے بیوی بچوں کو نہ دے رکھی تھی۔

مگر ایک دن بیٹھے بیٹھے وہ سوچنے لگا۔ کیا واقعی وہ شمیم سے محبت کرتا ہے۔ اور کیا واقعی اسے اپنے بچوں سے پیار ہے۔ جتنا کہ دنیا سمجھتی ہے۔ لق دق صحرا میں یہ دونوں سوال اس کے گرد اگردنا چنے لگے۔

Iqbal Cyber Library All rights reserved ©2002-2006

سب سے بڑی کمزوری

افسانہ نگار: عمر عادل مارہروی

۳ اگست

تسلیم!

مجھے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ آپ کا لڑکا ارشد طالب علم جماعت دہم حصہ ب'' پڑھائی کے دوران اسکول سے بھاگ کر سینما دیکھتا ہوا پکڑا گیا ہے۔

آپ سے گزارش ہے کہ آپ فدوی کو تنبیہ کریں۔ اگر وہ اپنی حرکات سے باز نہ آیا تو ہم اسے کوئی رعایت دینے سے مجبور ہوں گے۔ اور اسکول سے اس کا نام خارج کرتے ہوئے ہمیں افسوس ہو گا۔..... امید ہے آپ اس بارے میں توجہ فرمائیں گے

مخلص

پرنسپل، ایم سی۔ ہائی سکول پورن نگر

۸، اگست

محترم ماسٹر صاحب۔ تسلیم!

یہ خط آپ کو اپنے چھوٹے بھائی ارشد کے سلسلے میں لکھ رہی ہوں۔ آپ اس کے کلاس ٹیچر ہیں۔ آپ اسے اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ آپ کے اسکول میں اس کا آخری سال ہے، اگر آپ دیگر مہربانیوں کے علاوہ اس سال اس کی فیس معاف کروادیں گے، تو یہ آپ کا احسان ہوگا۔ جس کے لئے میں مشکور رہوں گی۔

مخلص

راشدہ بانو

محترمہ۔تسلیم!

اپنے ہونہار طالب علم ارشد کے ہاتھ آپ کا پرچہ ملا۔یادفرمائی کا بے حد مشکور ہوں۔میں ارشد کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔آپ اس کی طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔میں اس کی فیس معاف کروانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا۔امید ہے آپ کسی اور خدمت کے لئے بھی یادفرمائیں گی۔

آپ کی خدمت میرے لئے باعث مسرت ہوگی۔

مخلص

ماسٹر قمر احمد، ایم، اے

۱۴، اگست

محترم ماسٹر صاحب تسلیم!

آپ کے خلوص اور ہم دردی کی میں بے حد مشکور رہوں، آپ ارشد کو اپنا بھائی ہی سمجھئے۔کیونکہ آپ کی زیر نگرانی یہ سنبھل جائے گا۔اور پھر اسکا کوئی بڑا بھائی نہیں۔ابا جان ہیں تو وہ سارا دن دفتر کے کاموں میں الجھے رہتے ہیں۔اور میں عورت ذات ہوں۔صرف گھر پر ہی نگرانی کرسکتی ہوں۔گھر میں کوئی دوسرا مرد نہیں، جو باہر بھی اس کی دیکھ بھال کرسکے۔اس لئے آپ سے درخواست ہے، کہ آپ اسکول میں اس کی دیکھ بھال رکھیں گے۔آپ کے پرنسپل صاحب اس سے کچھ ناراض ہوگئے ہیں۔

آپ کو زحمت تو ہوگی، مگر میں آپ کی بے حد مشکور رہوں گی۔اگر آپ کی کوشش اور سفارش سے پرنسپل صاحب اسے معاف کردیں گے۔میرے لائق کوئی خدمت ہو تو یادفرمائیں۔

مخلص

راشدہ بانو

۱۴۔ اگست کرم فرما راشدہ

آپ کا پرچہ ملا۔ آپ کا کوئی کام کرنے میں مجھے زحمت ہوگی۔ یہ صرف آپ کی غلط فہمی ہے۔ ورنہ خاکسار کو تو آپ کا کام کرنے میں مسرت ہوگی

آئندہ ایسے خیال سے پرہیز کیجئے۔ شاید اس سے پیشتر بھی عرض کر چکا ہوں، کہ میں ارشد کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔ ایک بار پھر کہتا ہوں، کہ ارشد میرے بھائی کی جگہ ہے۔ آپ اس کی طرف سے بےفکر رہیئے۔ ارشد کی طرح میں بھی اپنے ماں باپ کا ایک ہی لڑکا ہوں، اکلوتی اولاد۔ میرے باپ نے مجھے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ مگر ایسے وقت میں جب کہ میں زندگی کی ایک نئی راہ پر چلنے کو تیار ہوں، تو انہوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک ماں ہے۔ آپ کی طرح وہ بھی میری صرف گھر پر ہی دیکھ بھال کرتی تھی۔ مگر گھر سے باہر کی دنیا میں بھی میرے قدم نہیں ڈگمگائے۔ شاید آپ نے سنا ہوگا، جس کا کوئی نہیں ہوتا، اس کا خدا ہوتا ہے۔ پھر آپ ارشد کی طرف سے اتنی فکرمند کیوں رہتی ہیں۔

خدا ہے اور خدا کے بعد میں۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں نے پرنسپل کو کہہ سن کر سب کچھ معاف کرا دیا ہے۔ میں اسکول میں اور اسکول سے باہر بھی ہر ممکن اس کی نگرانی رکھتا ہوں۔ اور پھر وہ بھی تو ہونہار ہے۔ جب آپ نے ارشد کو میرا بھائی سمجھ لیا ہے۔ تو آپ ہر کام کے لئے مجھے یاد فرما سکتی ہیں۔ اس میں زحمت کا خیال آپ کے لئے موزوں نہیں۔ دیگر کا رلائقہ سے یاد فرمائیں۔ منتظر رہوں گا۔

آپ کا مخلص

قمر۔ احمد، ایم، اے

۱۶۔ اگست۔

محترم ماسٹر قمر احمد صاحب۔ آداب

آپ کا پر خلوص پرچہ ملا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ جیسا مخلص انسان ڈھونڈے

سے نہیں ملے گا۔ آپ نے ارشد کے ساتھ جو ہمدردیاں فرمائی ہیں۔ اس کے لئے میں آپ کی بےحد مشکور ہوں گی۔ آپ کے حالات سے تھوڑی سی واقفیت ہونے پر مجھے آپ سے بے انتہا ہم دردی ہوگئی ہے۔ خدا سے دعا ہے، کہ جس کامیابی کے ساتھ آپ نے زندگی کی منزلیں طے کی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ آئندہ آگے بڑھیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو یاد فرمایئے گا۔ آپ ہمیشہ مجھے مخلص پائیں گے۔

ناچیز

راشدہ بانو

۱۶ اگست

محترمہ راشدہ صاحبہ۔ خلوص۔

آپ کا خط ملا، پڑھ کر بےحد مسرت ہوئی۔ آپ ک وبھی مجھ سے ہم دردی ہوئی ہے۔ پڑھ کر مجھے بیت خوشی ہوئی، حقیقت تو یہ ہے کہ آپ جیسی مخلص خاتون آج تک میں نے نہیں دیکھی، آپ نے صرف ذرا سی واقفیت پر مجھ سے ہمدردی فرمائی ہے۔ اگر آپ میری زندگی کے حالات جاننا چاہتی ہیں۔ تو میرا ایک ناول پڑھیئے جو آج سے پانچ سال پہلے لکھا تھا، اس وقت میرے حالات کیا تھے، اور کیا گزر چکے تھے۔ یہ سب آپ کو میرے ناول کے مسودے میں ملے گا۔ آپ مجھے لکھیے، میں آپ کو مسودہ ضرور بھیج دوں گا۔

امید ہے آپ مجھے بھولیں گی نہیں۔ آپ نے مجھ سے ہم دردی فرمائی۔ ایسی ہم دردی جس کا میں ایک عرصے سے یا یوں سمجھیے کہ زندگی بھر سے بھوکا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ہم دردی ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور بڑھتی ہی رہے گی۔ آپ کے پاس وقت تو ہوگا ہی، میرا غیر مطبوعہ ناول ضرور منگوایئے۔ میں بڑی خوشی سے آپ کو بھیج دوں گا۔ آئندہ آپ مجھے خط لفافے میں بند کر کے بھیجیئے گا۔ جواب کا بےچینی سے منتظر

رہوں گا۔ مجھے امید ہے، آپ کاہلی نہ کریں گی۔

آپ کا قمر احمد، ایم، اے۔

۲۰۔ اگست

محترم قمر احمد صاحب۔ آداب

خط ملا تھا۔ مجھے افسوس ہے، کہ جواب میں دیر سے دے رہی ہوں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ گھر میں اگر کوئی کام کرنے والا ہے۔ تو وہ میں ہی ہوں۔ امی جان تو اب کام کرنے کے قابل نہیں۔ کھانا پکانا، گھر کی صفائی کرنا۔ اور پھر اگر وقت ملا (جو بہت مشکل سے ملتا ہے) تو سلائی وغیرہ کرنا۔ امید ہے اب آپ اس جواب کی تاخیر کی وجہ سمجھ گئے ہوں گے۔ ارشد کی فیس کا کیا ہو رہا ہے۔ امید ہے آپ بخریت سے ہوں گے۔

ناچیز

راشدہ بانو

۲۰ اگست

راشدہ بانو خلوص اور محبت

آج کافی انتظار کے بعد تمہارا خط ملا۔ واقعی تم بہت مصروف رہتی ہو۔ آئندہ مین اپنے جواب میں تاخیر کا شکوہ نہ کروں گا۔ ارشد میاں کی فیس کے لئے میں نے بہت زور لگا رکھا ہے، فارم پر شہر کے دو با اثر حضرات کی سفارش کرا دی ہے۔ اور مینجر صاحب سے زبانی بھی کہہ دیا ہے۔ تم مطمئن رہو فیس ضرور معاف ہو گی۔ تم حیران ہو گی کہ آج میں تمہیں تم سے مخاطب کر رہا ہوں۔ نہ جانے کیوں؟ یہ میں خود بھی نہیں سمجھ رہا۔ جانے کون سا جذبہ ہے جو مجھے ان تکلیف دہ الفاظ سے دور لے جا رہا ہے۔

اور تم سے قریب۔۔۔۔۔ راشدہ میری کسی بات کا برا نہ ماننا۔۔۔۔۔ لو یہ مسودہ حاضر

ہے۔کئی دن سے لا کر رکھ دیا تھا۔اسے پڑھو اور مجھے سمجھو۔.....میں نے تم سے کہا تھا کہ خط لفافے میں بند بھیجو۔.....اور لفافے بھیج رہا ہوں۔ایک حقیر سا تحفہ امید ہے، قبول کرو گی۔.....راشدہ جو کچھ سمجھ کر میں نے تمہیں لکھا ہے۔کیا تم بھی یہی سمجھ کر مجھے ایسے ہی لکھو گی۔.....اگر کوئی بات کسر شان ہو تو معاف کر دینا۔جواب اپنی پہلی فرصت میں دینا۔

تمہارا

قمر احمد، ایم۔اے

۳۰ اگست

محترم قمر صاحب، آداب

مسودہ مل گیا۔جتنی آپ نے اسے دینے میں جلدی کی ہے اتنی مانگنے میں نہ کیجئے گا۔کیونکہ یہ قریب پانچ سو صفحات کا ہے۔میں اسے تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھوں گی۔لفافے بھی مل گئے ہیں۔ان کی ضرورت تو نہیں تھی، مگر جب آپ تحفہ کہہ کر دے رہے ہیں۔تو میں قبول کرتی ہوں۔شکریہ۔فیس کی طرف سے مطمئن ہوں۔جب آپ کوشش کر رہے ہیں

تو پھر فکر کیسی۔آپ سے ایک عرض ہے۔آپ جانتے ہوں گے۔کہ ارشد پڑھائی میں بہت کم زور ہے۔اگر آپ اسے کچھ وقت دے دیا کریں، تو اچھا ہو۔یہ آپ کے گھر آ کر ہی پڑھ جایا کرے گا۔جو کچھ سمجھ کر آپ نے مجھے لکھا ہے وہی کچھ آپ کو میں بھی سمجھوں گی۔امید ہے آپ ارشد کے لئے کچھ وقت ضرور نکال لیں گے۔مگر ایک شرط ہے کہ آپ اپنے وقت کا معاوضہ لے لیں، کیا آپ کو یہ شرط منظور ہے۔

ناچیز۔

۲۔ستمبر

راشدہ محبت بھرا سلام۔

ابھی ابھی تمہارا خط ملا، پڑھ کر خوش بھی ہوا۔ اور دکھی بھی۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم مجھ سے معاوضے کی بات کرو گی۔ جب میں نے تمہیں اپنا سمجھ لیا ہے، تو یہ بات تمہارے لئے زیبا نہیں۔ ارشد کو میں پڑھنا چاہتا ہی تھا۔ میرا خود ہی پہلے سے ہی یہ خیال تھا۔ میں نے ارشد سے کہہ دیا ہے۔ وہ شام کو پڑھنے آیا کرے گا۔ تم اس کے ہاتھ خط و کتابت کرنا۔ راشدہ تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔ نہ جانے کیوں میں ہر وقت تمہارے تصور میں کھویا رہتا ہوں۔ اگر اسے محبت کہتے ہیں۔ تو مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ میرے دل کی گہرائیوں میں ایک پر کیف یاد بن کر سما گئی ہو۔

میری زندگی کی ویرانیوں اور سنسان پن میں تم بہار بن کر چھا گئی ہو۔ کیا میں یقین کروں کہ یہ بہار امر ہے۔ میں نے تمہیں اپنا مقصد حیات سمجھ لیا ہے۔ کل ارشد کی فیس کا معلوم ہو جائے گا۔ ناول کتنا پڑھ لیا ہے۔ جواب کا بے چینی سے منتظر ہوں

تمہارا

قمر احمد

۱۰ ستمبر

قمر احمد۔ آداب

آپ کے چار خط مل چکے ہیں۔ میں بے حد شرمندہ ہوں کہ جواب میں تاخیر ہو رہی ہے۔ امید ہے آپ مجھے معاف کریں گے۔ آپ کو مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔ آپ نے مجھے جو کچھ سمجھا، وہی ہمیشہ پائیں گے۔ ارشد آپ کے پاس برابر پڑھنے جا رہا ہے۔

یہ آپ کی مہربانی ہے آپ کے قیمتی وقت کا مجھے احساس ہے۔ اسی لئے میں نے معاوضے کی بات کی تھی۔ اگر آپ کو اس سے دکھ ہوا، تو مجھے بھی افسوس ہے۔ ناول میں نے شروع کر دیا ہے۔ ارشد کی فیس معاف ہو جانے کی بے حد خوشی

ہوئی۔ یہ آپ کی محبت اور کوششوں کا ثمر ہے۔ ورنہ ارشد اس کا مستحق نہ تھا۔

۱۰ ستمبر۔

پیاری راشدہ، محبت

کافی بے چینی اور انتظار کے بعد تمہارا خط ملا۔ میں تو خط بھیج کر یہ سمجھا تھا تم ناراض ہو گئیں، مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر خط بھیجے۔ خدا کا شکر ہے تم ناراض نہیں ہوئیں۔ محبت کی جو آگ میرے دل میں بھڑک رہی ہے، اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔ مگر پھر بھی کچھ تپش تو تمہارے دل میں بھی ہے۔ خدا کرے یہ تپش شعلہ بن جائے اور میرے دل کے شعلے تمہارے دل کے شعلوں سے مل جائیں۔ تمہیں دیکھنے کے لئے میں بے حد بے چین ہوں

..... راشدہ کیا تم مجھ سے کہیں مل سکتی ہو۔ اگر ابھی ایسا نہ ہو تو اپنی تصویر ہی بھیج دو۔ میں بہت بے چین رہتا ہوں۔ اگر تم نے تصویر نہ بھیجی تو مجھے بے حد دکھ ہو گا۔

ہمیشہ تمہارا اپنا

قمر، احمد، ایم، اے

۱۸ ستمبر

قمر، خلوص

آپ کا خط ملا تھا۔

آپ نے تصویر مانگی سو بھیج رہی ہوں۔ آپ میرے دل کی کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں بہ تجبور ہوں۔ ورنہ آپ سے ملاقات کو تو شاید آپ سے بھی زیادہ بے چین ہوں۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

راشدہ بانو

۱۸ ستمبر

میری راشدہ

ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ تم بڑی شریر ہو۔ تصویر تمہاری منگائی تھی، اور تم نے مینا کماری کی بھیج دی۔ غالباً تم نے میرا امتحان لیا تھا۔ تو لو میں اپنے امتحان میں کام یاب ہو گیا۔ اب تو انعام ہی کے بطور

اپنی تصویر بھیج دو، ناول تم نے شروع کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے، کہ تم سمجھ گئی ہو گی، کہ مجھے ایک عرصہ سے ایک محبت بھرا دل رکھنے والی لڑکی کی ضرورت تھی۔ میں تمہاری تصویر کا بے چینی سے منتظر ہوں۔

تمہارا

قمر، احمد، ایم، اے

۲۷ ستمبر

پیاری راشدہ، بہت سے پیار

جب کافی انتظار کے بعد تمہارا خط ملتا ہے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ اور خط بھی کیا، جس میں تم کچھ نہ کہنے کے باوجود سب کچھ کہہ جاتی ہو۔

محبت بھرے دل کی خاموش دھڑکنیں تمہارے دل میں محسوس کرتا ہوں۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا ہے کہ میں نے مینا کماری کی تصویر بھیجنے کو دھوکا خیال کیا ہے۔ اس کا تو میں نے کہیں ذکر نہیں کیا تھا،..... میں بہت بے چین ہوں..... جواب پہلی فرصت میں دینا۔

تمہارا اپنا

قمر، احمد، ایم، اے

۱۲، اکتوبر

قمر، صاحب۔ آداب

تصویر، میرے پاس ابھی موجود نہیں۔ آپ جانتے ہیں، میں پردہ کرتی ہوں، اس لئے کسی فوٹو گرافر سے تصویر کھنچوانا میرے لئے ناممکن ہے، میری ایک رشتے

دارا گلے مہینے آنے والی ہے۔ اگر وہ اپنے ساتھ کیمرہ لے آئی، تو میں تصویر کھنچوا کر آپ کو بھیج دوں گی۔

انتظار میں بڑا مزہ آتا ہے نا؟۔

مخلص

راشدہ بانو

۱۳، اکتوبر

پیاری راشدہ، پیار

اب تو تمہارے خط کا انتظار کرنے کا عادی ہو گیا ہوں، مگر تصویر کا انتظار بہت بار ہو گا۔ مگر تمہارے لئے بار اٹھانا میری محبت کا ثبوت ہے۔ ارشد کو میں نے کتاب دلوادی تھی۔ بہت جلدی میں ہوں۔ جواب جلدی دینا۔

تمہارا قمر احمد

۲۴، اکتوبر

قمر۔ آداب

آپ کا خط ملا تھا۔ کتاب دلوانے کا شکریہ۔ آپ کے حساب کے ماسٹر اس سے ناراض ہو گئے ہیں۔ مہربانی ہو گی، اگر وہ اسے معاف کر دیں۔ طبیعت خراب ہے، زیادہ نہ لکھ سکوں گی۔

راشدہ

۲ نومبر

راشدہ۔ محبت

ارشد پچھلے دنوں اسکول نہیں آیا تھا۔ ورنہ میرے پاس۔ آج آیا ہے۔ اور تمہارا خط عین انتظار میں پایا ہے۔ تم جواب پانے کے لئے بے چین تو ہو رہی ہو گی۔ مجھے اس کا احساس ہے۔ ایسا کرو تم مجھے اجازت دو تو میں تمہیں ڈاک سے خط بھیج دیا

کروں۔ کہیں ایسا نہ ہو، ارشد کی کسی غلطی سے ہماری محبت کا راز کھل جائے۔ اور ہم ایک دوسرے کے لئے ترسنے لگیں۔ کل حساب کے ماسٹر سے میل کرادوں گا۔ غلطی ارشد ہی کی تھی۔ سنا ہے، اس نے ان کے سامنے بہت زبان چلائی ہے۔ اسے نصیحت کرنا.....

تمہاری رشتے دار کب آ رہی ہے۔ ارشد کہہ رہا تھا، کہ تم نے اس سے کہا ہے کہ میں خط مختصر لکھا کروں۔ اور یہ مختصر ہی تو ہے نا..... جواب جلدی دینا

ہمیشہ تمہارا

قمر، احمد، ایم، اے

۲۰ نومبر

قمر صاحب۔ آداب

پچھلے دنوں میں ملیریا میں مبتلا رہی۔ آپ کے کئی خط ملے تھے، مجھے افسوس ہے جواب میں دیر ہوگئی، اب بھی کم زوری بہت ہے۔ ڈاک سے خط بھیجنا مناسب نہیں۔ پکڑے جانے کا ڈر ہے۔ ارشد ہوشیار ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ رشتہ دار خاتون ابھی نہیں آئی ہیں، امید ہے آپ بخریت ہوں گے۔

مخلص

راشدہ بانو

۲۰ نومبر۔

ابھی ابھی تمہارا خط ملا۔ میں اپنی والدہ کو گاؤں چھوڑنے جا رہا ہوں، بہت جلدی میں ہوں معاف کرنا

ہزاروں محبت بھری دعاؤں کے ساتھ

تمہارا

قمر، احمد

یکم، دسمبر

آپ کے خطوط ملے، کمزوری ابھی باقی ہے۔ آپ زیادہ فکرمند نہ ہوں، راشدہ آپ کے لئے ہمیشہ زندہ رہے گی۔ سنا ہے آپ کے یہاں لڑکوں کو وظیفہ ملا کرے گا۔ ارشد فارم لے آیا ہے، اگر آپ اسے وظیفہ دلوانے میں مدد کریں، تو مشکور ہوں گی۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

مخلص

راشدہ

۱۱، دسمبر

جان من راشدہ

خط ملا، تمہاری طبیعت کی طرف سے بہت فکر ہے۔ اور دعا ہے کہ اللہ میری راشدہ کو سلامت رکھے۔ ارشد میاں کے وظیفے کے لئے کوشش میں کوئی کسر نہ رہے گی۔ تم مطمئن رہو..... میری راشدہ، تم اپنی ذات کے لئے بھی تو مجھ سے کوئی خدمت لو، کہ مجھے کچھ سکون ہو۔ راشدہ کوئی ملاقات کا ذریعہ نکالو۔ آخر کب تک میں تمہارے دیدار کے لئے تڑپوں گا۔ تمہاری صحت کے لئے دعا گو۔

ہمیشہ تمہارا

قمر، احمد، ایم، اے

۱۲، دسمبر۔

قمر، محبت بھرا اسلام۔

میری طبیعت اب خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہے۔ اور پھر تمہاری محبت بھری دعائیں رائیگاں تھوڑی جائیں گی۔ گھبراؤ نہیں، جب ہم ایک دوسرے کے ہو گئے ہیں، تو پھر ملاقات بھی ہو جائے گی۔ میری رشتہ دار خاتون آ گئی ہیں۔ اور میں نے تصویر کھنچوالی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان کے ساتھ لکھنو جا رہی ہوں۔ بہت

ممکن ہے، کہ مجھے وہاں ارادے کے خلاف کچھ زیادہ دنوں تک رک جانا پڑے۔ میں وہاں سے تمہیں خط نہ بھیج سکوں گی۔ مگر تم گھبرانا نہیں۔ تمہاری راشدہ کا دل ایک لمحہ کے لئے بھی تم سے خالی نہ ہوگا۔ آج شام کی گاڑی سے میں چلی جاؤں گی۔ تصویر آ کر تمہیں بھیج دوں گی۔ میں نے بھی تم کو قمر تم سے مخاطب کیا ہے، محبت میں بے تکلفی اچھی ہوتی ہے۔ نا۔

تمہاری

راشدہ

۲۰ مارچ

قمر، احمد۔ ہزاروں پیار

کل میں لکھنو سے واپس آ گئی ہوں۔ جیسا کہ مجھے ڈر تھا، وہی ہوا۔ قریب تین مہینے کیسے گزرے۔ اس کا تم اندازہ نہ کر سکو گے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی تمہارا خیال دل سے جدا نہیں ہوا۔ تصویر مجھے افسوس ہے، صاف نہیں آئی۔ تمہیں بھیجو گی بھی تو تم مجھے دیکھ نہ پاؤ گے۔ انشا اللہ کوئی صورت نکال کر جلد ہی تمہیں تصویر بھیج دوں گی۔ ارشد کے وظیفے کا معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی۔ یہ سب تمہاری کوششوں کا پھل ہے۔ اب اس کے امتحان شروع ہونے والے ہیں، تم خود بھی خیال رکھنا۔ اور دوسرے ماسٹروں سے بھی خوب خوب کہہ دینا۔ کہ وہ اسے پرچہ کرنے میں مدد دیں۔ یہ تمہارا ارشد پر احسان ہوگا۔ جس کے لئے تمہاری راشدہ بہت مشکور ہوگی۔ ناول ختم ہوا ہی چاہتا ہے۔ اپنی تصویر کب بھیج رہے ہو۔

تمہاری راشدہ

۲۰ مارچ

پیاری راشدہ، محبت بھرے دل کا سلام لو

ایک طویل عرصے کی بے چینی اور انتظار کے بعد تمہارا آج خط ملا۔ اور وہ بھی

ایسا خط کہ اتنے عرصے انتظار کی کوفت دور ہوگئی۔تصویر کا مجھے افسوس ہے۔اب جلد ہی بھیج دو۔اپنی تصویر بھیج رہا ہوں، دیکھو تمہارا قمر احمد کیسا ہے۔میری راشدہ اس کا دل بہت خوبصورت ہے۔ظاہری خوبصورتی سے اندرونی خوبصورتی زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ارشد کے امتحان شروع ہونے والے ہیں۔اب میں نے اسے دو وقت پڑھانا شروع کر دیا ہے۔

تم بے فکر رہو۔اپنا سکول سینٹر ہے۔یہاں اسے ہر طرح کی سہولتیں حاصل ہوں گی۔میں ہر ماسٹر سے کہہ دوں گا۔اور تم دیکھنا، ارشد اسکول کے ہر لڑکے سے زیادہ ممتاز رہے گا۔ناول ختم ہو جائے، تو میرے کلام کا مجموعہ ''دیوان قمر'' پڑھنا۔تمہاری محبت نے مجھے شاعر بنا دیا ہے۔اسے شائع کرانے کے لئے ناشران سے بات چیت کر رہا ہوں۔جواب جلد دینا

تمہارا

قمر احمد

۲۔اپریل

پیارے قمر

خطوط ملے۔میرے مزاج پھر بگڑ گئے تھے۔اس لئے دیر ہوگئی۔ارشد کے امتحان ہو رہے ہیں۔اور تمہاری مہربانیوں سے وہ ایک دفعہ نقل کرتے ہوئے پکڑا جانے کے باوجود برابر نقل کر رہا ہے۔دیگر ماسٹر صاحبان بھی اسے کافی مدد دے رہے ہیں۔جس کے لئے میں بے حد مشکور ہوں۔تمہاری تصویر مل گئی ہے۔دل یقینی خوبصورت ہوگا۔ناول بھیج رہی ہوں۔رائے پھر لکھوں گی۔..... دیوان بھی پڑھوں گی۔

تمہاری

راشدہ

۱۳، اپریل

پیاری راشدہ

خط میں تاخیر ہو رہی ہے۔ معاف کرنا۔ ارشد کے سب پرچے اچھے ہو رہے ہیں۔ تم مطمئن رہو۔ میں نے تو اپنی تصویر بھیج دی ہے تم کب بھیجو گی۔ آج کل میں بہت مصروف ہوں، خدا معلوم ہم کب ایک دوسرے کو کب پا سکیں گے۔

تمہارا

قمر، احمد، ایم، اے

۲۷۔ اپریل

پیارے قمر۔

ارشد کے امتحان ختم ہونے پر ہیں۔ اس کے سب پرچے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ اور یہ تمہاری محبت کا نتیجہ ہے۔ میرے سر میں آج شدت کا درد ہو رہا ہے۔ امید ہے، ہم جلد ایک ہو جائیں گے۔ اللہ نے چاہا تو تم خیریت سے ہو گے۔

مخلص

راشدہ

۲۔ مئی۔

پیاری راشدہ

اپنی مصروفیت کی بنا پر جواب میں تاخیر ہو گئی، معاف کر دینا۔ ارشد کے امتحان ختم ہو گئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو وہ فسٹ آئے گا۔ حساب کے پرچے میں اس کے تمام سوال صحیح ہیں۔ تمہاری طبیعت کی طرف سے فکر ہے۔ سوچ رہا ہوں۔ امی کو تمہارے گھر بھیج دوں۔ تاکہ وہ تمہارے والدین سے تمہیں میرے لئے مانگ لیں، تمہاری کیا رائے ہے۔

تمہارا

قمر، احمد، ایم، اے

محترمی مکرمی ماسٹر قمر احمد صاحب

آج اتفاقاً برخوردار ارشد میاں کا بکس کھولا، تو اس میں سے آپ کے تحریر کردہ خطوط ملے، پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ راشدہ نام کی کوئی بھی لڑکی میرے گھر نہیں رہتی۔ ارشد میرا صرف ایک ہی بچہ ہے۔ جس کی نہ کوئی بہن ہے۔ اور نہ راشدہ نام کی کوئی رشتے دار۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ارشد کی فیس ہی معاف نہیں کروائی، بلکہ وظیفہ بھی دلوا دیا۔ جس کا کسی کو علم نہیں۔ آپ سے پڑھنے کو میں نے اسے رائے دی تھی، سو آپ سے اس نے پڑھنا شروع کیا۔ مگر وہ ہر ماہ مجھ سے بیس روپے آپ کی فیس کے نام پر لے جاتا تھا۔ ارشد نے اگر آپ کے سامنے راشدہ کو اپنی بہن ظاہر کیا ہے۔ اور اس نام سے عشقیہ خطوط لے جا کر دیئے ہیں۔ تو یہ اس کی جعل سازی ہے۔ آپ اس بارے میں اس سے دریافت کیجئے گا، اور میں بھی سختی سے باز پرس کروں گا۔

مخلص

عبدالحمید خاں

ڈاکٹر صاحب

افسانہ نگار : ضیا ساجد

ملحقہ میز پر ہجوم حاسداں قابض تھا۔ جو ٹکے ٹکے آنے، آنے کی باتیں کر رہا تھا۔ پورے گروہ نے گز بھر لمبی زبانیں نکال رکھی تھیں۔ جن سے وہ قابل تعظیم و تکریم ادیبوں، شاعروں اور انشا پردازوں کے بے داغ دامن عزت کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ جتنے منہ تھے، اس سے دوگنی دشنام دیکھنے کو مل رہی تھیں۔

ایک ٹچا کم سے کم دو ناوک چلا رہا تھا۔ ہاتھی والی ہ جتنی ایک پری وش بھی اس میز کے گرد فرو کش تھی۔ وہ بھی منہ اور باتیں بنا کر سامعین کا چال چلن بگاڑ رہی تھی۔ اس کا نام ش سے روانہ ہو کر ٹ پر دم توڑ دیتا تھا۔ اس نے عرصہ شاعری اور ادبی حلقوں میں نیا نیا قدم و جسم رکھا تھا۔ اس لئے ابھی نئی نکور تھی۔ بے شمار شاعر و ادیب اس پر مرنے اور اترنے کے لئے اپنا و شعروں کا قبلہ و کردار و وزن و ہدف درست کرنے میں محو و مگن تھے۔ مجھے بھی اس کی حلاوت و صباحت بار بار بلاتی تھی، مگر میں اسکے گنڈیری برابر قد کا معائنہ کر کے معذرت کر لیتا تھا۔ کہ مری جان مجھ کو پدی لڑکیاں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ ایک دوسرے پر سبقت و فوقیت حاصل کرنے کے لئے وہ سب لقندرے ایڑی چوٹی اور سینہ پشت کا زور لگا رہے تھے۔ ٹی، ہاؤس کو انہوں نے سر کاندھوں، اور کولہوں پر اٹھا رکھا تھا۔ کان کے اندر پڑی آواز بھی کھل کر سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں کن کانوں سے ان اسافل کے فرمودات سن رہا تھا، جب ان کا شور مزید شوریدہ ہوا تو میں نے کن اکھیوں سے اس میز کی سمت دیکھا۔ تبھی ایک زبان دراز نے میز پر تھپڑ اور مجھ پر آنکھ دے ماری۔ اور ڈاکٹر وزیر آغا دام اقبالہ کا اسم گرامی خندہ استہزا کے ساتھ لیا ڈاکٹر وزیر آغا کا نام سنتے ہی میں پوری آنکھیں وا کر کے اس ناتراشیدہ شاعر کی طرف دیکھنے لگا۔ جس پر وہ مفسد بولا

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے بھی اپنی کلیات کا نام رکھتے ہیٹ کر دی۔ پھر آگے کہا، چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل بالکل بے سروپا اور بچگانہ نام ہے

اس سے تو بہتر تھا وہ چیخ اٹھی لفظوں کی چھاگل جیسا بامعنی نام رکھ لیتے یا پھر ستی اٹھی ''لفظوں کی چھاگل دہک اٹھی ،لفظوں کی چھاگل تڑپ اٹھی لفظوں کی چھاگل بھڑک اٹھی لفظوں کی چھاگل چھلک اٹھی لفظوں کی چھاگل میں سے کوئی نام تجویز فرماتے بفرض محال چہک کا لفظ وزیر صاحب کی کمزوری تھا، تو وہ چہک اٹھی لفظوں کی چڑیا نام اپنی کلیات پر بڑی آسانی اور آرام سے رکھ سکتے تھے۔

بارش کے اس پہلے قطرے نے ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کو بی چبازار برہنہ کر دیا۔ پشتہ ٹوٹتے ہی استہزائیہ ریمارکس کا سیلاب آ گیا۔ سارے شر پسند دشنہ و خنجر لے کر ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی ذات ستودہ صفات کے پیچھے پڑ گئے۔ اور ان کی صفات کا نہایت بے دردی سے صفایا کرنے لگے۔ وہ غول غول کا ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی ٹاورنگ پرسنیلیٹی پر

اخلاق اور وزن سے گرے ہوئے جملے پھینکنے لگا۔

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی عریاں و پوشیدہ خامیوں کو بیان کرتے ہوئے ان کی زبان قینچی اور استرے کی مانند چل رہی تھی۔ اس وقت شنیدہ کے بود مانند دیدہ کا کوئی موقع محل نہ تھا۔ کیونکہ میں نے وہ سب اشارے اور آوازے اپنے گنہگار کانوں سے سنے اور آنکھوں سے دیکھے تھے۔ چھاج تو چھاج تھے چھانی یعنی وہ لعبت ادب بھی بول رہی تھی، بولتے وقت اس کو سرخی کو سلامت رکھنے کی فکر اس شدت سے ستاتی کہ وہ ہونٹوں کو کانوں کی طرف تولے جاتی تھی، مگر ہونٹوں کو ایک دوسرے پر نہیں مارتی تھی۔ ان کے بجائے وہ رخساروں پر پلکیں اور مکھی پر مکھی مارتی تھی۔ دوسرے جو بھی کہتے۔ اسے دہرا دیتی تھی۔

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب دام عنایتہٗ کا نام میرے لئے اجنبی نہ تھا۔ لڑکپن میں

تین مرتبہ، نوجوانی میں دومرتبہ اور جوانی میں ایک مرتبہ ان کی کتاب اردو ادب میں طنز ومزاح کو پڑھ چکا تھا، جوانی میں خاص کر میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا، تا کہ اپنی نوعمر کی نادانی اور بے وقوفی پر جی بھر کر قہقہے لگا سکوں۔ ان دنوں میں نے عند الحلیم شرر، دت بھارتی، نسیم حجازی، رئیس احمد جعفری۔ عظیم بیگ چغتائی۔ اے، آر جعفری، نویں اور دسویں جماعت کی کتابوں کو پھر سے پڑھا تھا۔ قیوم نظر کے ہونہار فرزند اور ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے چہیتے انشائیہ نگار سلمان بٹ نے بھی ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی شخصیت مجھے گھول کو پلا دی تھی۔ ہمروزانہ شام کوٹی، ہاؤس میں ملتے تھے۔ اور انگریزوں کی طرح ہماری گفتگو موسم سے اسٹارٹ لینے کی بجائے ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے تذکرے سے شروع ہو جاتی۔ اور جہاں تک میری یاداشت کام کرتی ہے۔ رات کے گیارہ بارہ بجے گھروں کو رخصت بھی ہمیں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب ہی کرتے تھے۔

سلمان بٹ ہفت روزہ چٹان کے لئے بہت پیارے ادبی کالم کے علاوہ بے پناہ کرارے شخصی خاکے لکھتا تھا۔ موت نے اسے مہلت نہ دی۔ ورنہ وہ نئے انداز سے شخصی خاکے قلمبند کرنے کا سہرا اپنے سے ضرور بندھوالیتا۔ وہ ٹھنگنے ٹھنگنے پدے پدے جملے تراشتا اور تین چار سو جملوں میں بڑی سے بڑی شخصیت کا مکمل اور مفصل اپریشن کر دیتا تھا۔ آج کل اس کے متعدد مقلدین پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کو اپنا مجازی آغا سمجھتا تھا۔ اور ان کی پروجکشن میں کوئی عقیقہ یا دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتا تھا۔ محمد عالم خان اسے چڑانے اور ستانے کے لئے عام طور ہر کہتا تھا۔ اس کے عوض ڈاکٹر وزیر آغا صاحب تمہیں ایک بوری کنوؤں یا آموں کی اور ایک بوری اوراق کی بھیجتے ہیں۔ لیکن وہ غصہ کھانے کے برعکس بڑا سا قہقہ اور دونوں آنکھیں مار دیتا تھا۔ بعد میں جب ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے اپنے بیٹے سلیم آغا قزلباش کو لاہور بھجوا دیا اور اس نے ٹی، ہاؤس میں میز سنبھالی، تو سلمان بٹ ڈاکٹر

وزیر آغا صاحب کے دیدار و حصار سے نکل گیا۔ اور احمد ندیم قاسمی کے سرکل میں داخل ہو گیا۔ وہاں جب منہ بولا پیار نہ ملا تو سب سے ناراض ناراض رہنے لگا۔ اس نے چند ماہ روزنامہ امروز کا ادبی ایڈیشن بھی

شائع کیا تھا اور اس کو طنز و مزاح اور چھیڑ چھاڑ سے آلودہ و آراستہ کیا تھا۔ اس کی اس اپج و اختراع کے سامنے سب اخبار بھیگی بلی بن گئے۔ اپنی اس فتح و نصرت پر وہ بہت ناز کرتا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی۔ فراق گورکھ پوری، جوش ملیح آبادی وغیرہ میری کمزوری ہیں۔ لہذا جونہی موقع ملتا وہ میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتا۔

یار یہ فیض صاحب کو کیا ہوا۔ وہ آنکھوں میں شرارت کی شرشریاں سمیٹ کر مجھ سے پوچھتا۔

میرا مقصد ہے ترقی پسند شاعر ادیب اپنے کردار مثالی کیوں نہیں بناتے۔ جسے دیکھو محبت کرنے والے مردوں سے میلوں دور رہے گا۔ پرے کھڑا کھڑا ہی اپنے پرستار سے پوچھے گا۔ سناؤ بھائی کیا ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس خاتون پرستار دور کھڑی ہو کر بھی سلام بھیجے تو چیل کی طرح اسپر جھپٹے گا۔ اور سینے سے لگا کر بالوں گالوں کی پولی پولی پپیاں لینے لگے گا۔

سلمان بٹ کے اس اٹیک کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ میں جوابی وار ڈاکٹر وزیر آغا صاحب اور ان کے ہم مشرب اور ہم مسلک شاعروں ادیبوں پر کروں۔ جس کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی شخصیت ڈس کس ہوتی رہے۔ اور سلمان بٹ موج کرتا رہے گا۔ وہ بہت عیار تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے حوالے سے وہ خود کو گفتگو کا موضوع اور باتوں کا مرکز بنانا چاہتا تھا۔ میں اس کی نفسیات کا لنگوٹیا یار تھا۔ اس لئے بات کو بالکل نئے ٹریک پر چڑھا دیتا تھا۔ جس سے اس کے چہرے پر ہوائیاں

اڑنے لگتیں۔ میں جواب میں کہتا۔ اب تو اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے۔ شاعروں کو ٹیپ ریکارڈ کی سہولت میسر ہے۔ ورنہ قرون اولیٰ اور وسطیٰ کے شعرا کو شعر یاد رکھنے میں بڑی دقت پیش آتی تھی۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ گزرے ہوئے زمانے میں کوئی شاعر تھے۔ جن کے ہاں ہمیشہ رات کو غنودگی کے عالم میں شعر ہوتے تھے۔ پوری غزل ان پر اسی حالت میں

اترتی تھی۔ وہ ہر شعر کی تکمیل کے بعد اپنے اوزار بند میں گرہ لگا دیتے تھے۔ اور صبح بیدار ہو کر اپنے اوزار بند کی گرہیں کھولتے، تو ساتھ ہی شعر بھی آپ ہی آپ ان کے حافظے میں کھلتے جاتے تھے۔ آخر ایک رات جب انہوں نے اپنی ایک دوغزلہ اوزار بند میں باندھ کر خراٹے لینے کے لئے اپنے اعصاب کو کھلی چھٹی دے دی، تو ان کی بے اولاد زوجہ قینچی لے کر ان پر چڑھ دوڑی۔ اور اس نے اوزار بند کاٹ کر باہر گلی میں پھینک دیا۔ اس روز کے بعد انہوں نے شاعری سے توبہ کر لی۔ اور ایمان داری اور تن دہی سے حقوق زوجیت ادا کرنے لگے۔

سلمان بٹ جواباً ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی ذات کو کریٹی سائز نہ کرنے پر مجھ سے روٹھ جاتا۔ اور تخلیق رسالے کے مدیر شہیر اظہر جاوید کی جانب شکایت آمیز اور امداد طلب نظروں سے دیکھنے لگتا

اور چونکہ وہ بھی ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے مداح تھے۔ اور دل سے ان کا احترام کرتے تھے۔ لیکن سلمان بٹ کی طرح وہ ملنے ملانے والوں پر ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کو زبردستی مسلط نہیں کرتے تھے۔ میرے اور اظہر جاوید کے روزانہ دو تین گھنٹے بسر ہوتے تھے۔ یہ سب وقت محمد احمد خاں، حکیم ولی الرحمان ناصر، اسلم ملک، بیدار سرمدی اور خوشنودہ بیگم خوشنودہ کھا جاتے تھے۔ خوشنودہ بیگم خوشنودہ پنجابی زبان کی کشادہ ظرف شاعرہ تھیں۔ وہ دریافت تو میری تھیں۔ مگر بعد ازاں دوسرے ادیب اور شاعر اس میں بس گئے۔ اس نے ایک بڑی صاف اور شفاف مثنوی کہہ

رکھی تھی، جسے وہ ہتھیلی پر لیے پھرتی تھی۔ اور بجز فربہی کے اس میں

کچھ نقص بھی نہ تھا۔ ایک دن میں نے اسے رائے دی کہ تم بھی امرتا پریتم کی طرح خوش خوش خوشنودہ بیگم خوشنودہ عنوان رکھ کر اپنی داستان زندگی تحریر کر ڈالو۔ دیکھ لینا ملک میں بھونچال آ جائے گا۔ اس نے میری تجویز کو بسر و بدن قبول کر لیا۔

چنانچہ سرفراز سید کے ذریعے میں نے روزنامہ مشرق کے ذریعے اس زلزلہ اثر خبر کو شائع کرا دیا۔ اور اس کے چند ہفتے بعد خوشنودہ بیگم خوشنودہ سے میری ملاقات ہوئی، تو وہ منہ بسور کر بولی

وہ آٹو بائیو گرافی والا آئیڈیا میں نے ذہن سے نکال دیا ہے۔ کیونکہ اخبار میں خبر چھپ گئی تھی۔ اور شاعروں اور ادیبوں نے میرے گھر پر دھاوا بول دیا تھا۔

ہر ایک ہاتھ جوڑ کر کہتا تھا۔ دیکھنا بھابھی میں سرکاری ملازمت کرتا ہوں۔ اور بال بچے دار ہوں۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے تو مجھے مالٹوں کی بوری بھجوائی تھی۔

خوشنودہ بیگم خوشنودہ اور سلمان بٹ کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ سلمان بٹ خوشنودہ بیگم خوشنودہ کے ضرورت سے زیادہ صحت مند حسن سلوک سے بہت بدکتا تھا۔ اسلم ملک کی ان دنوں تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے دو تین دفعہ دبی زبان میں کہا تھا، کہ اگر خوشنودہ ایک سے چار ہو جائیں، تو حکیم کے تعاون کے بغیر ہی میں چاروں سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ سلمان بٹ نے ایک روز قہقہوں کے ساتھ قصہ سنایا کہ گوجرانوالہ کے مشاعرے میں خوشنودہ بھی تھی۔ واپسی پر وہ میرے ساتھ آغا صاحب کی کار میں گھس گئی۔ لاہور تک پہنچتے پہنچتے آغا صاحب اس کی دل نشین مثنوی سے اتنے متاثر ہوئے، کہ بجائے اسے پہلے اس کے مکان پر اتارتے۔ مجھے میرے گھر چھوڑ کر اس کے ہاں ڈراپ ہونے چلے گئے۔ لیکن فوراً واپس بھاگ آئے۔ میں نے دیکھا ان کا بدن پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اور ڈر و خوف سے ان کے دانت بج رہے تھے۔ میں نے پوچھا ڈراپ کر آئے تو ہکلا کر بولے، بڑی غلط

شاعری کرتی ہے کم بخت۔

اظہر جاوید بڑے سائنٹفک طریقے سے آغا صاحب کے لئے کنونسنگ کرتے تھے۔ ایسے جیسے میسنی چارپائی نہیں ہلنے دیتی، بندے کو پتا ہی نہیں چلتا۔ اور وہ ایک روز اچانک اپنے آپ کو ڈاکٹر صاحب کی بارگاہ میں دفن برزانو پاتا ہے۔ مجھے بھی وہ ان تقاریب میں لے جاتے تھے۔ جو ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں منعقد کی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کا معمول تھا کہ لاہور میں قدم رنجہ فرماتے ہی وہ سب سے پہلے چاہے طوفان دہاڑ رہا ہو، چاہے دھوپ گرج رہی ہو تخلیق رسالے کے دفتر میں ضرور تشریف لاتے تھے۔ اور اظہر جاوید سے لاہور کے شعرا، ادبا کی خیریت دریافت فرماتے تھے۔ ان کی یہ وضع داری اس وقت تک قائم رہی۔ جب تک ڈاکٹر انور سدید صاحب ریٹائر ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب سے دستار خلافت بندھوانے کے بعد مستقل طور پر لاہور نہیں آن بسے۔ ڈاکٹر انور سعید نے ج سروز لاہور کی فضا کو اپنے نفس معطر سے خوشبودار کیا۔ اس سے اگلے روز جاوید نے گدی ان کے ہینڈ اوور کردی، اور خود تصوف سے شغل فرمانے لگے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکٹر صاحب کی ان کے ہاں آمد و رفت منقطع ہوگئی۔

اظہر جاوید اب مجھے قوالی کی محفلوں میں لے جانے لگے۔ ایک شب کا ذکر ہے قوال نے کافی دیر گلا اور ساز صاف کر کے یہ شعر اٹھالیا۔

پری رخ کوں اٹھانا نیند سوں بے جا نہیں عاشق
عجب کچھ لطف رکھتا ہے زمانہ نیم خوابی کا

اور اس کے غرارے کرنے لگے۔ پانچ منٹ بعد اس نے چھلانگ ماری اور فارسی کا ایک شعر دبوچ لیا۔ اور اس کے ساتھ کھیلنے لگا۔ جیسے بلی چوہے کے ساتھ کھیلتی ہے۔ سات منٹ اس شعر سے جھولنے کے بعد اسے بھی پرے پھینک دیا اور لمبی زقند لگا کر امیر مینائی کے شعر پر آ گیا۔ اس کے بعد فرید گنج شکر کے آستانہ عالیہ پر پہنچ

گئے۔اور یہ شعر اٹھا کر گود میں لے لیا۔اس دوران میں سامعین کا وجد و سرور سے برا حال ہو چکا تھا۔

دھن رے دھنیے اپنی دھن

پرائی دھنی کا پاپ نہ پن

اچانک اظہر جاوید نے زور دار جھرجھری لی، اور مستی و سرخوشی کے وفور سے ایسے جھومنے لگے جیسے سفیدے کا معشوق نما البیلا شرمیلا پودا ساون کے مہینے میں جھومتا لہراتا ہے۔حال و قال کا یہ نافراموش منظر دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اظہر جاوید نے میرے فرشتوں کو بھی کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔کہ وہ جذب و مستی کے تمام منازل طے کر چکے ہیں۔میں نے قبل ازیں انہیں نماز پڑھتے تو اکثر دیکھا تھا۔مگر نماز تو تاجر اور پولیس والے بھی پڑھتے ہیں۔قوالی کا سامنا کرتے انہیں پہلی بار ملاحظہ کر رہا تھا۔وہ اوپر اٹھ اٹھ کر قوال کو ایسے مبارک باد اور شاباش دے رہے تھے۔۔جیسے چڑیا کے کم سن بچے اپنی ماں سے چوگا وصول کرتے ہوں۔اضطراب و اضطرار کا یہ منظر دیکھ کر قوال بھی اکھاڑے سے باہر ہو گیا۔قوال جونہی گھوم گھام کے دھنی کی تکرار شروع کرتا۔اظہر جاوید کی کپکپی آسمان کو چھونے لگتی۔قوال جونہی یہ مصرعہ اٹھاتا۔پرائی دھنی کا پاپ نہ پن۔

اظہر جاوید ہاتھ بڑھا کر اس میں سے دھنی اٹھا لیتے۔جسے کبھی وہ ہونٹوں سے لگاتے،کبھی آنکھوں پر رکھتے۔اور کبھی انگوٹھی تصور کر کے انگلی میں پہن لیتے۔اظہر جاوید نے دھنی کا ناجائز استعمال نہیں کیا۔چوم چام کے وہیں پر رکھ دی جہاں سے اٹھائی تھی۔

یہاں ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ہمارے گاؤں میں ایک سائیں سکینہ ہوا کرتے تھے۔مدھو بالا کی رنگین تصویر اور دو بالشت لمبی دھوتی ان کی کل کائنات تھی۔مدھو بالا کی تصویر کو وہ ہمیشہ اپنی بے وفا محبوبہ سکینہ سمجھ کر سر پر اٹھاتے تھے۔تاکہ جب ذر

اگر دن اٹھائی دیکھ لی۔وہ نفس اوراس کے متعلقات

مارنے کے لیئے بے تحاشا چرس پینے لگئے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی چستی اور پھرتی تو انتقال کرگئی۔نفس بری طرح بپھر گیا۔گاؤں سے عریانی اور فحاشی مار بھگانے کے لئے صالحین ومبلغین نے ستر باراس بندہ بے پرواہ سے کہا۔کہ میاں دن میں ستر خواتین تمہارے قریب سے گزرتی ہیں۔اس لئے ستر ڈھانپ کر رکھا کرو۔کریما قصائی تو گوشت کو مکھیوں کے حرص وآزار سے بچانے کے لئے ململ کے دوپٹے سے ڈھانپ کر رکھتا ہے۔لیکن سائیں سکینہ پر اسکی دھمکیوں اور پند ونصائح کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

مجبوراً گاؤں کی جامع مسجد کے سینئر امام مولانا مکرم علی قادری نوشاہی نے سائین کی برہنگی کو بلڈوز کرنے کا ذمہ اپنے سر لیا۔ڈنڈا اٹھاتے دیکھ کر گاؤں بھر کو یقین ہوگیا، کہ اب سائیں کے اعضائے رئیسہ وغریبہ کی خیر نہیں،مولانا کچا کھا جائیں گے۔اگر اس نے لیت ولعل یا لاپروائی کو نہ چھوڑا۔

جب مولانا نے کڑک دار آواز میں کہا۔

مالک کون ومکاں کی اے ارزل ترین مخلوق بتا تو کپڑے کیوں نہیں پہنتا۔اور غلیظ بدبودار بال کیوں نہیں کٹواتا۔

تو سائیں سکینہ نے مدھوبالا کا بوسہ لے کر چرپیلی اور بھنگیلی آواز میں گانا شروع کردیا

میں کپڑے پہن کر جاؤں کہاں اور بال کٹاؤں کس کے لئے۔

یہ استفہامیہ جواب سن کر مولانا کے تلوے کو لگی اور سر سے نکل گئی انہوں نے مگدروں جیسے بازوؤں میں سائیں کو ایسے اٹھایا، جیسے چوزے کو۔اور سائیں کی شدید مزاحمت پر بھی اس کو اٹھا کر ملٹھی نائی کے ڈیرے پر لے گئے۔اوراس کے آگے اسے زور سے پٹخ کر گویا ہوئے۔برادرم اس ملعون ومردود کو اپنی خاص تحویل

میں لے لو۔ اور چاہے دو گھنٹے لگیں۔ یا سارا دن صرف ہو اس کے جسم پر سے ہر قسم کے بال جڑ سے اکھاڑ پھینکو۔ دوسری طرف لوگوں سے کہا۔ آپ لوگ چوکس رہیں۔ یہ نابکار کہیں بھاگ نہ جائے۔ میں نے واپس آ کر اسے کپڑے بھی پہنانے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے مدھو بالا کی تصویر بغل میں دابی اور ستراحت فرمانے کے لئے حجرہ میں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ملٹھی حجام نے استرا چلانا شروع کیا۔ اور اس نے چیخنا۔ ہائے مولوی میری سکینہ کو لے گیا۔ گھنٹہ بھر کی محنت شاقہ کے بعد سائیں سکینہ پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ جیسے کڑاہی گوشت کی دکان پر بغیر کھال کے مرغالکا ہوتا ہے۔ ان کی عمر یکا یک پندرہ سال کم ہوگئی۔ وہ ہلکا پھلکا ہو کر بچوں کو دیکھا، اور پھر زاروقطار رونے لگے۔ ہائے میری سکینہ کو مولوی لے گیا۔ ملاں سے میری سکینہ مجھے واپس دلائی جائے۔

درد بھرا اور کمزور دل رکھنے والے اصحاب ان کی فلک آسا فریاد لے کر مولانا مکرم علی قادری نوشاہی کے حجرے پر پہنچے، تو اس کے دروازے پر موٹا سا تالا پڑا ہوا تھا۔ اور مولانا مدھو بالا سمیت فرار ہو گئے تھے۔ جب یہ دل دوز اور جگر شگاف خبر دوڑتی، اڑتی اور دل کی چال چلتی سائیں سکینہ تک پہنچی، تو انہوں نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔

جا۔ اوئے کم ظرف مولویا۔ پہلے ہی روز ننگا ہو گیا۔ کچھ روز تو چوٹ کو برداشت کرتے۔ میں نے دس برس تک اف نہیں کی تھی۔ تم تو بین بجتے ہی سانپ بن گئے ہو۔

علامہ اقبال نے سچ فرمایا ہے

کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

تمہارا کدو ہی نہیں کدو جیسا سر بھی خالی ثابت ہوا۔

روزنامہ نوائے وقت کے بیدار سرمدی نے بھی مجھے دانہ ڈالا تھا۔ بیدار سرمدی

دبستان سرگودھا کو ادبی ایڈیشن میں بہت جگہ دیا کرتے تھے۔ سلمان بٹ نے تو ایک بار میری ڈاکٹر صاحب کے ساتھ دو گھنٹے کی شیزان ریسٹورنٹ میں نشست بھی کرائی تھی۔ ہمارے ساتھ والی میز پر تین لڑکیاں اور ایک مرد کھانا کھا رہے تھے۔ ان کا کھانا دیکھ کر سلمان بٹ کی باچھیں نم ہو گئیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے بھی کھانا منگوالیا۔ کھانے کے دوران وہ میرے سوالوں کے تشفی بخش جواب دیتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنی علمیت و قابلیت سے بہت مرعوب کیا تھا۔ مگر اپنی شخصیت سے وہ مجھے مرعوب نہیں کر سکے تھے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، میرے کان تو ان کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ لیکن آنکھیں سامنے آئینے پر جمی ہوئی تھیں، جس میں وہ گل اندام لڑکی مجھے مکمل طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی جبیں چہارم آسمان تھی۔ وہ ماحضر تناول کرتے ہوئے کسی دفتری امور پر طبع آزمائی کر رہے تھے۔

وہ بانکی سجیلی نازنین خاموشی سے کھانا کھا رہی تھی۔ اس نے بائیں کلائی میز پر رکھ کر کلائی نرگس کے پھول کی مانند اٹھا رکھی تھی۔ میز کے نیچے ایک حشر سا برپا تھا۔ وہ کم سخن، کم سن مہ پارہ اس طوفان سے بے خبر تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک بار بھی ان مرغابیوں پر نظر نہیں ڈالی۔ وہ کھانا کھانے کے ساتھ عالمانہ گفتگو کرنے میں منہمک تھے۔ اس روز انہوں نے سوٹ کے ساتھ سولاہیٹ پہنا ہوا تھا۔

اور اردو، پڑھو، اردو لکھو کے مبلغ مولانا صلاح الدین کی کاربن کاپی معلوم ہو رہے تھے۔

میں نے متعدد بار اپنے گریبان میں منہ ڈال کر یہ دیکھنے کی سعی کی کہ عصر حاضر کے نمایاں ترین نقاد ڈاکٹر وزیر آغا سے میں بے شمار ملاقاتوں کے باوجود کیوں نہ کھل پایا۔ وجہ ہاتھ یہ لگی تھی کہ اس لونگ لیجنڈ میں خشکی بہت ہے۔ انہیں کوئی لطیفہ سنا کر شروع کیا جائے، کہ ڈاکٹر صاحب ایک سکھ اپنی ہمشیرہ سے ملنے اس کے گاؤں گیا۔ اس کی ہمشیرہ اس وقت باتھ روم میں کپڑے دھو رہی تھی، باہر چارپائی پر اس کا ڈیڑھ

برس کا بیٹا لیٹا ٹانگیں اور بانہیں مار کر رو رہا تھا۔ بہن کو جب خبر ہوئی کہ باہر اس کا ویر آیا ہے۔ تو وہ اندر سے بولی، ویر جی۔ چارپائی کے نیچے چھری اور مالٹے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ ٹوکری کاکے کے آگے رکھ دیں۔ وہ کھیلنے لگے گا۔ اور چپ ہو جائے گا۔

ذرا دیر بعد بچے کی گریہ وزاری ختم ہو گئی۔ اور سردار جی کی ہمشیرہ آرام کے ساتھ کپڑے دھونے لگی۔ کپڑوں سے فارغ ہو کر وہ ویر جی کو جی آیاں نوں کہنے کے لئے نکلی تو اس کی چیخ نکل گئی، کیونکہ سردار جی نے بچے کو چپ کرانے کے لئے چھری مالٹے نہیں پکڑائے تھے۔ بلکہ۔۔۔۔۔۔

ڈاکٹر صاحب نے پورا لطیفہ سن کر مجال ہے، جو قہقہہ لگایا ہو۔ اول تو لطیفے کے دوران قبض زدہ سا چہرہ لیے لاتعلق سے بیٹھے رہے۔ پھر فوراً ہی انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ آپ نے اوراق کے شروع میں رحمان مذنب اور حمید قریشی کی غزل ملاحظہ کہ

رحمان نے سعادت حسن منٹو کو دن میں تارے اور قریشی نے غالب کو شب میں سورج دکھا دیا ہے۔

ان کی اس ٹھنڈی یخ، سنجیدگی سے ٹکرا کر لطیفہ خوان کا دل چاہے گا کہ اوراق کو رسالے سے کود کر خودکشی کر لینی چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب بھی مجبور ہیں۔ اس وقت وہ جس منصب و عہدے پر فائز ہیں۔ وہ ان سے اعلیٰ قسم کا

نظم و ضبط مانگتا ہے۔ میں نے کسی شہنشاہ یا دارالعلوم سے فارغ شدہ طالب علم کو سڑک کے کنارے

نان کباب کھاتے یا ملائی والی چائے پیتے نہیں دیکھا۔ بادشاہوں شہنشاہوں کی جتنی بھی تصویریں میرے ملاحظہ میں آئی ہیں۔ اس میں ان کے چہرے پر دبیز

آہنی جلال منڈھا ہوا تھا۔ چاہے کسی کا سر قلم کیا جا رہا ہو۔ یا کسی رقاصہ کا رقص جاری ہو۔ میں نے ان کو ہمیشہ زمینی عوام سے دور پایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب بحیثیت نقاد ادب کی ماونٹ ایورسٹ پر کھڑے ہیں۔ وہ آج اگر اپنی عبا، قبا، دستار یا خلعت فاخرہ اتار دیں۔ تو ان کی ساری عظمت و شوکت پگھل جائے گی۔ اور پھر ان میں اور ڈاکٹر انور سدید صاحب میں کوئی فرق نہ رہے گا۔

میری نگاہ میں وہ سکول آف تھاٹ کے سب سے بلند نقاد ہیں۔ ان کے تنقیدی نظریات اور ان ماخذات سے جہاں سے وہ تنقید کے لئے نکات کشید کرتے ہیں۔ شور و غوغا تو کیا جا سکتا ہے۔ ان کے قد و قامت پر بری نظر ڈالنے کی گنجائش نہیں۔

یہی وجہ تھی کہ ٹی ہاؤس میں بیٹھے ان تازہ واردان بساط ہوائے دل کی زاز اخائی نے میری طبیعت منغض کر دی تھی۔ میرا دل چاہا کہ ان میں سے کسی ایک کے مکہ مار کر ان کے دانت توڑ دوں۔ لیکن میں اس ظالمانہ خواہش کو پورا نہ کر سکا۔

مبادا میرا ہی مکہ ٹوٹ جائے۔ میری منافقانہ ریا کاری کی شہ پا کر وہ اور بھی شیر بلکہ ببر شیر بن گئے۔

ڈاکٹر صاحب کو ضرورت سے زیادہ شہرت مل جانے کے باوجود ڈاکٹر انور سدید صاحب کا دل نہیں بھرتا۔ وہ چھوٹے اخبارات و جرائد میں بھی شکوہ بلب رہتے ہیں۔

اور چاہیئے وقعت میرے سیاں کے لئے

سراسر حسد، رقابت، تعصب کی بنیاد پر استوار اس شکایت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور وہ ٹولی از سر نو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کو نوچنے کھسوٹنے لگے۔ ان کے حملوں جملوں کی پشت پر کارفرما احساس کم تری کی بو بلکہ بدبو کے بھبھکے ٹی، ہاؤس کے پورے ماحول پر چھائے عین اسی لمحہ ایک دریدہ دہن کے منہ سے ٹپ کر کے یہ کلمہ میز کی سطح پر گرا۔

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب ہیں کس باغ کا کنو۔ اگر اس میں سے ڈاکٹر انور سدید صاحب کو بازو سے پکڑ کر نکال دیا جائے، تو باقی محض سجاد نقوی رہ جاتے ہیں۔

اس گھٹیا سٹیٹمنٹ کو سنتے ہی میری رگوں میں محو خرام خون مرغ ماکیاں دیدہ کی مانند یک دم گرم ہو کر سرپٹ دوڑنے لگا کیونکہ سجاد نقوی غلام الثقلین نقوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور ان کا تعلق میرے آبائی گاؤں سے تھا۔ میں نے فرط غیض و غضب سے کرسی پیچھے الٹا دی اور زور زور سے بازو گھماتا

ٹی، ہاؤس سے باہر آ گیا۔

(باقی میری کتاب سرجیکل وارڈ میں ملاحظہ کریں)

ختم شد